کتاب التعریفات
تعریفات فقہیہ واصطلاحات شرعیہ
تفسیر پڑھنے اور فقہ وفتویٰ سے تعلق رکھنے والوں کے لئے مفید کتاب
www.besturdubooks.net
افادات
فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ
انتخاب وترتیب
محمد زید مظاہری ندوی
استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
ناشر ادارہ افادات اشرفیہ دوبگا ہردوئی روڈ لکھنؤ

کتاب التعریفات

تعریفات فقہیہ و اصطلاحات شرعیہ

تفسیر پڑھنے اور فقہ و فتویٰ سے تعلق رکھنے والوں کے لئے مفید کتاب

افادات

فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

انتخاب و ترتیب

محمد زید مظاہری ندوی

استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشر

ادارہ افادات اشرفیہ دوبگّا ہردوئی روڈ لکھنؤ

تفصیلات

نام کتاب	کتاب التعریفات
افادات	فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ
انتخاب وترتیب	محمد زید مظاہری ندوی
صفحات	۴۶۴
قیمت	۳۵۰/۰۰
ویب سائٹ	www.alislahonline.com

ملنے کے پتے

☆ دیوبند وسہارنپور کے تمام کتب خانے

☆ افادات اشرفیہ دوبگا ہردوئی روڈ لکھنؤ

☆ مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ

☆ مکتبہ رحمانیہ ہتھورا، باندا، پن کوڈ: ۲۱۰۰۱

☆ مکتبۃ الفرقان نظیر آباد لکھنؤ

☆ مکتبہ اشرفیہ ۳۶، محمد علی روڈ بمبئی ۹

اجمالی فہرست ''کتاب التعریفات''

فہرست ''کتاب التعریفات''

ب

ت ، ث

(خ)

ر

ش

ع

ق

ک

ن

و

☆☆☆

☆

دعائیہ کلمات

فقیہ العصر شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

نائب رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گرامی قدر مکرم جناب مولانا محمد زید مظاہری ندوی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گرامی نامہ نے سرفراز فرمایا، اور آنجناب کی دو کتابیں ''دین وشریعت کی بنیادیں اور فقہی اصول وضابطے'' نیز ''کتاب التعریفات'' موصول ہوئیں، بندہ اس وقت ایک سفر کے لئے پابہ رکاب ہے اس لئے کتابوں کا پورا مطالعہ نہیں کرسکا، لیکن جس انداز سے آنجناب نے ان کتابوں کو ترتیب دیا ہے اس کی ورق گردانی سے الحمد للہ بہت مفید معلوم ہوئیں، آنجناب نے چونکہ جو کچھ ان کتابوں میں جمع کیا ہے وہ بندہ کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی معارف القرآن یا بعض دیگر کتب ہی سے اقتباس ہے، اس لئے ان کے استناد کے لئے مکمل مطالعہ کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔

ماشاء اللہ آنجناب نے معارف القرآن وغیرہ سے یہ علمی جواہر بڑی دقیقہ رسی محنت اور اخلاص کے ساتھ جمع فرمائے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعاء بھی ہے اور ان کی رحمت سے امید بھی کہ آنجناب کی یہ کاوش نافع بھی ہوگی اور انشاء اللہ مقبول بھی، اللہ تعالیٰ اس پر آنجناب کو آپ کی شان کے مطابق جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۳۸/۴/۲۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب دامت برکاتہم

ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

الحمدللہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبین سیدنا محمد، وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین، وبعد!

دین کی حمایت اور حمیت رکھنے کے ساتھ علم دین میں رسوخ رکھنے والی گذشتہ صدی ہجری کی شخصیتوں کا جائزہ لیا جائے تو بلا کسی تردد کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے برصغیر نے عالم اسلام کو بڑی فائق اور ممتاز شخصیات عطا کیں، ان شخصیات میں ایک اہم ممتاز شخصیت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندی کی بھی ہے جو دیوبند کے فاضل ومتوطن ہونے کے باوجود پاکستان کی شخصیت کے طور پر متعارف ہوئے، لیکن دیوبندی نسبت کی وجہ سے ان کا اپنے اور ہندوستان سے تعلق کمزور نہیں ہوا، تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان منتقل ہوگئے تھے اور کراچی میں قیام اختیار کرکے وہاں بڑی دینی درسگاہ کی بنیاد رکھی جو دارالعلوم کراچی کے نام سے معروف ہے اور اس کے فضلاء دنیا کے مختلف گوشوں میں خدمت انجام دے رہے ہیں، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان کی حیثیت سے بھی معروف ہوئے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے کبار خلفاء میں امتیازی مقام کے حامل بزرگ کی حیثیت سے بھی پہچانے گئے، وہ ایک صاحبِ تصنیف عالم بھی تھے اور ان کی تصنیفات میں معارف القرآن کو زیادہ مقبولیت اور شہرت ملی، ایک صاحبِ ایمان کو

زندگی کے جن احوال سے گزرنا پڑتا ہے اس کو اپنے ان احوال میں معارف القرآن سے استفادہ زیادہ آسان ہوتا ہے، ان کا عام فہم انداز اور زیادہ مفید ہے۔

چنانچہ بہت سی دینی اصطلاحات اور قرآنی تعبیرات کی انہوں نے جس انداز سے تشریح وتعریف کی ہے اس میں وہ اپنے معاصرین میں زیادہ فائق نظر آتے ہیں۔

ہمارے مفتی محمد زید ندوی استاذ دارالعلوم ندوہ نے اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ کے مشورہ سے حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابوں کی تسہیل وتوضیح اور ان کے افادات کو زیادہ عام فہم بنانے کا جو کام شروع کیا تھا اس میں انہوں نے ان کے خلفاء کو بھی شامل کرکے اس میں وسعت دی۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ان کی پیش نظر تصنیف بھی ہے جو ان دینی وقرآنی وفقہی اصطلاحات کے تعارف وتعریف پر مشتمل ہے جس کی عام حالات میں دینی زندگی گزارنے والوں کو ضرورت پڑتی ہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے علمی افادات سے تیار کی گئی، اس تصنیف سے لوگ اچھا فائدہ اٹھائیں گے، اور اس سے بہت سے شکوک وشبہات سے دور کرنے میں بھی مدد ملے گی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور اس سے نفع کو عام کرے۔ آمین۔

محمد رابع حسنی

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۳/ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ

تقریظ

حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند (یوپی)

جناب مولانا مفتی محمد زید صاحب مظاہری ندوی (استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تصانیف کے مطالعہ اور استفادہ پھر افادہ کا ایک خاص ذوق عطا فرمایا ہے، مفتی صاحب موصوف کا ایک بے حد مفید اور نفع بخش کارنامہ حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی بے شمار تصانیف، مواعظ، ملفوظات اور مکتوبات میں بکھرے ہوئے ایک نوع کے مضامین کو یکجا کر کے الگ الگ عنوان سے شائع کرنے کا عمل اہل علم میں بہت مقبول ہوا، پھر اس نوع کا انتخاب وترتیب کا عمل حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی اور حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ کے افادات کے سلسلہ میں انجام دیا۔

اب مفتی صاحب کا ایک نہایت کارآمد، معلومات افزا اور مفید علمی کارنامہ "کتاب التعریفات" کی شکل میں سامنے آرہا ہے جس میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ صاحبِ تفسیر معارف القرآن کی تصانیف میں سے تعریفات فقہیہ، اصطلاحات شرعیہ کا انتخاب کر کے حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب فرمایا ہے، اور یہ تعریف صرف فنّی اعتبار سے الفاظ کی شرح کی حیثیت ہی نہیں رکھتیں بلکہ ہر ایک تعریف کے ساتھ ضروری تشریحات، احکام اور مسائل وعقائد کو بھی ذکر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور طلباء وعلماء اور عامۃ المسلمین کے لئے نافع بنائے۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۲۳ھ

تقریظ

حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب الاعظمی ندوی

مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنئو

گذشتہ صدی اس ملک کے بلند مقام علمائے دین وشریعت کی صدی شمار ہوتی ہے، اور علم وعمل کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی ممتاز شخصیات کا یہ عہد تاریخی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے، یہی وہ دور ہے جس میں بڑے بڑے علمائے عارفین، محدثین، فقہائے عظام اور تحریک آزادی کے جلیل القدر قائدین نے ملک وملت کی رھنمائی کا فریضہ انجام دیا، اور اسلاف کی امانت کو بعد میں آنے والے حضرات کے سپرد کیا، شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے فرزندان اعلیٰ قدر نے قابل فخر کارناموں کو علم وعمل کی روشنی میں زندۂ جاوید بنادیا، اور جامعیت واعتدال کا ایک عظیم نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اس عہد کے علمائے اسلام کی عالمانہ اور قائدانہ صلاحیتوں نے دینی علوم، اور اسلامی ثقافت، اصول شریعت اور فقہی بصیرت کے ایسے عظیم مراکز اور ادارے، مدارس وجامعات قائم کئے جو دین کے قلعے کے خوبصورت نام سے مشہور ہوئے، انھیں مراکز علمیہ میں دار العلوم دیوبند کا علمی قلعہ بھی ۱۸۶۶ء میں تعمیر ہوا، اور بعد میں ام المدارس کے نام سے اس کا تعارف ہوا، اس علمی مرکز سے تعلق رکھنے والے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فقہ اسلامی اور اصول شریعت کے ماہر اور عالم کبیر تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے جامع العلوم، اور ماہر احکام شریعت کی بیش بہا نعمت

سے سرفراز فرمایا تھا، جو حضرت تھانویؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے، اس سے قبل وہ شیخ الھند سے بیعت تھے، لیکن ان کی وفات کے بعد حضرت تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، مفتی صاحب اس ملک کی علمی اور فقہی تاریخ میں ایک منفرد مقام کے مالک تھے، اس انفرادیت کا اعتراف ہر حلقے اور مکتب فکر سے کیا گیا، اور مستقل کتاب مفتی صاحب کی سوانح حیات پر صاحبزادۂ گرامی حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے تالیف کی، جس میں ان کے علمی اور روحانی عظمتوں کا ذکر موجود ہے، حضرت مفتی صاحب کی تاریخ وفات ۶ /اکتوبر ۱۹۷۶ء ہے، اور تاریخ ولادت ۱۸۹۷ء عیسوی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے دینی علوم اور فقہ وافتاء کے موضوع پر بے شمار کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، ان میں سب سے زیادہ ان کی تفسیری کوشش معارف القرآن کے نام سے ایک بلند مقام رکھتی ہے، اور پڑوسی ملک میں رہ کر وہاں کے اسلامی دستور وقوانین کے نفاذ کے سلسلے میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا، اور ۱۹۵۱ عیسوی میں ۲۲ /نکات پر مشتمل دستوری تجاویز کو مرتب کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

فقہی تعریفات اور شرعی اصطلاحات پر مشتمل ایک نہایت ہی مفید اور بے مثال کتاب (کتاب التعریفات) جس کو مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جملہ تصانیف، فتاوی اور معارف القرآن سے اخذ کر کے مرتب کیا ہے، یہ کتاب حلقۂ علم وفقہ اور علم تفسیر سے اشتغال رکھنے والے حضرات کے لئے انتہائی مفید اور عام اہل علم کیلئے بھی بے حد معلومات افزا ہے، اس بے نظیر کتاب کے چند عنوانات ذیل میں دیئے جارہے ہیں، ان سے کتاب کی افادیت، اور اس کی ہمہ جہت ضرورت کا کسی قدر اندازہ لگایا جاسکتا

ہے،سب سے پہلے اللہ تعالی کی تعریف،اول وآخر اور ظاہر وباطن کی تعریف،خالق وصانع کی تعریف،اسراء ومعراج کی تعریف،استدراج کس کو کہتے ہیں،اس کی تعریف،استنباط کی تعریف،اسراف وتبذیر اور فضول خرچی کی تعریف،اسلام وایمان کا فرق،اور تعریف،اصلاح وفساد مفسد ومصلح کی تعریف،اکمال دین اور اتمام نعمت کی تعریف، یہ اور اس طرح کے جملہ مصطلحات اور مفردات،اور زندگی سے تعلق رکھنے والی ایسی تمام حاجات وضروریات کی تعریف، جو ہر فرد مسلم کی ایک اھم ضرورت ہے،اور انسانی زندگی کے حالات سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے ان تعریفی افادات کا ہمارے رفیق سفر محبّ عزیز جناب مولانا محمد زید صاحب مظاہری ندوی ، استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے منتخب اور مرتب کر کے ایک مستقل تصنیف کی خدمت انجام دی ہے،اور علوم اسلامیہ کے ماہرین اور حلقۂ علم ودین کے لئے ایک عظیم تحفہ کی شکل میں ہے،اسے تیار کر کے امت مسلمہ پر ھمہ جہت احسان کیا ہے۔

میں جناب مولانا مفتی محمد زید صاحب مظاہری ندوی کی خدمت میں اس علمی پیشکش پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں،اور تمنا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اس علمی ودینی خدمت کی انھیں بیش بہا جزا عطا فرمائیں، اور اس کو قبولیت سے سرفراز فرمائیں، اور دین ودنیا کی سعادت سے مشرف کر کے مزید توفیقات علمیہ ودینیہ سے نوازیں۔وما ذلک علی اللہ بعزیز.

سعید الرحمٰن الاعظمی

مدیر مجلّہ ''البعث الاسلامی''

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۳/محرم الحرام/۱۴۳۸ھ/۵/اکتوبر/۲۰۱۶ء

مقدمۃ الکتاب (ازمرتب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم. الحمد للہ رب العٰلمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین محمدوعلی آلہ واصحابہٖ اجمعین.

کسی بھی علم وفن میں اس کی کسی بحث اور مسئلہ کو سمجھنے میں تعریفات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، تعریف کی مدد سے اصل بحث اور اصل مسئلہ کی تہہ تک آسانی سے رسائی ہوجاتی ہے، جس سے حقیقت کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے، اسی لئے علماء محققین نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''میرا دل چاہتا ہے کہ تمام علوم وفنون کی خاص اصطلاحات کو نہایت آسان کرکے اردو میں لکھ دیا جائے جس سے ایک عام آدمی بھی اصطلاحات کو سمجھنے لگے۔''

(مجالس حکیم الامت دہلی ص:۶۵، ملفوظ نمبر:۴۲)

ماضی قریب میں ایک محقق بزرگ گذرے ہیں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ جن کی تفسیر معارف القرآن معروف ومشہور ہے، موصوف مفسر قرآن اور فقیہ النفس ومفتی اعظم ہونے کے ساتھ عربی ادب ولغت میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثانی صاحب مدظلہ آپ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''اگر میں آپ کی عربی نثر کی زیادہ تعریف کروں تو اس میں مبالغہ کا اندیشہ ہے لیکن آپ کے عربی اشعار کے بارے میں کسی خوف کے بغیر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ اگر کہنے والے کا نام لئے بغیر انہیں کسی صاحبِ ذوق کے سامنے رکھا جائے تو وہ بلا تأمّل یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ اشعار اسلامیّین یا مولّدین میں سے کسی عرب شاعر کے ہیں''۔ (البلاغ اشاعت خصوصی مفتی اعظم نمبر ص:۳۷۲، ۳۷۹)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''میں اس دور میں جن علماء کے رسوخ فی العلم اور تبحّر کا معتقد و قائل ہوں ان میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کا خاص مقام ہے، علمی تبحّر، فقہ وفتاویٰ پر وسیع و گہری نظر، قوت تدریس، یہ سب چیزیں بھی قابل قدر اور قابل احترام اوصاف وکمالات ہیں، لیکن ایک دوسری چیز ہے جس کی بناء پر کسی فقیہ ومفتی کو ''فقیہ النفس'' کہتے ہیں، یہ امتیاز علماءِ زمانہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کو حاصل تھا۔'' (خطبات مفکر اسلام، ص ۲۵۵، ج ۳)

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فقیہ ہونے کے ساتھ بڑے درجہ کے ادیب ونحوی بھی تھے، عربی لغت وادب پر ان کی گہری نظر اور مضبوط گرفت تھی، تفسیر معارف القرآن لکھنے کے دوران قاموس، لسان العرب، مفردات القرآن وغیرہ جیسی کتابوں کو نہ معلوم کتنے مرتبہ کھنگالا ہوگا جس کا خلاصہ آسان اردو زبان میں تحریر فرمایا۔

محقق موصوف مفسر قرآن ہونے کے ساتھ مجتہد فی الفروع کا درجہ بھی رکھتے تھے، اپنی فقاہتِ نفس سے بہت سے جدید مسائل میں انہوں نے اجتہاد بھی کیا جو ان کے رسائل فقہیہ وفتاویٰ میں مذکور ہے، محقق موصوف کی فقہی بصیرت اور کتب فقہ پر گہری نظر اہل نظر سے مخفی نہیں، اس لئے جہاں کہیں موقع آتا ہے تو تفسیر معارف القرآن میں نیز اپنے رسائل فقہیہ میں بھی اصطلاحات شرعیہ وفقہیہ کی ایسی تعریف فرماتے اور ایسی تعبیر اختیار کرتے ہیں جو اہل لغت واہل لسان اور فقہاء محققین کی تعبیرات وتعریفات کا خلاصہ اور اس کا مغز ہوتی ہیں کہ اردو زبان میں اس سے زیادہ آسان تعبیر اور جامع تعریف شاید دشوار ہو۔

احقر کو معارف القرآن اور موصوف کے رسائل فقہیہ وفتاویٰ کے مطالعہ سے خاص طور پر اس بات کا احساس ہوا اور تقاضا ہوا کہ حضرت اقدس مفتی صاحب قدس سرہ نے آیات قرآنیہ اور مباحث فقہیہ کے ضمن میں جو اصطلاحات وتعریفات ذکر فرمائی

ہیں ان کو علاحدہ حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق جمع کر دیا جائے، چنانچہ احقر نے یہ کام شروع کیا، اور اپنی ایک کتاب ''دین وشریعت کی بنیادیں اور فقہی اصول وضابطے قرآن کی روشنی میں'' جس کو احقر نے معارف القرآن اور حضرت مفتی صاحب کے دیگر رسائل فقہیہ سے اخذ کر کے مرتب کیا ہے، جس میں اصول شرع: کتاب وسنت، اجماع وقیاس، اجتہاد وتقلید، افتاء استفتاء، انبیاء وصحابہ، اسلام وایمان، کفر ونفاق، توحید وشرک، سنت و بدعت، اور قواعدِ فقہیہ سے متعلق مضامین چن چن کر جمع کئے ہیں، جن کو حضرت مفتی صاحبؒ نے خداداد فقیہانہ بصیرت سے قرآن کی روشنی میں تحریر فرمایا ہے، یہ کتاب شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے، اس کو اردو کا ''اصول فقہ قرآن کی روشنی میں'' کہنا چاہئے، اسی کتاب کا ایک باب تعریفات فقہیہ واصطلاحات شرعیہ سے متعلق تھا، جو اصلاً اسی کتاب کا جز تھا لیکن اس کی ضخامت اتنی بڑھ گئی کہ اس کو مستقلاً علاحدہ شائع کرنا مناسب معلوم ہوا۔

اس موضوع پر فنی حیثیت سے مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں مثلاً علامہ جرجانیؒ کا مختصر رسالہ ''کتاب التعریفات'' اس سلسلہ میں بہت معروف ومشہور ہے، جس میں بہت سی تعریفات ذکر کی گئی ہیں، نیز مولانا عمیم الاحسان صاحبؒ نے اپنے مرتب کردہ مجموعہ ''قواعد الفقہ'' میں ایک ضخیم رسالہ میں تعریفات فقہیہ واصطلاحات شرعیہ کو بسط وتفصیل سے جمع فرمایا ہے۔

احقر کی بھی یہ حقیر سی کوشش ہے اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے اپنی بارگاہِ عالی میں اس کو قبول فرمائے اور اہل علم حضرات کے لئے اس کو مفید اور نافع بنائے۔

محمد زید مظاہری ندوی

استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۰ ر رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ

کتاب التعریفات

تعریفات فقہیہ واصطلاحات شرعیہ

افادات

فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

انتخاب وترتیب

محمد زید مظاہری ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ ربِّ العٰلمین و الصلوۃ و السلام علی سید المرسلین محمدٍ و علیٰ آلہ و أصحابہ أجمعین، اما بعد!

تعریفات فقہیہ و اصطلاحات شرعیہ

﴿۱﴾

اللہ کی تعریف

لفظ ''اللہ'' اسم ذات ہے جس کے معنیٰ ہیں: وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک ہے۔ (معارف القرآن سورہ فاتحہ پ۱-۱/۶۱۳)

لفظ ''اللہ'' اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب زیادہ جامع نام ہے، اور بعض علماء نے اسی کو اسم اعظم کہا ہے، اور یہ نام اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہوسکتا، اس لیے اس لفظ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے، کیونکہ اللہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نام ہے اس موجود حق کا جو تمام صفاتِ کمال کا جامع اور صفاتِ ربوبیت کے ساتھ متصف، یکتا اور بے مثال ہے۔

(معارف القرآن سورہ فاتحہ پ۱-۱/۶۴)

اول و آخر اور ظاہر و باطن کی تعریف

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (سورہ حدید)

اول وآخر، ظاہر وباطن کے معنیٰ میں حضرات مفسرین کے اقوال دس سے زیادہ منقول ہے جن میں کوئی تعارض نہیں، سبھی کی گنجائش ہے، لفظ اول کے معنیٰ تو تقریباً متعین ہے یعنی وجود کے اعتبار سے تمام موجودات وکائنات سے مقدم اور پہلا ہے، کیونکہ ساری موجودات اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں، اس لئے وہ سب سے اول ہے، اور آخر کے معنیٰ بعض حضرات نے یہ کئے کہ تمام موجودات کے فنا ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہے گا جیسا کہ آیت کُلُّ شَیءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ میں اس کی تصریح ہے اور فنا سے مراد عام ہے، خواہ فنا وعدم کا وقوع ہو جائے جیسا قیامت کے روز عام مخلوقات فنا ہو جائے گی، یا فنا کا وقوع نہ ہو مگر اس کی فنا وعدم ممکن ہو اور وہ اپنی ذات میں عدم کے خطرہ سے خالی نہ ہو، اس کو موجود ہونے کے وقت بھی فانی کہہ سکتے ہیں، اس کی مثال جنت ودوزخ اور ان میں داخل ہونے والے اچھے بُرے انسان ہیں، کہ ان کا وجود فنا نہیں ہوگا مگر باوجود وقوعاً فناء نہ ہونے کے امکان واحتمالِ فنا سے پھر بھی خالی نہیں، صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے، جس پر کسی حیثیت اور کسی مفہوم سے نہ پہلے کبھی عدم طاری ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس کا امکان ہے، اس لئے اس کو سب سے آخر کہہ سکتے ہیں۔

اور امام غزالیؒ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کو آخر باعتبار معرفت کے کہا گیا ہے کہ سب سے آخر معرفت اس کی ہے، انسان علم ومعرفت میں ترقی کرتا رہتا ہے، مگر یہ سب درجات جو اس کو حاصل ہوئے راستے کی مختلف منزلیں ہیں، اس کی انتہا اور آخری حد حق تعالیٰ کی معرفت ہے (از روح المعانی)

اور ظاہر سے مراد وہ ذات ہے اپنے ظہور میں ساری چیزوں سے فائق وبرتر ہو اور ظہور چونکہ وجود کی فرع ہے تو جب حق تعالیٰ کا وجود سب موجودات پر فائق اور مقدم ہے اس کا ظہور بھی سب پر فائق ہے کہ اس سے زیادہ اس عالم میں کوئی چیز

ظاہر نہیں کہ اس کی حکمت وقدرت کے مظاہر دنیا کے ہر ہر ذرّہ میں نمایاں ہیں، اور باطن اپنی ذات کی کُنہ اور حقیقت کے اعتبار سے ہے، کہ اس کی حقیقت تک کسی عقل وخیال کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ (معارف القرآن ص ۲۹۳، ج ۸، سورہ حدید پ ۲۷)

ابن السبیل کی تعریف

سبیل کے معنی راستہ اور ابن کا لفظ اصل میں تو بیٹے کیلئے بولا جاتا ہے، لیکن عربی محاورات میں ابن اور اب اور اخ وغیرہ کے الفاظ ان چیزوں کیلئے بھی بولے جاتے ہیں جن کا گہرا تعلق کسی سے ہو، اسی محاورہ کے مطابق ابن السبیل راہ گیر ومسافر کو کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کا گہرا تعلق راستہ قطع کرنے اور منزل مقصود پر پہنچنے سے ہے، اور مصارفِ زکوۃ میں اس سے مراد وہ مسافر ہے جس کے پاس سفر میں بقدر ضرورت مال نہ ہو، اگرچہ اس کے وطن میں اس کے پاس کتنا ہی مال ہو، ایسے مسافر کو مالِ زکوۃ دیا جاسکتا ہے، جس سے وہ اپنے سفر کی ضروریات پوری کرلے، اور وطن واپس جاسکے۔ (معارف القرآن ص ۴۰۹، ج ۴، سورہ توبہ پ ۱۰)

اِتمامِ نعمت کی تعریف اور اکمال واتمام کا فرق

اتمام نعمت سے مراد مسلمانوں کا غلبہ اور عروج اور ان کے مخالفین کا مغلوب ومفتوح ہونا ہے، جس کا ظہور مکہ مکرمہ کی فتح اور رسوم جاہلیت کے مٹانے سے اور اس سال حج میں کسی مشرک کے شریک نہ ہونے کے ذریعہ ہوا۔

یہاں الفاظ قرآن میں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ دین کے ساتھ لفظ اکمال استعمال فرمایا گیا اور نعمت کے ساتھ لفظ اتمام، حالانکہ یہ دونوں لفظ بظاہر ایک دوسرے کے ہم معنی اور مرادف سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن درحقیقت ان دونوں کے مفہوم میں ایک فرق ہے جس کو مفردات القرآن

میں امام راغب اصفہانیؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ کسی چیز کا ''اکمال اور تکمیل'' اس کو کہتے ہیں کہ اس چیز سے جو غرض اور مقصود تھا وہ پورا ہو گیا، اور لفظ اتمام کے معنی یہ ہیں کہ اب دوسری چیز کی ضرورت اور حاجت نہیں رہی، اس لیے ''اکمال دین'' کا حاصل یہ ہوا کہ قانون الٰہی اور احکام دین کے اس دنیا میں بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ آج پورا کر دیا گیا، اور اتمام نعمت کا مطلب یہ ہوا کہ اب مسلمان کسی کے محتاج نہیں، ان کو خود حق تعالیٰ جل شانہ نے غلبہ، قوت اور اقتدار عطا فرما دیا جس کے ذریعہ وہ اس دین حق کے احکام کو جاری اور نافذ کر سکیں۔　(معارف القرآن ۳/۳۷، سورہ مائدہ پ ۶)

اجتہاد کی تعریف

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ محدث دہلویؒ اپنی کتاب ''عقد الجید'' میں فرماتے ہیں:

الإجتهاد على مايفهم من كلام العلماء استفراغ الجهد فى إدراك الأحكام الشرعية كلياتها إلى أربعة أقسام الكتاب والسنة والإجماع والقياس (إلى أن قال) وشرطه أنه لابدّ له ان يعرف من الكتاب والسنة ما يتعلق بالأحكام ومواقع الإجماع وشرائط القياس وكيفية النظر وعلم العربية والناسخ والمنسوخ وحال الرواة ولا حاجة إلى الكلام والفقه.

اجتہاد کی تعریف جو کلام علماء سے سمجھی جاتی ہے یہ ہے کہ خوب محنت کرنا دریافت کرنے میں شریعت کے احکام فرعی کو ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی کلیات کا مآل چار قسم پر ہے یعنی کتاب اور سنت اور اجماع اور قیاس پر۔ اور اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ اجتہاد والے کو ضروری ہے کہ قرآن وحدیث اس قدر جانتا ہو کہ جو احکام سے متعلق ہے، اور اجماع کے موقعوں اور قیاس صحیح کی شرطوں اور نظر کی کیفیت اور علم عربیت اور

ناسخ اور منسوخ اور راویوں کے حال سے واقف ہو اور اجتہاد میں علم کلام اور اصطلاحی علم فقہ کی کچھ حاجت نہیں۔ (جواہر الفقہ ص۱۲۲، ج۱)

اجل (تقدیر) کی تعریف

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (پ۱۳، سورہ الرعد)

اجل کے معنیٰ مدّت معیّنہ اور میعاد کے آتے ہیں، اور کتاب اس جگہ بمعنیٰ مصدر ہے یعنی تحریر، معنیٰ یہ ہیں کہ ہر چیز کی میعاد اور مقدار اللہ تعالیٰ کے پاس لکھی ہوئی ہے، اس نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت پیدا ہوگا اور اتنے دن زندہ رہے گا، کہاں کہاں جائے گا، کیا کیا کام کرے گا، کس وقت اور کہاں مرے گا۔

اسی طرح یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں زمانہ میں فلاں پیغمبر پر کیا وحی اور احکام نازل ہوں گے، کیونکہ احکام کا ہر زمانہ اور ہر قوم کے مناسب حال آتے رہنا ہی مقتضائے عقل وانصاف ہے، اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں پیغمبر سے فلاں وقت کس معجزہ کا ظہور ہوگا۔ (معارف القرآن ۱۳۶/۴، سورہ الرعد، پ۱۳)

اجل (تقدیر) کی تعریف اور اس کی دو قسمیں مُبرَم اور معلّق

وَيُؤَخِّرُكُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى (سورہ نوح، پ۲۹)

اجل کے معنیٰ مدّت اور مسمّٰی سے مراد متعین کردہ، مطلب یہ ہے کہ اگر تم ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس مدّت تک دنیا میں مہلت دے گا جو تمہارے لئے مقرر اور متعین ہے، یعنی مقرّرہ مدّتِ عمر سے پہلے تمہیں کسی دنیوی عذاب میں پکڑ کر ہلاک نہ کرے گا، اس کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایمان نہ لائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ مدتِ مقررہ سے پہلے ہی تم پر عذاب لاکر ہلاک کردے، معلوم ہوا کہ عمر کی مدّتِ مقررہ میں بعض اوقات کوئی شرط ہوتی ہے کہ اس نے فلاں کام کرلیا تو اس کی عمر مثلاً

اسّی (۸۰) سال ہوگی اور نہ کیا تو ساٹھ سال میں موت مسلط کردی جائے گی یا منفی کاموں میں اللہ کی ناشکری سے عمر گھٹ جانا اور شکر گذاری سے عمر بڑھ جانا، اسی طرح بعض اعمال مثلاً والدین کی اطاعت وخدمت سے عمر میں ترقی ہونا جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے۔

اس کی تشریح تفسیر مظہری میں یہ ہے کہ تقدیر اور قضائے الٰہی کی دو قسمیں ہیں ایک مُبرَم یعنی قطعی، دوسری معلّق یعنی جو کسی شرط پر معلّق ہو، یعنی لوحِ محفوظ میں اس طرح لکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے اگر اللہ کی اطاعت کی تو اس کی عمر مثلاً ستّر سال ہوگی اور نہ کی تو پچاس سال میں ماردیا جائے گا، اس دوسری قسم تقدیر میں شرط نہ پائے جانے پر تبدیلی ہوسکتی ہے، قرآن کریم میں ان دونوں قسم کی قضا وتقدیر کا ذکر اس آیت میں ہے، **يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ اُمُّ الْكِتَابِ** یعنی اللہ تعالیٰ لوح محفوظ میں محو واثبات یعنی ترمیم وتبدیل کرتا رہتا ہے، اور اللہ کے پاس ہے اصل کتاب، اصل کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جس میں تقدیرِ مُبرَم لکھی ہوئی ہے، کیونکہ تقدیر معلّق میں جو شرط لکھی گئی ہے اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ شخص یہ شرط پوری کرے گا یا نہیں، اس لئے تقدیر مُبرَم میں قطعی فیصلہ لکھا جاتا ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **لا یردّ القضاء الا الدّعا ولا یزید فی العمر الّا البرّ** (رواہ الترمذی، مظہری)

یعنی قضائے الٰہی کو کوئی چیز بجز دعا کے نہیں روک سکتی اور کسی کی عمر میں زیادتی بجز برّ والدین کے نہیں ہوسکتی، برّ کے معنیٰ ان کے ساتھ اچھا سلوک ہے اور مطلب اس حدیث کا یہی ہے کہ تقدیر معلّق میں ان اعمال کی وجہ سے تبدیلی ہوسکتی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جو اجل مسمّیٰ تک مؤخر کرنے کو ان کے ایمان لانے پر موقوف کیا ہے یہ ان کی عمر کے بارے میں تقدیر معلّق کا بیان ہے۔ (معارف القرآن ۸/۵۶۴، سورہ نوح، پ۲۹)

اجماع کی تعریف

اجماع کی حقیقت یہ ہے کہ اس امت کے علمائے مجتہدین اگر کسی مسئلہ میں ایک حکم پر اتفاق کرلیں تو یہ حکم بھی ایسا ہی واجب الاتباع اور واجب التعمیل ہوتا ہے جیسے قرآن و حدیث کے صریح احکام۔ جس کی حقیقت دوسرے عنوان سے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نبوت ختم کردی گئی تو آپ کے بعد کوئی ہستی معصوم باقی نہیں رہتی جس کے حکم کو غلطی سے پاک اور ٹھیک حکم خداوندی کا ترجمان کہا جاسکے، اس لیے رحمت خداوندی نے امت محمدیہ کے مجموعہ کو ایک نبی معصوم کا درجہ دے دیا، کہ ساری امت جس چیز کے اچھے یا بُرے ہونے پر متفق ہوجائے وہ علامت اس کی ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا ہی ہے جیسا امت کے مجموعہ نے سمجھا ہے۔

اسی بات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

لَنْ تَجْمَعَ اُمَّتِیُ عَلَی الضَّلَالَۃِ۔

یعنی میری امت کا مجموعہ کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتا۔

(رسالہ ختم نبوت، جواہر الفقہ ص۲۳، ج۶)

احبار، علماء، صوفیاء اور ربّانی و مشائخ کی تعریف

انبیاء علیہم السلام کے نائبین کو دو قسموں میں ذکر فرمایا ہے، پہلے ربّانیّون، دوسرے احبار، لفظ ربانی رب کی طرف منسوب ہے، جس کے معنی ہیں اللہ والا، اور احبار، حبر کی جمع ہے، یہود کے محاورہ میں عالم کو حبر کہا جاتا تھا، اگرچہ یہ بات ظاہر ہے کہ جو اللہ والا ہوگا ضروری ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ضروری احکام کا علم بھی ہو، ورنہ بغیر علم کے عمل نہیں ہوسکتا، اور بغیر احکام الٰہیہ کی اطاعت و عمل کے کوئی شخص اللہ

والا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اللہ کے نزدیک عالم اسی کو کہا جاتا ہے جو اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہو، ورنہ وہ عالم جو احکام الٰہیہ سے واقف ہونے کے باوجود ضروری فرائض وواجبات پر بھی عمل نہیں کرتا، نہ اس کی طرف کوئی دھیان دیتا ہے، وہ اللہ ورسول کے نزدیک جاہل سے بدتر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر اللہ والا عالم ہوتا ہے، اور ہر عالم اللہ والا ہوتا ہے، مگر اس جگہ ان دونوں کو الگ الگ بیان فرما کر اس بات پر متنبہ فرمادیا کہ اگرچہ اللہ والے کے لیے علم ضروری اور عالم کے لیے عمل ضروری ہے، لیکن جس پر جس رنگ کا غلبہ ہو، اس لیے اس اعتبار سے اس کا نام رکھا جاتا ہے، جس شخص کی توجہ زیادہ تر عبادات وعمل اور ذکر اللہ میں مصروف ہے، اور علم دین صرف بقدر ضرورت حاصل کرلیتا ہے وہ ربانی یعنی اللہ والا کہلاتا ہے، جس کو آج کل کی اصطلاح میں شیخ، مرشد، پیر وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں۔

اور جو شخص عملی مہارت پیدا کرکے لوگوں کو احکام شرعیہ بتلانے سکھلانے کی خدمت میں زیادہ مشغول ہے، اور فرائض وواجبات اور سنن مؤکدہ کے علاوہ دوسری نفلی عبادات میں زیادہ وقت نہیں لگا سکتا، اس کو حبر یا عالم کہا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس میں شریعت وطریقت اور علماء ومشائخ کی اصل وحدت کو بھی بتلادیا، اور طریقۂ کار اور غالب مشغلہ کے اعتبار سے ان میں فرق کو بھی واضح کردیا جس سے معلوم ہوگیا کہ علماء اور صوفیاء کوئی دو فرقے یا دو گروہ نہیں، بلکہ دونوں کا مقصد زندگی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت وفرمانبرداری ہے، البتہ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کے طریقہ کار صورۃً متغائر نظر آتے ہیں۔

(معارف القرآن ۱۶۰/۳، سورہ مائدہ پ ۶)

احتناک و استفزاز کے معنی

احتناک کے معنی ہیں کسی چیز کا استیصال اور فنا کردینا یا پوری طرح اس پر غالب

آنا۔ (قرطبی)

اور استفزاز کے اصلی معنی قطع کرنے کے ہیں، مراد اس جگہ حق سے قطع کردینا۔

(معارف القرآن، بنی اسرائیل ۲۹۰/۵)

احرام واستلام کی تعریف

احرام کے معنی کسی چیز کو حرام کرنا، حاجی جس وقت حج یا عمرہ یا دونوں کی نیت پختہ کرکے تلبیہ پڑھتا ہے تو اس پر چند حلال چیزیں حرام ہوجاتی ہیں، اس لیے اس کو احرام کہتے ہیں اور مجازاً ان چادروں کو بھی احرام کہتے ہیں جن کو حاجی احرام کی حالت میں استعمال کرتے ہیں۔

استـــــلام، حجراسود کو بوسہ دینا اور ہاتھ سے چھونا، یا حجراسود یا رکنِ یمانی کو صرف ہاتھ لگانا۔

اضـطباع، احرام کی چادر کو داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں کاندھے پر ڈالنا۔ (احکام حج ص:۸)

احزاب کی تعریف

احزاب: حزب کی جمع ہے جس کے معنیٰ پارٹی یا جماعت کے آتے ہیں، اس غزوہ میں کفار کی مختلف جماعتیں متحد ہوکر مسلمانوں کو ختم کردینے کا معاہدہ کرکے مدینہ پر چڑھ آئی تھیں، اسی لیے اس غزوہ کا نام غزوۂ احزاب رکھا گیا ہے۔ اور چونکہ اس غزوہ میں دشمن کے آنے کے راستہ پر بامر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خندق کھودی گئی تھی اس لیے اس کو غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔

(معارف القرآن، احزاب ۱۰۰/۷)

احسان کی تعریف

احسان کی تعریف حدیث جبرئیل کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔ (مشکوۃ شریف)

یعنی تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ حالت پیدا نہ ہوتو کم از کم یہ حالت تو ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

(معارف القرآن ۲/۲۴۱، آل عمران پ۴)

احسان اور محسنین کی تعریف

اللہ تعالیٰ محسنین یعنی نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے، اس میں بظاہر محسنین سے مراد وہ لوگ ہیں جو آیات مذکورہ کے احکام امر ونہی کے پابند ہوں یعنی دین میں استقامت کا مقام ان کو حاصل ہو، حدود شرعیہ کی پوری رعایت کرتے ہوں، ظالموں کے ساتھ دوستی اور بے ضرورت تعلق نہ رکھتے ہوں، نماز کو آداب کے ساتھ افضل وقت میں ادا کرنے کے پابند ہوں، تمام احکام دین پر ثابت قدم ہوں۔

اور خلاصہ ان سب کا وہی ہے جو احسان کی تعریف میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، یا کم از کم یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں، جب انسان کو حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے یقین کا یہ درجہ حاصل ہو جائے تو اس کے تمام اقوال وافعال خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔

علماء سلف میں تین کلمے ایسے معروف تھے جو باہم ایک دوسرے کو لکھا کرتے تھے، وہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

اول یہ کہ جو شخص آخرت کے لیے کام میں مشغول ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دنیا کے کاموں کو خود بخود درست فرما دیتے ہیں اور ان کی ذمہ داری خود لے لیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جو شخص اپنی باطنی حالت کو درست کر لے کہ قلب کا رخ سب سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دے، تو اللہ تعالیٰ اس کی ظاہری حالت کو خود بخود درست فرما دیتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے معاملہ کو صحیح و درست کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے اور تمام لوگوں کے درمیان معاملات کو خود درست فرما دیتے ہیں۔ اصل عبارت ان تین کلمات کی یہ ہے:

وَکَانَ اَھْلُ الْخَیْرِ یَکْتُبُ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ بِثَلاثِ کَلِمَاتٍ، مَنْ عَمِلَ لآخِرَتِہٖ کَفَاہُ اللّٰہُ امر دُنْیَاہُ، وَمَنْ اَصْلَحَ سَرِیْرَتَہٗ اَصْلَحَ اللّٰہُ عَلانِیَتَہٗ وَمَنْ اَصْلَحَ فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اللّٰہِ اَصْلَحَ اللّٰہُ مَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ النَّاسِ

(تفسیر روح البیان ۱۳۱/۲، معارف القرآن ۶۷۹/۴، سورہ ہود پ ۱۱)

احکامِ شرعیہ و تکوینیہ کی تعریف

احکام الٰہی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تشریعی احکام جن میں ایک قانون بتلایا جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی کی سزا بتلا دی جاتی ہے، مگر کرنے والے کو کسی جانب پر مجبور محض نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو ایک درجہ کا اختیار دیا جاتا ہے، وہ اپنے اختیار سے اس قانون کی پابندی کرے یا خلاف ورزی کرے اور ایسے احکام عموماً ان مخلوقات پر عائد ہوئے ہیں جو ذوی العقول کہلاتے ہیں جیسے انسان اور جن، یہیں سے ان میں مومن و کافر اور مطیع و نافرمان کی دو قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دوسری قسم احکام کی تکوینی اور تقدیری احکام ہیں ان کی تنفیذ جبری ہوتی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ سر مو ان کے خلاف کر سکے، ان احکام کی تعمیل کل مخلوقات

کرتی ہیں ان میں انسان و جن بھی شامل ہیں تکوینی احکام میں ان کے لیے جو مقدر کر دیا گیا ہے مؤمن ہو یا کافر متقی ہو یا فاسق سب کے سب اسی تقدیری قانون کے تابع چلنے پر مجبور ہیں۔ (معارف القرآن ۸/۲۰۳)

اخلاص کی تعریف

اخلاص کے معنی حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے یہ بتلائے ہیں کہ انسان اپنے دین میں مخلص ہو کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اور اپنے عمل کو خالص اللہ کے لیے کرے، لوگوں کو دکھلانے یا ان کے مدح و شکر کی طرف نظر نہ ہو۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اخلاص ایک ایسا عمل ہے جس کو نہ تو فرشتے پہچان سکتے ہیں نہ شیطان، وہ صرف بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک راز ہے۔

(معارف القرآن سورہ بقرہ ۱/۳۵۸)

ارتداد کی تعریف

ارتداد کے معنی لغت میں پھر جانے اور لوٹ جانے کے ہیں، اور اصطلاح شریعت میں ایمان و اسلام سے پھر جانے کو ارتداد اور پھرنے والے کو مرتد کہتے ہیں۔ اور ارتداد کی صورتیں دو ہیں، ایک تو یہ کہ کوئی کم بخت صاف طور پر تبدیلِ مذہب کر کے اسلام سے پھر جائے جیسے عیسائی، یہودی، آریہ سماجی وغیرہ مذہب اختیار کرے یا خداوند عالم کے وجود یا توحید کا منکر ہو جائے، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر دے (العیاذ باللہ تعالیٰ)

دوسرے یہ کہ اس طرح صاف طور پر تبدیل مذہب اور توحید و رسالت سے انکار نہ کرے، لیکن کچھ اعمال یا اقوال یا عقائد ایسے اختیار کرے جو انکار قرآن مجید یا انکار رسالت کے مرادف و ہم معنی ہیں۔ مثلاً اسلام کے کسی ایسے ضروری و قطعی حکم کا

انکار کر بیٹھے، جس کا ثبوت قرآن مجید کی نص صریح سے ہو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق تواتر ثابت ہوا ہو، یہ صورت بھی باجماع امت ارتداد میں داخل ہے اگرچہ اس ایک حکم کے سوا تمام احکام اسلامیہ پر شدت کے ساتھ پابند ہو۔

ارتداد کی اس دوسری صورت میں اکثر مسلمان غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ایسے لوگوں کو مسلمان سمجھتے ہیں، اور یہ اگرچہ بظاہر ایک سطحی اور معمولی غلطی ہے لیکن اگر اس کے ہولناک نتائج پر نظر کی جائے تو اسلام اور مسلمان کے لیے اس سے زیادہ کوئی چیز مضر نہیں، کیونکہ اس صورت میں کفر و اسلام کے حدود ممتاز نہیں رہتے کافر و مومن میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ اسلام کے چالاک دشمن اسلامی برادری کے ارکان بن کر مسلمانوں کے لیے ''مارآستین'' بن سکتے ہیں اور دوستی کے لباس میں دشمنی کی ہر قرارداد کو مسلمانوں میں نافذ کر سکتے ہیں۔ (جواہر الفقہ ۱/ ۲۸)

ارذل العُمر کی تعریف

اس سے مراد پیرانہ سالی کی وہ عمر ہے جس میں انسان کے تمام جسمانی اور دماغی قویٰ مختل ہو جاتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس عمر سے پناہ مانگتے تھے، ارشاد ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ سُوْءِ الْعُمُرِ

وفی رِوَایۃٍ مِنْ اَنْ اُرَدَّ اِلیٰ اَرْذَلِ الْعُمُرِ

یعنی یا اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں بُری عمر سے، اور ایک روایت میں ہے کہ پناہ مانگتا ہوں اَرذلِ عمر سے۔

ارذل العمر کی تعریف میں کوئی تعیین نہیں ہے البتہ مذکورہ تعریف راجح معلوم ہوتی ہے، جس کی طرف قرآن نے بھی **لِکَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا** سے اشارہ کیا ہے، کہ وہ ایسی عمر ہے جس میں ہوش وحواس باقی نہیں رہتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام معلومات بھول جاتا ہے۔

اَرذل العمر کی تعریف میں اور بھی اقوال ہیں بعض نے اسّی سال کی عمر کو اَرذل العمر قرار دیا ہے اور بعض نے نوّے سال کو، حضرت علیؓ سے بھی پچھتر سال کا قول منقول ہے۔ (صحیحین بحوالہ مظہری) (معارف القرآن، ۳۶۹، ج ۵ سورہ نحل)

ارہاص کی تعریف اور ارہاص و معجزہ کا فرق

معجزات کا قانون یہ ہے کہ وہ نبی کے دعوائے نبوت کے ساتھ اُن کی تصدیق کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں، دعوائے نبوت سے پہلے بلکہ نبی کی ولادت سے پہلے بھی حق تعالیٰ بعض اوقات دنیا میں ایسے واقعات اور نشانیاں ظاہر فرماتے ہیں جو خرق عادت ہونے میں مثل معجزہ کے ہوتے ہیں، اس طرح کی نشانیوں کو محدّثین کی اصطلاح میں ارہاص کہا جاتا ہے، جو تاسیس وتمہید کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، رہص سنگ بنیاد کو کہتے ہیں (قاموس) انبیاء علیہم السلام کی دنیا میں تشریف آوری سے یا ان کے دعوائے نبوت سے پہلے بھی حق تعالیٰ کچھ ایسی نشانیاں ظاہر فرماتے ہیں جو معجزات کی قسم سے ہوتی ہے اور ایسی نشانیاں چونکہ ان کی نبوت کے اثبات کا مقدمہ اور اس قسم کی تمہید وتاسیس ہوتی ہیں، اس لئے ان کو ارہاص کہا جاتا ہے، نبی کریم ﷺ کی بعثت اور ولادت سے پہلے بھی اس قسم کے ارہاصات متعدد قسم کے ہوئے ہیں، اصحاب فیل کو آسمانی عذاب کے ذریعہ بیت اللہ پر حملہ سے روک دینا بھی انہی ارہاصات میں سے ہے۔ (معارف القرآن ۸۱۷، ج ۸، سورہ فیل)

ازلام کی تعریف

''ازلام'' زَلَم کی جمع ہے، ازلام ان تیروں کو کہا جاتا ہے جن پر قرعہ اندازی کر کے عرب میں جُوا کھیلنے کی رسم جاری تھی، جس کی صورت یہ تھی کہ دس آدمی شرکت میں ایک اونٹ ذبح کرتے تھے پھر اس کا گوشت تقسیم کرنے کے لیے بجائے اس کے

کہ دس حصے برابر کرکے تقسیم کرتے اس میں اس طرح جُوا کھیلتے کہ دس عدد تیروں میں سات تیروں پر کچھ مقررہ حصوں کے نشانات بنا رکھتے تھے، کسی پر ایک کسی پر دو یا تین اور تین تیروں کو سادہ رکھا ہوا تھا، ان تیروں کو ترکش میں ڈال کر ہلاتے تھے، پھر ایک ایک شریک کے لیے ایک ایک تیر ترکش میں سے نکالتے، اور جتنے حصوں کا تیر کسی کے نام پر نکل آئے، وہ اُن حصوں کا مستحق سمجھا جاتا تھا، اور جس کے نام پر سادہ تیر نکل آئے وہ حصہ سے محروم رہتا تھا، جیسے آج کل بہت سی قسمیں لاٹری کے طریقہ پر بازاروں میں جاری ہیں، اس طرح کی قرعہ اندازی قمار یعنی جُوا ہے، جواز روئے قرآن کریم حرام ہے۔ (معارف القرآن ۲۲۶/۳، سورہ مائدہ پ ۶)

اسراء ومعراج کی تعریف

''اَسـرىٰ'' اسراء سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنیٰ رات کو لے جانا ہے، اس کے بعد لیلاً کے لفظ سے صراحۃً بھی اس مفہوم کو واضح کردیا اور لفظ لیلاً کے نکرہ لانے سے اس طرف بھی اشارہ کردیا کہ اس تمام واقعہ میں پوی رات بھی صرف نہیں ہوئی، بلکہ رات کا ایک حصہ صرف ہوا ہے۔

مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر جس کا ذکر اس آیت میں ہے، اس کو اسراء کہتے ہیں، اور یہاں سے جو سفر آسمانوں کی طرف ہوا اس کا نام معراج ہے، اسراء اس آیت کی نص قطعی سے ثابت ہے، اور معراج کا ذکر سورہ نجم کی آیت میں ہے، اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ (معارف القرآن ج ۵/ص ۴۲۶، بنی اسرائیل پ ۱۵)

استدراج کی تعریف

استدراج کے معنیٰ درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ کوئی کام کرنے کے آتے ہیں، اصطلاح قرآن میں وسنت میں استدراج اس کو کہا جاتا ہے کہ بندہ کے گناہ پر دنیا میں

کوئی تکلیف و مصیبت نہ آئے، بلکہ جوں جوں وہ گناہ میں آگے بڑھتا جائے دنیاوی مال واسباب اور بڑھتے جائیں، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنی بدکرداری پر کسی وقت تنبیہ نہیں ہوتی، اور غفلت سے آنکھ نہیں کھلتی، اور اپنے برے اعمال اس کو برے نہیں نظر آتے، کہ وہ ان سے باز آنے کی فکر کرے۔

انسان کی یہ حالت اس مریضِ لاعلاج کے مشابہ ہے جو بیماری ہی کو شفا اور زہر ہی کو تریاق سمجھ کر استعمال کرنے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو دنیا ہی میں یہ شخص دفعۃً عذاب میں پکڑ لیا جاتا ہے، اور کبھی موت تک یہ سلسلہ چلتا ہے، بالآخر موت ہی اس کی سستی اور بے ہوشی کا خاتمہ کرتی ہے، اور دائمی عذاب اس کا ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ (معارف القرآن ج ۴/ص ۱۳۷، بنی اسرائیل پ ۹)

استنباط کی تعریف

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ: استنباط اصل میں کوئیں کی تہ سے پانی نکالنے کو کہتے ہیں کنواں کھودنے میں جو پانی پہلی مرتبہ نکلتا ہے اس کو ماء مستنبط کہتے ہیں، مگر یہاں مراد یہ ہے کہ کسی بات کی تہ تک پہونچ کر اس کی صحیح حقیقت معلوم کرنا۔ (قرطبی)

(معارف القرآن سورہ نساء پ ۵-۲/۴۹۲)

استقامت کی تعریف

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ الآیۃ۔ (پ ۱۲، سورۂ ہود)

استقامت کے معنی سیدھا کھڑا رہنے کے ہیں، جس میں کسی طرف ذرا سا جھکاؤ نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، کسی لوہے پتھر وغیرہ کے عمود کو ماہر انجینئر ایک مرتبہ اس طرح کھڑا کر سکتے ہیں کہ اس کے ہر طرف زاویہ قائمہ ہی رہے کسی طرف ادنیٰ میلان نہ ہو، لیکن کسی متحرک چیز کا ہر وقت ہر حال میں اس حالت پر قائم

رہنا کس قدر مشکل ہے وہ اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کو اس آیت میں اپنے ہر کام میں ہر حال میں استقامت پر رہنے کا حکم فرمایا گیا ہے، ''استقامت'' لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے، کیونکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ:

انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسبِ معاش اور اس کی آمد و صرف کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہ کی قائم کردہ حدود کے اندر اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر سیدھا چلتا رہے، ان میں سے کسی باب کے کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی، زیادتی ہو جائے، تو استقامت باقی نہیں رہتی۔

دنیا میں جتنی گمراہیاں اور عملی خرابیاں آتی ہیں، وہ سب اسی استقامت سے ہٹ جانے کا نتیجہ ہوتی ہیں، عقائد میں استقامت نہ رہے تو بدعات سے شروع ہو کر کفر و شرک تک نوبت پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ذات و صفات کے متعلق جو معتدل اور صحیح اصول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے اس میں افراط و تفریط یا کمی بیشی کرنے والے خواہ نیک نیتی ہی سے اس میں مبتلا ہوں گمراہ کہلائیں گے، انبیاء علیہم السلام کی عظمت و محبت کی جو حدود مقرر کر دی گئی ہیں ان میں کمی کرنے والوں کا گمراہ و گستاخ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، ان میں زیادتی اور غلو کر کے رسول کو خدائی صفات و اختیارات کا مالک بنا دینا بھی اسی طرح کی گمراہی ہے، یہود و نصاریٰ اسی گمراہی میں کھوئے گئے، عبادات اور تقرب الی اللہ کے لیے جو طریقے قرآن عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دیئے ہیں ان میں ذرا سی کمی کوتاہی جس طرح انسان کو استقامت سے گرا دیتی ہے اسی طرح ان میں اپنی طرف سے کوئی زیادتی بھی استقامت کو برباد کر کے انسان کو بدعات میں مبتلا کر دیتی ہے، وہ بڑی نیک نیتی سے یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے رب کو راضی کر رہا ہوں اور وہ عین ناراضگی کا سبب ہوتا ہے، اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بدعات و محدثات

سے بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے، اور اس کو شدید گمراہی قرار دیا ہے، اس لیے انسان پر لازم ہے کہ جب وہ کوئی کام عبادت اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاجوئی کے لیے کرے تو کرنے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کرلے کہ یہ کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ سے اس کیفیت وصورت کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں، اگر ثابت نہیں تو اس میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہ کرے۔

اسی طرح معاملات اور اخلاق ومعاشرت کے تمام ابواب میں قرآن کریم کے بتائے ہوئے اصول پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیم کے ذریعہ ایک معتدل اور صحیح راستہ قائم کردیا ہے جس میں دوستی، دشمنی، نرمی، گرمی، غصہ اور بردباری، کنجوسی اور سخاوت، کسبِ معاش اور ترکِ دنیا، اللہ پر توکل اور امکانی تدبیر، اسبابِ ضروریہ کی فراہمی اور مسبب الاسباب پر نظر، ان سب چیزوں میں ایک ایسا معتدل صراط مستقیم مسلمانوں کو دیا ہے کہ اس کی نظیر عالم میں نہیں مل سکتی، ان کو اختیار کرنے سے ہی انسان انسان کامل بنتا ہے، اُس میں استقامت سے ذرا گرنے ہی کے نتیجہ میں معاشرہ کے اندر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ استقامت ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ دین کے تمام اجزاء وارکان اور ان پر صحیح عمل اس کی تفسیر ہے۔

سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے اسلام کے معاملہ میں کوئی ایسی جامع بات بتلا دیجئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے، آپ نے فرمایا ''قل آمنت باللّٰه ثم استقم'' یعنی اللہ پر ایمان لاؤ اور پھر اس پر مستقیم رہو۔ (رواہ مسلم، از قرطبی)

اور عثمان بن حاضر ازدیؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرمادیجئے، آپ نے فرمایا علیك بتقوی اللّٰه والاستقامة اتبع ولا تبتدع (رواہ الدارمی فی

مسندہ، از قرطبی) یعنی تم تقویٰ اور خوف خدا کو لازم پکڑو اور استقامت کو بھی جس کا طریقہ یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں شریعت کا اتباع کرو، اپنی طرف سے کوئی بدعت ایجاد نہ کرو۔

اس دنیا میں سب سے زیادہ دشوار کام استقامت ہی ہے، اسی لیے محققین صوفیاء نے فرمایا ہے کہ استقامت کا مقام کرامت سے بالاتر ہے، یعنی جو شخص دین کے کاموں میں استقامت اختیار کئے ہوئے ہے اگر چہ عمر بھر اس سے کوئی کرامت صادر نہ ہو وہ اعلیٰ درجہ کا ولی ہے۔ (معارف القرآن ۴/۶۷۰، سورہ ہود پ ۱۲)

لفظ استقامت کا جو مفہوم خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوا ہے کہ ایمان و توحید پر قائم رہے اس کو چھوڑے نہیں، یہ تفسیر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور تقریباً یہی مضمون حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے، انھوں نے استقامت کی تفسیر اخلاص عمل سے فرمائی ہے، اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

اَلاِسْتِقَامَۃُ اَنْ تَسْتَقِیْمَ عَلَی الْاَمْرِ وَالنَّھْیِ وَلَاتَروغ روغان الثعالب (مظھری)

استقامت یہ ہے کہ تم اللہ کے تمام احکام اوامر اور نواہی پر سیدھے جمے رہو، اُس سے اِدھر اُدھر راہِ فرار لومڑیوں کی طرح نہ نکالو۔

اس لئے علماء نے فرمایا کہ استقامت تو ایک لفظ مختصر ہے مگر تمام شرائع اسلامیہ کو جامع ہے جس میں تمام احکام الٰہیہ پر عمل اور تمام محرمات و مکروہات سے اجتناب دائمی طور پر شامل ہے، تفسیر کشاف میں ہے کہ اِنسان کا رَبّنَا اللہ کہنا جبھی صحیح ہوسکتا ہے جبکہ وہ دل سے یقین کرے کہ میں ہر حال اور ہر قدم میں اللہ تعالیٰ کی زیر تربیت ہوں، مجھے ایک سانس بھی اس کی رحمت کے بغیر نہیں آ سکتا اور اس کا تقاضہ یہ ہے کہ

انسان طریق عبادت پر ایسا مضبوط و مستقیم رہے کہ اس کا قلب اور قالب دونوں اس کی عبودیت سے سرِ موانحراف نہ کریں۔

اسی لئے جب رسول اللہ ﷺ سے حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے اسلام کی ایک جامع بات بتلا دیجئے جس کے بعد مجھے کسی اور سے کچھ نہ پوچھنا پڑے تو آپ نے فرمایا: **قُلْ اٰمَنْتُ بِاللہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ** (رواہ مسلم) یعنی تم اللہ پر ایمان لانے کا اقرار کرو پھر اس پر مستقیم رہو، مستقیم رہنے کی ظاہر مراد یہی ہے کہ ایمان پر بھی مضبوطی سے جمے رہو اور اس کے اقتضا کے مطابق اعمال صالحہ پر بھی۔

اسی لئے حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ نے استقامت کی تعریف ادائے فرائض سے فرمائی، اور حسن بصریؒ نے فرمایا: استقامت یہ ہے کہ تمام اعمال میں اللہ کی اطاعت کرو اور اس کی معصیت سے اجتناب کرو، اس سے معلوم ہوا کہ استقامت کی جامع تعریف وہی ہے جو اوپر حضرت فاروق اعظمؓ سے نقل کی گئی ہے، اور حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کی تعریف بھی اسی کی طرف راجع ہے جس میں اعمال صالحہ کے ساتھ اخلاص عمل کی تائید ہے (تفسیر مظہری) جصاص نے بھی مذکورہ تفسیر کو ابو العالیہ سے نقل کر کے اختیار کیا ہے اور ابن جریر نے بھی۔

(معارف القرآن ص ۶۵۱، ج ۷، سورہ حم السجدہ)

استہزاء کی تعریف

قرطبی نے فرمایا کہ کسی شخص کی تحقیر و توہین کے لئے اس کے کسی عیب کو اس طرح ذکر کرنا جس سے لوگ ہنسنے لگیں اس کو سخریہ، تمسخر، استہزاء کہا جاتا ہے، اور یہ جیسے زبان سے ہوتا ہے ایسے ہی ہاتھ پاؤں وغیرہ سے اس کی نقل اتارنے یا اشارہ

کرنے سے بھی ہوتا ہے، اور اس طرح بھی کہ اس کا کلام سن کر بطور تحقیر کے ہنسی اڑائی جائے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سخریہ وتمسخر کسی شخص کے سامنے اس کا ایسی طرح ذکر کرنا ہے کہ اس سے لوگ ہنس پڑیں، اور یہ سب چیزیں بنصِّ قرآن حرام ہیں۔ (معارف القرآن ج ۸، ص ۱۱۵، سورہ حجرات)

اسراف کی تعریف

اسراف کے معنیٰ ہیں حد سے تجاوز کرنا، پھر حد سے تجاوز کرنے کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ حلال سے تجاوز کر کے حرام تک پہونچ جائے، اور حرام چیزوں کو کھانے، پینے، برتنے لگے، اس کا حرام ہونا ظاہر ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو بلاوجہ شرعی حرام سمجھ کر چھوڑ دے، جس طرح حرام کا استعمال جرم وگناہ ہے، اسی طرح حلال کو حرام سمجھنا بھی قانونِ الٰہی کی مخالفت اور سخت گناہ ہے۔ (ابن کثیر، مظہری، روح المعانی)

اسی طرح یہ بھی اسراف ہے کہ بھوک اور ضرورت سے زیادہ کھائے، پیئے، اسی لئے فقہاء نے پیٹ بھرنے سے زائد کھانے کو ناجائز لکھا ہے، (احکام القرآن وغیرہ) اسی طرح یہ اسراف کے حکم میں ہے کہ باوجود قدرت واختیار کے ضرورت سے اتنا کم کھائے جس سے کمزور ہو کر ادائے واجبات کی قدرت نہ رہے، ان دونوں قسم کے اسراف کو منع کرنے کے لئے، قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ.

ترجمہ: فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَاماً.

ترجمہ: اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو خرچ کرنے میں توسط اور میانہ روی رکھتے ہیں، نہ حدِ ضرورت سے زیادہ خرچ کریں اور نہ اس سے کم خرچ کریں۔

(معارف القرآن ج۳/ ۵۴۵، اعراف: پ۸)

اسراف وتبذیر اور فضول خرچی کی تعریف

فضول خرچی کے معنی کو قرآن حکیم نے دو لفظوں سے تعبیر فرمایا ہے ایک تبذیر اور دوسرے اسراف، تبذیر کی ممانعت تو اسی آیت مذکورہ میں واضح ہے، اسراف کی ممانعت آیت ''ولا تسرفوا'' سے ثابت ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں، کسی معصیت میں یا بے موقع، بے محل خرچ کرنے کو تبذیر واسراف کہا جاتا ہے، اور بعض حضرات نے یہ تفصیل کی ہے کہ کسی گناہ میں یا بالکل بے موقع بے محل خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں، اور جہاں خرچ کرنے کا جائز موقع تو ہو مگر ضرورت سے زائد خرچ کیا جائے اس کو اسراف کہتے ہیں اس لیے تبذیر بہ نسبت اسراف کے اشد ہے مبذّرین کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔

امام تفسیر حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی اپنا سارا مال حق کے لیے خرچ کردے تو وہ تبذیر نہیں اور اگر باطل کے لیے ایک مُد (آدھ سیر) بھی خرچ کرے تو وہ تبذیر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ غیر حق میں بے موقع خرچ کرنے کا نام تبذیر ہے۔ (مظہری)

امام مالکؒ نے فرمایا کہ تبذیر یہ ہے کہ انسان مال کو حاصل تو حق کے مطابق کرے مگر خلافِ حق خرچ کرڈالے، اور اس کا نام اسراف بھی ہے، اور یہ حرام ہے۔

(قرطبی)

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ حرام و ناجائز کام میں تو ایک درہم خرچ کرنا بھی تبذیر ہے اور جائز ومباح خواہشات میں حد سے زیادہ خرچ کرنا جس سے آئندہ محتاج،

فقیر ہوجانے کا خطرہ ہوجائے یہ بھی تبذیر میں داخل ہے، ہاں اگر کوئی شخص اصل راس المال کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کے منافع کو اپنی جائز خواہشات میں وسعت کے ساتھ خرچ کرتا ہے تو وہ تبذیر میں داخل نہیں۔ (قرطبی ۲۴۸/۱۰)

(معارف القرآن ۴۵۸/۵، سورہ بنی اسرائیل پ ۱۵)

اسرائیل کی تعریف

''اسرائیل'' عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنیٰ عبداللہ ہیں، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔ (معارف القرآن سورہ بقرہ پ ۱-۲۰۵/۱)

اسلام کی تعریف

اسلام کے لفظی معنیٰ اطاعت وفرمانبرداری کے ہیں، اور اصطلاح میں خاص اس دین کی اطاعت کا نام اسلام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے کیونکہ اصول دین تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں ایک ہی ہیں۔

پھر لفظ اسلام کبھی تو اس عام مفہوم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی صرف اس آخری شریعت کے لئے بولا جاتا ہے، جو خاتم الانبیاء ﷺ پر نازل ہوئی، قرآن کریم میں یہ دونوں طرح کے اطلاقات موجود ہیں، انبیاء سابقین کا اپنے آپ کو مسلم کہنا اور اپنی امت کو امت مسلمہ کہنا بھی نصوص قرآن سے ثابت ہے، اور اس نام کا خاتم الانبیاء کی امت کے ساتھ مخصوص ہونا بھی مذکور ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر دین الٰہی جو کسی نبی ورسول کے ذریعہ دنیا میں آیا ہے، اس کو بھی اسلام کہا جاتا ہے، اور امتِ محمدیہ کے لئے یہ خاص لقب کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ (معارف القرآن ص ۱۰۳، ج ۲، سورہ آل عمران)

اسلام نام ہے اس مکمل نظام حیات کا جو قرآن وسنت میں بیان ہوا ہے، خواہ اس کا تعلق عقائد وعبادات سے ہو، یا معاملات ومعاشرت سے، حکومت وسیاست سے اس کا تعلق ہو، یا تجارت وصنعت وغیرہ سے۔

(معارف القرآن سورہ بقرہ پ۱-۱/۴۹۹)

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری کا اقرار بشرطیکہ اس کے ساتھ ایمان یعنی تصدیق قلبی موجود ہو۔ (ایمان وکفر، جواہر الفقہ ۱/۵)

اسلام اور ایمان کا باہمی فرق

اصطلاحی ایمان اور اصطلاحی اسلام اگرچہ مفہوم ومعنیٰ کے اعتبار سے الگ الگ ہیں کہ ایمان اصطلاح شرع میں تصدیق قلبی کا نام ہے یعنی اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول کی رسالت کو سچا ماننا، اور اسلام نام ہے اعمال ظاہرہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کا، لیکن شریعت میں تصدیق قلبی اس وقت تک قابلِ اعتبار نہیں جب تک اس کا اثر جوارح کے اعمال وافعال تک نہ پہنچ جائے جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ زبان سے کلمۂ اسلام کا اقرار کرے۔

اسی طرح اسلام اگرچہ اعمالِ ظاہرہ کا نام ہے لیکن شریعت میں وہ اس وقت تک معتبر نہیں جب تک کہ دل میں تصدیق نہ آجائے ورنہ وہ نفاق ہے۔

اس طرح اسلام وایمان مبدأ ومنتہیٰ کے اعتبار سے تو الگ الگ ہیں کہ ایمان باطن اور قلب سے شروع ہوکر ظاہر اعمال تک پہنچتا ہے اور اسلام افعال ظاہرہ سے شروع ہوکر باطن کی تصدیق تک پہنچتا ہے مگر مصداق کے اعتبار سے ان دونوں میں تلازم ہے کہ ایمان اسلام کے بغیر معتبر نہیں، اور اسلام ایمان کے بغیر شرعاً معتبر نہیں، شریعت میں یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص مسلم تو ہو مومن نہ ہو، یا مومن ہو مسلم نہ ہو، مگر یہ کلام اصطلاحی ایمان واسلام میں ہے، لغوی معنیٰ کے اعتبار سے ہوسکتا ہے کہ ایک

شخص مسلم ہو مومن نہ ہو جیسے تمام منافقین کا یہی حال تھا، کہ ظاہری اطاعتِ احکام کی بناء پر مسلم کہلاتے تھے مگر دل میں ایمان نہ ہونے کے سبب مومن نہ تھے۔

(معارف القرآن ۱۲۹، ج ۸، سورہ حجرات)

اسماء حسنیٰ کے معنی

اچھے نام سے مراد وہ نام ہیں جو صفات کمال کے اعلیٰ درجہ پر دلالت کرنے والے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کسی کمال کا اعلیٰ درجہ جس سے اوپر کوئی درجہ نہ ہو سکے، وہ صرف خالق کائنات جل وعلا شانہ ہی کو حاصل ہے، اس کے سوا کسی مخلوق کو یہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ ہر کامل سے دوسرا شخص اکمل اور فاضل سے افضل ہوسکتا ہے، فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْم۔ کا یہی مطلب ہے کہ ہر ذی علم سے بڑھ کر کوئی دوسرا علیم ہوسکتا ہے۔ اسی لیے اس آیت میں ایسی عبارت اختیار کی گئی جس سے معلوم ہو کہ یہ اسماء حسنیٰ صرف اللہ ہی کی خصوصیت ہے، دوسروں کو حاصل نہیں، فَادْعُوْهُ بِهَا، یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اسماء حسنیٰ ہیں، اور وہ اسماء اسی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو پکارو، اور انہی اسماء حسنیٰ کے ساتھ پکارو۔

اشدّ، بالغ اور جوان کی تعریف

لفظ اشد کے اصلی معنیٰ قوت کے ہیں، اور اس کی ابتداء جمہور علماء کے نزدیک بالغ ہوجانے سے ہوتی ہے، جس وقت بچہ میں آثار بلوغ پائے جائیں، یا اس کی عمر پندرہ سال پوری ہو جائے، اس وقت اس کو شرعاً بالغ قرار دیا جائے گا۔

(معارف القرآن ج ۳/ ۴۸۷، انعام: پ ۸)

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰی، اشد کے لفظی معنیٰ قوت وشدت کی انتہاء پر پہنچنا ہے، یعنی انسان بچپن کے ضعف سے تدریجاً قوت وشدت کی طرف بڑھتا ہے، ایک

وقت ایسا آتا ہے کہ اس کے وجود میں جتنی قوت وشدت آسکتی تھی وہ پوری ہوجائے، اس وقت کو اشد کہا جاتا ہے، اور یہ زمین کے مختلف خطوں اور قوموں کے مزاج کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے، کسی کا اشدّ کا زمانہ جلد آجاتا ہے، کسی کا دیر میں، لیکن حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ سے براویت عبد بن حمید یہ منقول ہے کہ اشد عمر کے تینتیس سال میں ہوتا ہے، اسی کو سن کمال، یا سن وقوف کہا جاتا ہے، جس میں بدن کا نشو ونما ایک حد پر پہنچ کر رک جاتا ہے، اس کے بعد چالیس کی عمر تک وقوف کا زمانہ ہے اسی کو استویٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، چالیس سال کے بعد انحطاط اور کمزوری شروع ہوجاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عمر کا اشد تینتیس سال کی عمر سے شروع ہوکر چالیس سال تک رہتا ہے، (روح، قرطبی)۔

(معارف القرآن ج۶/۶۲۲)

اشہر حرم

وَلاَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ (مائدہ پ۶) یعنی شہر حرام میں قتل وقتال کر کے اس کی بے حرمتی نہ کرو، اشہر حرم وہ چار مہینے ہیں جن میں باہمی جنگ کرنا شرعاً حرام تھا، شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ، اور رجب۔ (معارف القرآن ۳/۸۱، سورہ مائدہ)

عہد قدیم سے تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں میں سال کے بارہ مہینے مانے جاتے تھے اور ان میں سے چار مہینے بڑے متبرک اور ادب واحترام کے مہینے سمجھے جاتے تھے۔ تین مہینے مسلسل ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، اور ایک رجب کا، تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں اس پر متفق ہیں کہ ان چار مہینوں میں ہر عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے اور ان میں کوئی گناہ کرے تو اس کا وبال اور عذاب بھی زیادہ ہے، سابق شریعتوں میں ان مہینوں کے اندر قتل وقتال بھی ممنوع تھا۔

(معارف القرآن ۴/۳۷۰، سورہ توبہ پ۱۰)

اشہر حج وایام تشریق

اشہر حج: (حج کے مہینے) شوال، ذوالقعدہ کامل، ذی الحجہ کا نصف ماہ۔

ایام تشریق: نویں ذی الحجہ سے تیرہ ذی الحجہ تک جن ایام میں تکبیر تشریق پڑھی جاتی ہے۔ (احکام حج ص:۸)

ایام معلومات سے مراد وہی دن ہیں جن میں قربانی جائز ہے، یعنی ذی الحجہ کی دسویں، گیارھویں، بارھویں تاریخیں۔

(معارف القرآن ۶/۲۵۸، سورہ حج پ ۱۷)

اصحاب الرسّ وحضر موت کی تعریف

لفظ رسّ عربی زبان میں مختلف معنیٰ کے لئے آتا ہے، مشہور معنیٰ یہ ہے کہ کچے کنویں کو رسّ کہا جاتا ہے، جو اینٹ پتھر وغیرہ سے پختہ نہ کیا گیا ہو، اصحاب الرسّ سے مراد قوم ثمود کے باقی ماندہ لوگ ہیں جو عذاب کے بعد باقی رہے۔

ضحاک وغیرہ مفسرین نے ان کا قصہ یہ لکھا ہے کہ جب حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود پر عذاب آیا تو ان میں سے چار ہزار آدمی جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے وہ عذاب سے محفوظ رہے یہ لوگ اپنے مقام سے منتقل ہوکر ''حضر موت'' میں جا کر مقیم ہوگئے، حضرت صالح علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے، ایک کنویں پر جا کر یہ لوگ ٹھہر گئے، اور حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہوگئی، اسی لئے اس جگہ کا نام حَضَر موت (یعنی موت حاضر ہوگئی) ہے، یہ لوگ یہیں رہ پڑے، پھر ان کی نسل میں بت پرستی شروع ہوگئی، ان کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے ایک نبی کو بھیجا جس کو انہوں نے قتل کر ڈالا، ان پر خدا تعالیٰ کا عذاب آیا۔

(معارف القرآن ص ۱۳۵، ج ۸، سورہ ق)

اصلاح وفساد اور مصلح ومفسد کی تعریف

وَاِذَاقِیْلَ لَھُمْ لَاتُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (بقرہ)

آیات مذکورہ میں گذر چکا ہے کہ جب کوئی ان منافقین سے یہ کہتا کہ اپنے نفاق کے ذریعہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ بڑے زور اور تاکید سے کہتے تھے اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ، اس میں لفظ انما جو حصر وانحصار کے لیے بولا جاتا ہے اس کی وجہ سے معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ ہم مصلح ہی ہیں، یعنی ہمارے کسی عمل کا فساد سے کوئی واسطہ نہیں، مگر قرآن کریم نے ان کے جواب میں فرمایا اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَا یَشْعُرُوْنَ یعنی یاد رکھو کہ یہی لوگ مفسد ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔

اس میں دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ منافقین کی حرکات حقیقۃً زمین میں فتنہ وفساد پھیلنے کا سبب تھیں، دوسری بات یہ کہ منافقین فتنہ وفساد پھیلانے کی نیت اور قصد سے یہ کام نہ کرتے تھے، بلکہ ان کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا نتیجہ فتنہ وفساد ہے، جیسا کہ قرآن کی تصریح وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ زمین میں فتنہ وفساد جن چیزوں سے پھیلتا ہے ان میں کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو ہر شخص فتنہ وفساد سمجھتا ہے، جیسے قتل، غارتگری، چوری، دھوکہ، فریب، اغواء، بدکاری وغیرہ ہر سمجھ دار آدمی ان کو شر وفساد سمجھتا ہے، اور ہر شریف آدمی اس سے بچتا ہے، اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی ظاہری سطح کے اعتبار سے کوئی فتنہ وفساد نہیں ہوتیں مگر ان کی وجہ سے انسانوں کے اخلاق برباد ہوتے ہیں، اور انسانوں کی اخلاقی گراوٹ سارے فتنوں اور فسادوں کے دروازے کھول دیتی ہے، ان منافقین کا بھی یہی حال تھا کہ چوری، ڈاکہ، بدکاری وغیرہ سے بچتے تھے، اسی لیے بڑی زور سے اپنے مفسد ہونے کا انکار اور مصلح ہونے کا اثبات کیا۔

مگر نفاق اور کینہ وحسد اور اس کے ماتحت دشمنوں سے سازشیں یہ چیزیں انسان

کے اخلاق کو ایسا تباہ کر دیتی ہیں کہ انسان بہت سے حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے آ جاتا ہے اور ایسے کام کرنے پر اتر آتا ہے جو کبھی کسی بھلے مانس سے متصور نہیں ہوتے، اور جب انسان اپنے انسانی اخلاق کھو بیٹھا تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد ہی فساد آ جاتا ہے، فساد بھی ایسا عظیم جو نہ درندے جانوروں سے متوقع ہے نہ ڈاکوؤں اور چوروں سے، کیونکہ ان کے فساد کو قانون اور حکومت کی طاقت سے روکا جا سکتا ہے، مگر قانون تو انسان ہی جاری کرتے ہیں، جب انسان انسان نہ رہا تو قانون کی جو گت بنے گی اس کا تماشا آج کھلی آنکھوں ہر شخص ہر محکمہ اور ہر ادارہ میں دیکھتا ہے، آج دنیا کا تمدن ترقی پذیر ہے، تعلیم و تعلم کے اداروں کا جال گاؤں گاؤں تک پھیلا ہوا ہے، تہذیب کے الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں، قانون سازی کی مجلسوں کا بازار گرم ہے، تنفیذ قانون کے لیے بے شمار ادارے اربوں روپئے کے خرچ سے قائم ہیں، دفتری انتظامات کی بھول بھلیاں ہے، مگر جرائم اور فتنے فساد روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں، وجہ اس کے سوا نہیں کہ کوئی قانون خود کار مشین نہیں ہوتا، بلکہ اس کو انسان چلاتے ہیں، جب انسان اپنی انسانیت کھو بیٹھا تو پھر اس فساد کا علاج نہ قانون سے ہو سکتا ہے نہ حکومت اور محکموں کے چکر سے، اسی لیے انسانیت کے عظیم ترین محسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز فرمائی ہے کہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنا دیں تو پھر فساد جرائم خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، نہ پولیس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے نہ عدالتوں کے اس پھیلاؤ کی جو دنیا میں پایا جاتا ہے، اور جب تک دنیا کے جس حصہ میں آپ کی تعلیمات و ہدایات پر عمل ہوتا رہا دنیا نے وہ امن و امان دیکھا جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ ان تعلیمات کو چھوڑنے کے بعد متوقع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کی رُوح ہے اللہ تعالیٰ کا خوف اور قیامت کے حساب و کتاب کی فکر، اس کے بغیر کوئی قانون و دستور اور کوئی محکمہ اور کوئی

مدرسہ اور یونیورسٹی انسان کو جرائم سے باز رکھنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔

آج کی دنیا میں جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار کی باگ ہے وہ جرائم کے انسداد کے لیے نئے سے نئے انتظام کو تو سوچتے ہیں، مگر اس روح انتظام یعنی خوفِ خدا سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اس کو فنا کرنے کے اسباب مہیا کرتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ یہی سامنے آتا رہتا ہے کہ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کھلے طور پر فساد مچانے والے چوروں، غارت گروں کا علاج سہل ہے مگر ان انسانیت فراموش انسانوں کا فساد ہمیشہ برنگ اصلاح ہوتا ہے وہ کوئی دلچسپ دلفریب اصلاحی اسکیم بھی سامنے رکھ لیتے ہیں، اور خالص ذاتی اغراض فائدہ کو اصلاح کا رنگ دے کر **اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْن** کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، اسی لیے حق تعالیٰ سبحانہ نے جہاں فساد سے روکا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا **وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ** یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون؟

جس میں اشارہ فرمایا کہ فساد وصلاح کی اصل حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں جو دلوں کے حال اور نیتوں سے بھی واقف ہیں، اور ہر عمل کے خواص ونتائج کو بھی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ صلاح ہوگا یا فساد، اس لیے اصلاح کے لیے صرف نیت اصلاح کافی نہیں، بلکہ عمل کا رُخ بھی شریعت کے مطابق صحیح ہونا ضروری ہے، بعض اوقات کوئی عمل پوری نیک نیتی اور اصلاح کے قصد سے کیا جاتا ہے مگر اس کا اثر فساد وفتنہ ہوتا ہے۔ (معارف القرآن ۱۲۹/۱، ۱۳۰، سورۂ بقرہ)

اعتدال کے معنی

اعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے مشتق ہے اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔ (معارف القرآن ۳۶۶/۱، سورہ بقرہ پ ۲)

اعتکاف کی تعریف

اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن وسنت میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے۔

(معارف القرآن، سورہ بقرہ ۱/۴۵۶، پ۲)

اعراف کی تعریف اور اہل اعراف کا مصداق

جنت و دوزخ والوں کے باہمی مکالمات کے ضمن میں ایک اور بات تیسری آیت میں یہ بتلائی گئی کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو جہنم سے تو نجات پا گئے مگر ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے، البتہ اس کے امیدوار ہیں کہ وہ بھی جنت میں داخل ہوجائیں، ان لوگوں کو اہل اعراف کہا جاتا ہے۔

اعراف کیا چیز ہے: اس کی تشریح سورہ حدید کی آیات سے ہوتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے۔

ایک کھلے کافر ومشرک ان کو تو پل صراط پر چلنے کی نوبت ہی نہ آئے گی، پہلے ہی جہنم کے دروازوں سے اس میں ڈھکیل دیئے جائیں گے۔

دوسرے مؤمنین جن کے ساتھ نور ایمان کی روشنی ہوگی۔

تیسرے منافقین، یہ چونکہ دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ لگے رہے وہاں بھی شروع میں ساتھ لگے رہیں گے اور پل صراط پر چلنا شروع ہوں گے، اس وقت ایک سخت اندھیری سب کو ڈھانپ لے گی، مومنین اپنے نور ایمان کی مدد سے آگے بڑھ جائیں گے، اور منافقین پکار کر ان کو کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھائیں، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کہنے والا کہے گا کہ پیچھے لوٹو وہاں روشنی تلاش کرو، مطلب یہ ہوگا کہ یہ روشنی ایمان اور عمل صالح کی ہے، جس کے

حاصل کرنے کا مقام پیچھے گذر گیا، جن لوگوں نے وہاں ایمان و عمل کے ذریعہ یہ روشنی حاصل نہیں کی، ان کو آج روشنی کا فائدہ نہیں ملے گا، اسی حالت میں منافقین اور مؤمنین کے درمیان ایک دیوار کا حصار حائل کر دیا جائے گا، جس میں ایک دروازہ ہوگا اس دروازہ کے باہر تو سارا عذاب ہی عذاب نظر آئے گا اور دروازہ کے اندر جہاں مؤمنین ہوں گے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مشاہدہ اور جنت کی فضا سامنے ہوگی، یہی مضمون اس آیت کا ہے:

"**يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَآئَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ**"۔

اس آیت میں وہ حصار جو اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان حائل کیا جائے گا اس کو لفظ سُور سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہ لفظ دراصل شہر پناہ کے لیے بولا جاتا ہے، جو بڑے شہروں کے گرد غنیم سے حفاظت کے لیے بڑی مضبوط، مستحکم چوڑی دیوار سے بنائی جاتی ہے، ایسی دیواروں میں فوج کے حفاظتی دستوں کی کمین گاہیں بھی بنی ہوتی ہیں جو حملہ آوروں سے باخبر رہتے ہیں۔

سورۂ اعراف کی آیت مذکورہ میں ہے: "**وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ**" ابن جریر اور دوسرے ائمہ تفسیر کی تحریر کے مطابق اس آیت میں لفظ حجاب سے وہی حصار مراد ہے جس کو سورۂ حدید کی آیت میں لفظ سور سے تعبیر کیا گیا ہے، اس حصار کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے، کیونکہ اعراف عرف کی جمع ہے، اور عرف ہر چیز کے اوپر والے حصہ کو کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ دُور سے معروف و ممتاز ہوتا ہے، اس تشریح سے معلوم ہوا کہ جنت و دوزخ کے درمیان حائل ہونے والے حصار کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے، اور آیت

اعراف میں یہ بتلایا گیا ہے کہ محشر میں اس مقام پر کچھ لوگ ہوں گے جو جنت و دوزخ دونوں طرح کے حالات کو دیکھ رہے ہوں گے، اور دونوں طرف رہنے والوں سے مکالمات اور سوال و جواب کریں گے۔

اب یہ بات کہ یہ کون لوگ ہوں گے، اور اس درمیانی مقام میں ان کو کیوں روکا جائے گا، اس میں مفسرین کے اقوال مختلف اور روایات حدیث متعدد ہیں، لیکن صحیح اور راجح جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے حسنات اور سیئات کے دونوں پلے میزان عمل میں برابر ہو جائیں گے، اپنے حسنات کے سبب جہنم سے تو نجات پالیں گے، لیکن سیئات اور گناہوں کے سبب ابھی جنت میں ان کا داخلہ نہ ہوا ہوگا، اور بالآخر رحمتِ خداوندی سے یہ لوگ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

صحابہ کرام میں سے حضرت حذیفہ، ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم کا اور دوسرے صحابہ و تابعین کا یہی قول ہے، اور اس میں تمام روایات حدیث بھی جمع ہو جاتی ہیں، جو مختلف عنوانات سے منقول ہیں، امام ابن جریر نے بروایت حذیفہؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل اعراف کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی، اس لیے جہنم سے تو نجات ہوگئی، مگر جنت میں ابھی داخل نہیں ہوئے، ان کو اس مقام اعراف پر روک لیا گیا، یہاں تک کہ تمام اہل جنت اور اہل دوزخ کا حساب اور فیصلہ ہو جانے کے بعد ان کا فیصلہ کیا جائے گا، اور بالآخر ان کی مغفرت ہو جائے گی، اور جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ (ابن کثیر)

اور ابن مردویہ نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اہل اعراف کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے والدین کی مرضی اور اجازت کے خلاف جہاد میں شریک ہو گئے،

اور اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے، تو ان کو جنت کے داخلہ سے ماں باپ کی نافرمانی نے روک دیا، اور جہنم کے داخلہ سے شہادت فی سبیل اللہ نے روک دیا۔

اس حدیث اور پہلی حدیث میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ یہ حدیث ایک مثال ہے ان لوگوں کی جن کی نیکیاں اور گناہ برابر درجہ کے ہوں کہ ایک طرف شہادت فی سبیل اللہ اور دوسری طرف ماں باپ کی نافرمانی، دونوں پلے برابر ہو گئے۔

(کذا قالہ ابن کثیر، معارف القرآن ۳/۵۶۷، سورہ اعراف پ ۸)

افراط وتفریط کی تعریف

افراط کے معنی حد سے آگے بڑھنے کے ہیں، اور تفریط کے معنی ہیں فرض کی ادائیگی میں کوتاہی اور کمی کرنے کے، انبیاء ورسل کے معاملہ میں بنی اسرائیل کے یہ دو متضاد عمل کہ یا تو ان کو جھوٹا کہیں اور قتل تک سے دریغ نہ کریں، اور یا یہ زیادتی کہ ان کو خود ہی خدا یا خدا کا بیٹا قرار دے دیں، یہ وہی افراط وتفریط ہے جو جہالت کے لوازم سے ہے، عرب کا مشہور مقولہ ''اَلْجَاهِلُ اِمّامُفرِطٌ أو مُفَرِّطٌ'' یعنی جاہل آدمی کبھی اعتدال اور میانہ روی پر نہیں رہتا، بلکہ یا افراط میں مبتلا ہوتا ہے یا تفریط میں۔

(معارف القرآن سورہ مائدہ ۳/۲۱۱)

افک کی تعریف

''افک'' کے اصلی لغوی معنیٰ پلٹ دینے اور بدل دینے کے ہیں، بدترین قسم کا جھوٹ جو حق کو باطل سے اور باطل کو حق سے بدل دے، پاکباز متقی کو فاسق، فاسق کو متقی پرہیزگار بنادے، اس جھوٹ کو بھی افک کہتے ہیں، قرآن کریم میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کی براءت اور پاکی کے بیان میں اس جگہ (سورہ نور میں) دس آیتیں نازل فرمائیں جن میں حضرت صدیقہؓ کی براءت ونزاہت کا اعلان اور ان کے معاملے میں جن لوگوں نے افتراء وبہتان میں کسی طرح کا حصہ لیا تھا ان سب کو تنبیہ

اور دنیا وآخرت میں ان کے وبال کا بیان ہے، یہ بہتان بندی کا واقعہ قرآن وحدیث میں واقعۂ افک کے نام سے مشہور رہے، افک کہتے ہیں بدترین قسم کے جھوٹ وافتراء وبہتان کو۔ (معارف القرآن سورہ نور پ ۱۸-۶/۳۶۴، ۳۷۵)

اقامتِ صلاۃ کی تعریف

اقامتِ صلوٰۃ کے معنیٰ نماز کو اس کے پورے آداب وشرائط اور خشوع کے ساتھ ادا کرنا ہے، محض نماز پڑھنا نہیں، اسی لئے قرآن کریم میں عموماً نماز کا حکم اقامت صلوٰۃ کے لفظ سے دیا گیا ہے۔ (معارف القرآن ج ۵، ص ۱۹۲ سورہ رعد)

یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃ.(پ۱، بقرہ)

اقامت کے معنی محض نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے درست کرنے کا نام اقامت ہے، جس میں نماز کے تمام فرائض واجبات مستحبات اور پھر ان پر دوام والتزام، یہ سب اقامت کے مفہوم میں داخل ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ اس جگہ نماز سے کوئی خاص نماز مراد نہیں بلکہ فرائض وواجبات اور نفلی نمازوں کو یہ لفظ شامل ہے، خلاصہ مضمون یہ ہوا کہ وہ لوگ جو نمازوں کی پابندی بھی قواعد شرعیہ کے مطابق کرتے ہیں اور ان کے پورے آداب بھی بجالاتے ہیں۔

(معارف القرآن ۱/۵۶، سورۂ بقرہ پ ۱)

اکراہ کی تعریف

اکراہ کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو ایسے قول یا فعل پر مجبور کیا جائے جس کے کہنے یا کرنے پر وہ راضی نہیں، پھر اس کے دو درجے ہیں، ایک درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ دل سے تو اس پر آمادہ نہیں مگر ایسا بے اختیار و بے قابو بھی نہیں کہ انکار نہ کر سکے، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ غیر ملجی کہلاتا ہے، ایسے اکراہ سے کوئی کلمۂ کفر کہنا یا کسی

حرام فعل کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا، البتہ بعض جزئی احکام میں اس پر بھی کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں، جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔

دوسرا درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ مسلوب الاختیار کردیا جائے کہ اگر وہ اکراہ کرنے والوں کے کہنے پر عمل نہ کرے تو اس کو قتل کردیا جائے گا، یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا۔ یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ ملجی کہلاتا ہے، جس کے معنی ہیں ایسا اکراہ جو انسان کو مسلوب الاختیار اور مجبور محض کردے، ایسے اکراہ کی حالت میں کلمۂ کفر کا زبان سے کہہ دینا بشرطیکہ قلب ایمان پر مطمئن ہو جائز ہے، اسی طرح دوسرے انسان کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی حرام فعل کرنے پر مجبور کردیا جائے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

مگر دونوں قسم کے اکراہ میں شرط یہ ہے کہ اکراہ کرنے والا جس کام کی دھمکی دے رہا ہے، وہ اس پر قادر بھی ہو، اور جو شخص مبتلا ہے اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں اس کی بات نہ مانوں گا تو جس چیز کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس کو ضرور کر ڈالے گا۔

(مظہری، معارف القرآن ۳۰۵/۵، سورہ نحل پ۱۴)

اکمال دین کی تعریف

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (مائدہ پ۶)

اکمال دین کے معنی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ آج دین حق کے تمام حدود و فرائض اور احکام و آداب مکمل کردیئے گئے ہیں، اب اس میں نہ کسی اضافہ اور زیادتی کی ضرورت باقی ہے اور نہ کمی کا احتمال۔ (روح)

یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد احکامِ اسلام میں سے کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا، جو چند آیتیں اس کے بعد نازل ہوئیں، ان میں یا تو ترغیب و ترہیب کے مضامین ہیں، اور یا انہی احکام کی تاکید جن کا بیان پہلے ہو چکا تھا۔

اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ اصول واجتہاد کے ماتحت ائمہ مجتہدین نئے نئے پیش آنے والے واقعات وحالات کے متعلق اپنے اجتہاد سے احکام شرعیہ بیان کریں، کیونکہ قرآن کریم نے جس طرح احکام شرعیہ کے حدود وفرائض وغیرہ بیان فرمائے ہیں اسی طرح اصول اجتہاد بھی قرآن ہی نے متعین فرما دیئے ہیں۔ ان کے ذریعہ جو احکام قیامت تک نکالے جائیں وہ سب ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کیے ہوئے احکام ہیں، کیونکہ ان اصول کے ماتحت ہیں جو قرآن نے بیان کئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اکمال دین کا مطلب: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ دین کے تمام احکام کو مکمل کر دیا گیا، اب نہ اس میں کسی زیادتی کی ضرورت باقی ہے نہ منسوخ ہو کر کمی کا احتمال، کیونکہ اس کے بعد ہی متصل سلسلہ وحی وفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منقطع ہونے والا تھا، اور بغیر وحی الٰہی کے قرآن کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا، اور جو بظاہر زیادتی احکام کی اصول اجتہاد کے تحت فقہاء ومجتہدین کی طرف سے ہوئی، وہ درحقیقت زیادتی نہیں بلکہ احکام قرآنی کی توضیح وبیان ہے۔ (معارف القرآن ص:۳۶ ج ۳ مائدہ پ ۶)

الحاد کے معنی اور اس کی مختلف صورتیں

الحاد کے معنی لغت میں میلان اور درمیانی راہ سے ہٹ جانے کے آتے ہیں، اسی لیے قبر کی لحد کو لحد کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ درمیان سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے، قرآن کریم میں لفظ الحاد قرآن کریم کے صحیح معانی کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر کی تاویل وتحریف کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ آپ ایسے لوگوں سے تعلق بھی چھوڑ دیں، جو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں الحاد یعنی تحریف اور کجروی سے کام لیتے ہیں۔ (معارف القرآن ۴/۱۳۱، سورہ اعراف پ ۹)

الحاد وزندقہ کی تعریف اوراس کا حکم

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اٰیَاتِنَا (سورۂ حم السجدہ پ۲۴)

اس سے پہلی آیات میں ان منکرین توحید ورسالت کو زجر وتنبیہ اوران کے عذاب کا ذکر تھا جو رسالت وتوحید کا کھل کر صاف انکار کرتے تھے، یہاں سے انکار کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جاتا ہے جس کا نام الحاد ہے۔ لحد اور الحاد کے لغوی معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں، قبر کی لحد کو بھی اسی لیے لحد کہتے ہیں، کہ وہ ایک طرف مائل ہوتی ہے۔

قرآن وحدیث کی اصطلاح میں آیات قرآنی سے عدول وانحراف کو الحاد کہتے ہیں۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو یہ عام ہے صراحۃً کھلے طور پر انکار وانحراف کرے یا تاویلات فاسدہ کے بہانہ سے انحراف کرے۔ لیکن عام طور سے الحاد ایسے انحراف کو کہتے ہیں کہ ظاہر میں تو قرآن اوراس کی آیات پر ایمان وتصدیق کا دعویٰ کرے مگر ان کے معانی اپنی طرف سے ایسے گھڑے جو قرآن وسنت کی نصوص اور جمہور امت کے خلاف ہوں اور جس سے قرآن کا مقصد ہی الٹ جائے۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں الحاد کے معنی یہی منقول ہیں فرمایا:

''**الالحاد هو وضع الکلام علی غیر موضعه**'' اورآیت مذکورہ میں ارشاد **لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا** بھی اس کا قرینہ ہے کہ الحاد کوئی ایسا کفر ہے جس کو یہ لوگ چھپانا چاہتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہم سے اپنا کفر نہیں چھپا سکتے۔

اورآیت مذکورہ نے صراحۃً یہ بتلا دیا کہ آیاتِ قرآنی سے انکار وانحراف صاف اور کھلے لفظوں میں ہو یا معانی میں تاویلاتِ باطلہ کر کے قرآن کے احکام کو بدلنے کی فکر کرے یہ سب کفر وضلال ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الحاد ایک قسم کا کفر نفاق ہے کہ ظاہر میں قرآن اور آیات

قرآن کو ماننے کا دعویٰ اور اقرار کرے، لیکن آیات قرآنی کے معانی ایسے گھڑے جو دوسری نصوص قرآن وسنت اور اصول اسلام کے منافی ہوں۔ امام یوسفؒ نے کتاب الخراج میں فرمایا:

کذلک الزنادقة الذین یلحدون وقد کانوا یظھرون الاسلام۔

ایسے ہی وہ زندیق لوگ ہیں جو الحاد کرتے ہیں اور بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ملحد اور زندیق دونوں ہم معنی ہیں، ایسے کافر کو کہا جاتا ہے جو ظاہر میں اسلام کا دعویٰ کرے، اور حقیقت میں اس کے احکام کی تعمیل سے انحراف کا یہ بہانہ بنائے کہ قرآن کے معانی ہی ایسے گھڑے جو خلاف نصوص وخلاف اجماع امت ہوں۔

(معارف القرآن ۷/۲۶۱، سورۂ السجدہ پ۲۴)

الزامی جواب کی تعریف اور اس کی حقیقت

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (صٰٓفّٰت ص:۲۳)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے ہوں ان کو الزامی جواب دینا زیادہ مناسب ہے۔

الزامی جواب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دعوے کو خود ان ہی کے کسی دوسرے نظریئے کے ذریعہ باطل کیا جائے، اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسرا نظریہ ہمیں بھی تسلیم ہے، بلکہ بسا اوقات وہ دوسرا نظریہ بھی غلط ہوتا ہے لیکن مخالف کو سمجھانے کے لیے اس سے کام لے لیا جاتا ہے۔

(معارف القرآن ۷/۴۸۴، سورہ صٰٓفّٰت پ:۲۳)

امانت کی تعریف

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورہ احزاب، پ۲۲)

اس جگہ لفظ امانت کی تفسیر میں ائمہ تفسیر صحابہ وتابعین وغیرہم کے بہت سے اقوال منقول ہیں، فرائض شرعیہ، حفاظتِ عفت، اماناتِ اموال، غسلِ جنابت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج وغیرہ، اسی لئے جمہور مفسرین نے فرمایا ہے کہ دین کے تمام وظائف واعمال اس میں داخل ہیں۔ (قرطبی)

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ شریعت کی تمام تکلیفات امر ونہی کا مجموعہ امانت ہے، ابوحیانؒ نے بحر محیط میں فرمایا:

اَلظَّاهِرُ اَنَّهَا كُلَّ مَايُؤتَمَنُ عَلَيْهِ مِنْ اَمْرٍ وَنَهْيٍ وشأنٍ وَدِينٍ وَدُنْيا والشّرعُ كُلُّهٗ اَمَانَةٌ وهذا قول الُجمهور

یعنی ہر وہ چیز جس میں انسان پر اعتماد کیا جاتا ہے یعنی امر ونہی اور ہر حال جس کا دین یا دنیا سے تعلق ہو اور شریعت پوری کی پوری امانت ہے یہی جمہور کا قول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امانت سے مراد احکام شرعیہ کا مکلّف ومامور ہونا ہے، جن میں پورا اترنے پر جنت کی دائمی نعمتیں اور خلاف ورزی یا کوتاہی پر جہنم کا عذاب موعود ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ امانت سے مراد احکامِ الٰہیہ کا بار اٹھانے کی صلاحیت واستعداد ہے جو عقل وشعور کے خاص درجہ پر موقوف ہے اور ترقی اور استحقاقِ خلافتِ الٰہیہ اسی خاص استعداد پر موقوف ہے، جن اجناس مخلوقات میں یہ استعداد نہیں ہے وہ اپنی جگہ کتنے ہی اونچا اور اعلیٰ مقام رکھتے ہو مگر وہ اس مقام سے ترقی نہیں کر سکتے، اسی وجہ سے آسمان زمین وغیرہ میں یہاں تک کہ فرشتوں میں بھی ترقی نہیں، جس کا جو مقام قرب ہے بس وہی ہے، ان کا حال یہ ہے کہ وَمَامِنَّا اِلاَّ لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوم یعنی ہم میں سے کوئی نہیں جسکا ایک معین مقام نہ ہو۔

(معارف القرآن ۲۴۴، ج ۷، سورہ احزاب)

امانت کا وسیع مفہوم

بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز نفاق کی علامتیں بتلاتے ہوئے ایک علامت یہ بتلائی کہ جب امانت اس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے۔

اس جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن حکیم نے لفظ امانات بصیغہ جمع استعمال فرمایا جس میں اشارہ ہے کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو جس کو عام طور پر امانت کہا اور سمجھا جاتا ہے بلکہ امانت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں جو واقعہ آیت کے نزول کا ابھی ذکر کیا گیا خود اس میں بھی کوئی مالی امانت نہیں، بیت اللہ کی کنجی کوئی خاص مال نہ تھا، بلکہ یہ کنجی خدمت بیت اللہ کے ایک عہدہ کی نشانی تھی۔

حکومت کے مناصب اللہ کی امانتیں ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں، جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں عزل ونصب کے اختیارات ہیں، ان کے لیے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کردیں جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں ہے بلکہ ان پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدہ کے لیے اپنے دائرۂ حکومت میں اس کے مستحق کو تلاش کریں۔

پوری اہلیت والا سب شرائط کا جامع کوئی نہ ملے تو موجودہ لوگوں میں قابلیت اور امانت داری کے اعتبار سے جو سب سے زیادہ فائق ہو اس کو ترجیح دی جائے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی و تعلق کی مد میں بغیر اہلیت معلوم کئے ہوئے دے دیا اس پر اللہ کی لعنت ہے نہ اس کا

فرض مقبول ہے نہ نفل، یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے۔ (جمع الفوائد ص: ۳۲۵)

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے لفظ اَمٰنٰتُ بصیغۂ جمع لاکر اس کی طرف اشارہ کردیا کہ امانت صرف اسی کا نام نہیں کہ ایک شخص کا مال کسی دوسرے شخص کے پاس بطور امانت رکھا ہو، بلکہ امانت کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں حکومت کے عہدے بھی داخل ہیں۔

اور ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلْمَجَالِسُ بِالاَمَانَةِ۔ یعنی مجلسیں امانت داری کے ساتھ ہونی چاہئیں۔

مطلب یہ ہے کہ مجلس میں جو بات کہی جائے وہ اسی مجلس کی امانت ہے ان کی اجازت کے بغیر اس کو دوسروں سے نقل کرنا اور پھیلانا جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے ''اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ'' یعنی جس شخص سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اس پر لازم ہے کہ مشورہ وہی دے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو، اگر جانتے ہوئے خلاف مشورہ دے دیا تو امانت میں خیانت کا مرتکب ہوگیا، اسی طرح کسی نے آپ سے اپنا راز کہا تو وہ اس کی امانت ہے بغیر اس کی اجازت کے کسی سے کہہ دینا خیانت ہے، آیت مذکورہ میں ان سب امانتوں کا حق ادا کرنے کی تاکید ہے۔

(معارف القرآن ۴۴۸/۲، سورۂ نساء پ ۵)

''اُمّ'' کی تعریف

لفظ ''اُمّ'' کے مشہور معنیٰ والدہ اور ماں کے ہیں، اور ماں چونکہ تخلیق انسانی کی بنیاد ہے اس لئے لفظ ام اصل اور اساس کے معنیٰ میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

(معارف القرآن پ ۲۰، ص ۶۵۳ ج ۶)

4

امام اور ائمہ کی تعریف

ائمہ امام کی جمع ہے، معنیٰ یہ ہیں کہ یہ لوگ ''کفار'' اپنی عہد شکنی کی وجہ سے کفر کے امام اور قائد ہو کر اس کے مستحق ہو گئے کہ ان سے جنگ کی جائے۔

(معارف القرآن سورہ توبہ پ۱۰، ص۳۲۳ ج۴)

امت کی تعریف

''امم'' امت کی جمع ہے، جس کے معنیٰ ہیں ایک جماعت یا ایک فرقہ۔

(معارف القرآن، سورہ اعراف پ۹، ص۱۰۰ ج۴)

امر و شوریٰ کی تعریف

لفظ امر کا اطلاق عربی زبان میں کئی معنی کے لیے ہوتا ہے، ایک عام معنی میں آتا ہے جو ہر مہتم بالشان قول و فعل کو شامل ہے، دوسرا اطلاق بمعنی حکم اور حکومت ہے، جس پر قرآن کریم میں لفظ اولی الامر محمول ہے۔ تیسرا اطلاق حق تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کے لیے ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے، مثلاً اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ، اِلَيْهِ يَرْجِعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ، اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ، اَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ۔ اور محققین کے نزدیک قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ میں بھی یہی امر مراد ہے، اب قرآن کے ارشاد: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ اور وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ میں دونوں معنی کا احتمال ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ پہلے ہی معنی مراد ہیں، اور دوسرے معنی بھی اس میں شامل ہیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں، کیونکہ حکم اور حکومت کے معاملات سبھی خاص اہمیت رکھتے ہیں اس لیے امر کے معنی ان آیات میں ہر اس کام کے ہیں جو خاص اہمیت رکھتا ہو، خواہ حکومت سے متعلق ہو خواہ معاملات سے، اور لفظ شوریٰ مشورہ مشاورت کے معنی ہیں کسی قابل غور معاملہ میں لوگوں کی رائیں حاصل کرنا،

اس لیے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کے معنی یہ ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ قابل غور معاملات میں جن میں حکومت کے متعلقہ معاملات بھی شامل ہیں صحابہ کرام سے مشورہ لیا کریں، یعنی ان حضرات کی رائیں معلوم کیا کریں۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ کی آیت وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قابل غور معاملہ میں جس میں کوئی اہمیت ہو خواہ حکم و حکومت سے متعلق ہو یا دوسرے معاملات سے، ان میں سچے مسلمانوں کی عادت مستمرہ یہ ہے کہ باہم مشورہ سے کام کیا کرتے ہیں۔ (معارف القرآن ۲/۲۱۸، سورۂ آل عمران پ۴)

اُمّ الکتاب کی تعریف

اُمّ الکتاب کے لفظی معنیٰ اصل کتاب کے ہیں مراد اس سے وہ لوحِ محفوظ ہے جس میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہوسکتا۔ (معارف القرآن ۴/۱۳۶، سورۂ الرعد، پ۱۳)

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ یعنی اللہ تعالیٰ لوح محفوظ میں محو واثبات یعنی ترمیم و تبدیل کرتا رہتا ہے، اور اللہ کے پاس ہے اصل کتاب، اصل کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جس میں تقدیرِ مُبرَم لکھی ہوئی ہے، کیونکہ تقدیر معلّق میں جو شرط لکھی گئی ہے اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ شخص یہ شرط پوری کرے گا یا نہیں، اس لئے تقدیر مُبرَم میں قطعی فیصلہ لکھا جاتا ہے۔

(معارف القرآن ۸/۵۶۴، سورۂ نوح، پ۲۹)

اُمّی کی تعریف

اُمّیین اُمّی کی جمع ہے، ناخواندہ شخص کو کہا جاتا ہے، عرب کے لوگ اس لقب سے معروف ہیں، کیونکہ ان میں نوشت و خواند کا رواج نہیں تھا، بہت کم آدمی لکھے پڑھے ہوتے تھے۔ (معارف القرآن ۸/۴۳۴، سورۂ آل جمعہ، پ۲۸)

اِنذار کی تعریف

انذار کا لفظی ترجمہ ہم اردو میں ڈرانے سے کرتے ہیں مگر یہ اس کا پورا ترجمہ نہیں، اردو زبان کی تنگی کی وجہ سے کوئی ایک لفظ اس کے پورے ترجمہ کو ادا نہیں کرتا، حقیقت یہ ہے کہ ڈرانا کئی طرح کا ہوتا ہے، ایک ڈرانا دشمن، چور، ڈاکو یا کسی درندے، زہریلے جانور سے ہے، ایک ڈرانا وہ ہے جو باپ اپنی شفقت سے اولاد کو تکلیف دہ چیزوں جیسے آگ، زہریلے جانور، مضر غذا سے ڈراتا ہے جس کا منشاء شفقت ومحبت ہوتی ہے، اس کا لب ولہجہ بھی کچھ اور ہی ہوتا ہے، انذار اسی قسم کے ڈرانے کا نام ہے، اسی لیے پیغمبروں اور رسولوں کو نذیر کا لقب دیا گیا ہے، اور عالم کا یہ فریضہ انذار درحقیقت وراثتِ نبوت ہی کا جز ہے جو بنص حدیث عالم کو حاصل ہوتی ہے۔

مگر یہاں قابل غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دو لقب ہیں، بشیر اور نذیر، نذیر کے معنی تو ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں، بشیر کے معنی ہیں بشارت اور خوش خبری سنانے والا، انبیاء علیہم السلام کا ایک کام یہ بھی ہے کہ نیک عمل کرنے والوں کو بشارت سنائیں، اس جگہ بھی اگرچہ صراحۃً ذکر انذار کا کیا گیا ہے مگر دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کا فرض یہ بھی ہے کہ نیک کام کرنے والوں کو بشارت بھی سنائے، لیکن اس جگہ صرف انذار کے ذکر پر اکتفاء کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے ذمے دو کام ہیں، ایک یہ کہ جو عمل اس کے لیے دنیا وآخرت میں مفید ہیں ان کو اختیار کرے، دوسرے یہ کہ جو عمل اس کے لیے مضر ہیں ان سے بچے، باتفاق علماء وعقلاء ان دونوں کاموں میں سے دوسرا کام سب سے مقدم اور اہم ہے، اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں جلب منفعت اور دفع مضرت کے دو لفظوں سے تعبیر کر کے دفع مضرت کو جلب منفعت سے مقدم قرار دیا ہے، اس کے علاوہ دفع مضرت میں ایک حیثیت سے

جلب منفعت کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے کیونکہ جو کام انسان کے لیے مفید اور ضروری ہیں ان کا ترک بڑی مضرت ہے تو جو شخص مضرت اعمال سے بچنے کا اہتمام کرے گا وہ اعمال ضروریہ کے ترک سے بچنے کا بھی اہتمام کرے گا۔

(معارف القرآن ۴۹۱/۴، سورہ توبہ پ ۱۱)

اَنعام اور بہیمہ کا فرق

لفظ ''اَنعام'' نعم کی جمع ہے، پالتو جانور، جیسے اونٹ، گائے، بھینس، بکری وغیرہ جن کی آٹھ قسمیں سورۂ انعام میں بیان فرمائی گئی ہیں، ان کو انعام کہا جاتا ہے، بہیمہ کا لفظ عام تھا، انعام کے لفظ نے اس کو خاص کر دیا۔

(معارف القرآن ۱۳/۳، سورہ مائدہ پ ۶)

اَنفال، مالِ غنیمت اور فئ کی تعریف

اس میں لفظ انفال نفل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں فضل وانعام، نفلی نماز، روزہ، صدقہ کو بھی نفل اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کسی کے ذمہ لازم وواجب نہیں، کرنے والے اپنی خوشی سے کرتے ہیں، اصطلاح قرآن وسنت میں لفظ نفل اور انفال مالِ غنیمت کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو کفار سے بوقت جہاد حاصل ہوتا ہے مگر قرآن کریم میں اس معنی کے لیے تین لفظ استعمال ہوئے ہیں، انفال، غنیمت، فئے۔ لفظ انفال تو اسی آیت میں مذکور ہے اور لفظ غنیمت اور اس کی تفصیل اسی سورۃ کی اکتالیسویں آیت میں آنے والی ہے اور لفظ فئے اور اس کے متعلق تفصیل سورۂ حشر میں بیان ہوئی ہے۔ وَمَا اَفَاءَ اللّٰہُ الآیۃ، اوران تینوں کے معانی تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف ہیں، فرق معمولی اور قلیل ہونے کی وجہ سے بعض اوقات ایک لفظ دوسرے کی جگہ مطلقاً مالِ غنیمت کے لیے بھی استعمال کرلیا جاتا ہے۔

غنیمت عموماً اس مال کو کہتے ہیں جو جنگ و جہاد کے ذریعہ مخالف فریق سے حاصل ہو۔

اور فیئ اس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ وقتال کے کفار سے ملے، خواہ وہ چھوڑ کر بھاگ جائیں یا رضا مندی سے دے دینا قبول کریں۔

اور نفل اور انفال کا لفظ اکثر اس انعام کے لیے بولا جاتا ہے جو امیرِ جہاد کسی خاص مجاہد کو اس کی کارگزاری کے صلہ میں علاوہ حصہ غنیمت کے بطور انعام عطا کرے، یہ معنی تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیے ہیں۔ (ابن کثیر)

اور کبھی مطلقاً مال غنیمت کو بھی نفل اور انفال کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس آیت میں اکثر مفسرین نے یہی عام معنی لیے ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی عام معنی نقل کیے ہیں۔ اور حقیقت ہے کہ یہ لفظ عام اور خاص دونوں معنی کے لیے بولا جاتا ہے اس لیے کوئی اختلاف نہیں، اور اس کی بہترین تشریح و تحقیق وہ ہے جو امام ابو عبیدؒ نے اپنی کتاب الاموال میں ذکر کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: اصل لغت میں نفل کہتے ہیں فضل و انعام کو اور اس امت مرحومہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی انعام ہے کہ جہاد وقتال کے ذریعہ جو اموال کفار سے حاصل ہوں ان کو مسلمانوں کے لیے حلال کر دیا گیا، ورنہ پچھلی امتوں میں یہ دستور نہ تھا بلکہ مال غنیمت کے لیے قانون یہ تھا کہ وہ کسی کے لیے حلال نہیں تھے، تمام اموال غنیمت کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تھا، اور آسمان سے قدرتی طور پر ایک آگ (بجلی) آتی تھی اور اس کو جلا کر خاک کر دیتی تھی، یہی اس جہاد کے مقبول عنداللہ ہونے کی علامت ہوتی تھی، اور اگر کوئی مال غنیمت جمع کیا گیا اور آسمانی بجلی نے آکر اس کو نہ جلایا تو یہ علامت اس کی ہوتی تھی کہ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، اس لیے اس مال غنیمت کو بھی مردود اور منحوس سمجھا جاتا تھا، اور اسے کوئی استعمال نہ کرتا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ بخاری و مسلم میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا ہوئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر اور ان کی امت کو نہیں ملیں۔ انہیں پانچ میں سے ایک یہ ہے کہ **احلت لی الغنائم ولم تحل لا حد قبلی** ۔یعنی میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کردیئے گئے، حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہ تھے۔

آیت مذکورہ میں انفال کا حکم یہ بتلایا گیا کہ وہ اللہ کے ہیں، اور رسول کے، معنی اس کے یہ ہیں کہ حاصل ملکیت تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور متصرف ان میں اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، جو حکم خداوندی کے مطابق اپنی صوابدید پر ان کو تقسیم کرتے ہیں۔

اسی لیے ائمہ تفسیر کی ایک جماعت نے جن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد، عکرمہ، سدی وغیرہ داخل ہیں یہ فرمایا کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا، جب تک تقسیمِ غنائم کا وہ قانون نازل نہ ہوا تھا، جو اسی سورت کے پانچویں رکوع میں آ رہا ہے، کیونکہ اس میں پورے مالِ غنیمت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں، اور آگے جو تفصیلی احکام آئے ہیں ان میں یہ ہے کہ کل مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں عام مسلمانوں کی ضروریات کے لیے محفوظ کردیا جائے اور چار حصے شرکاء جہاد میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم کردیئے جائیں، جن کی تفصیل احادیث صحیحہ میں مذکور ہے۔ اس تفصیلی بیان نے سورۂ انفال کی پہلی آیت کو منسوخ کردیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں کوئی ناسخ منسوخ نہیں بلکہ اجمال و تفصیل کا فرق ہے، سورۂ انفال کی پہلی آیت میں اجمال ہے اور اکتالیسویں آیت میں اسی کی تفصیل ہے۔ البتہ مال فیئ جس کے احکام سورۂ حشر میں بیان ہوئے ہیں وہ پورا کا پورا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تصرف ہے، آپ اپنی صوابدید سے جس طرح چاہیں عمل فرمائیں، اسی لیے اس

جگہ احکام بیان فرمانے کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے: ''وَمَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا'' یعنی جو کچھ تم کو ہمارا رسول دے دے اس کو لے لو اور جس کو روک دے اس سے باز رہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مال غنیمت وہ ہے جو جنگ و جہاد کے ذریعہ ہاتھ آئے اور مال فئے وہ جو بغیر قتال و جہاد کے ہاتھ آ جائے اور لفظ انفال دونوں کے لیے عام بھی بولا جاتا ہے اور خاص اس انعام کو بھی کہتے ہیں جو کسی غازی کو امیرِ جہاد عطا کرے۔

(معارف القرآن ۱۷۴/۴، سورہ انفال پ ۹)

فئ اور غنیمت کا فرق

وَمَا اَفَاءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْھُمُ الْاٰیۃ (سورہ حشر پ ۲۸)

لفظ افاء فئ سے مشتق ہے جس کے معنٰی لوٹنے کے ہیں اسی لئے دوپہر کے بعد جن چیزوں کا سایہ مشرق کی طرف لوٹتا ہے اس کو بھی فئ کہا جاتا ہے۔

اموال غنیمت جو کفار سے حاصل ہوتے ہیں ان سب کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے باغی ہو جانے کی وجہ سے ان کے اموال بحقِ سرکار ضبط ہو جاتے ہیں اور ان کی ملکیت سے نکل کر پھر مالکِ حقیقی حق تعالیٰ کی طرف لوٹ جاتے ہیں، اس لئے ان کے حاصل ہونے کو افاء کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ کفار سے حاصل ہونے والے تمام قسم کی اموال کو فئ کہا جاتا، مگر جو مال جہاد و قتال کے ذریعہ حاصل ہوا اس میں انسانی عمل اور جدوجہد کو بھی ایک قسم کا دخل ہے، اس لئے اس کو تو لفظ غنیمت سے تعبیر فرمایا گیا، وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ، لیکن جس کے حصول میں جہاد و قتال کی بھی کوئی ضرورت نہ پڑی اس کو لفظ فئ سے تعبیر فرمایا گیا۔

(معارف القرآن ص ۳۶۶، ج ۸ سورہ حشر)

مالِ غنیمت کی تعریف

لفظ غنیمت لغت میں اس مال کے لیے بولا جاتا ہے جو دشمن سے حاصل کیا جائے، اصطلاحِ شریعت میں غیر مسلموں سے جو مال جنگ وقتال اور قہر وغلبہ کے ذریعہ حاصل ہو اس کو غنیمت کہتے ہیں، اور جو صلح ورضا مندی سے حاصل ہو جیسے جزیہ وخراج وغیرہ اس کو فیئ کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں انہیں دونوں لفظوں سے ان دونوں قسموں کے احکام بتلائے گئے ہیں، سورۂ انفال میں مالِ غنیمت کے احکام کا ذکر ہے جو جنگ وقتال کے وقت غیر مسلموں سے حاصل ہو۔

(معارف القرآن ۴/۲۳۷، سورہ انفال پ ۱۰)

اوّاب اور حفیظ کی تعریف

لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيظٍ (سورہ قٓ پ:۲۶) یعنی جنت کا وعدہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو اوّاب اور حفیظ ہو، اوّاب کے معنی رجوع ہونے والے کے ہیں، مراد وہ شخص ہے جو معاصی سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور شعبیؒ اور مجاہد نے فرمایا کہ اوّاب وہ شخص ہے جو خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرے اور ان سے استغفار کرے، اور حضرت عبید بن عمیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اوّاب وہ شخص ہے جو اپنی ہر مجلس اور ہر نشست میں اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگے اور فرمایا کہ ہمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ اوّاب اور حفیظ وہ شخص ہے جو اپنی ہر مجلس سے اٹھنے کے وقت یہ دعا پڑھے: ”سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ مِمَّا اَصَبْتُ فِیْ مَجْلِسِیْ هٰذَا“ (پاک ہے اللہ اور اس کی حمد ہے یا اللہ میں مغفرت مانگتا ہوں اس برائی سے جو میں نے اس مجلس میں کی ہو)۔

(قرطبی، معارف القرآن ۸/۱۴۷، سورہ قٓ پ:۲۶)

اولوالالباب کی تعریف

''الباب''لبّ کی جمع ہے جس کے معنی مغز کے ہیں، اور ہر چیز کا مغز اس کا خلاصہ ہوتا ہے، اور اسی سے اس کی خاصیت وفوائد معلوم ہوتے ہیں، اسی لیے انسانی عقل کو''لب'' کہا گیا ہے، کیونکہ عقل ہی انسان کا اصلی جوہر ہے، اولوالالباب کے معنی ہیں عقل والے۔ (معارف القرآن ۲/۲۶۳، سورہ آل عمران پ۴)

اولوالارحام، ذوی الارحام اور عصبات کی تعریف

وَاُولُو الاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللهِ. (سورہ انفال پ۱۰)

لفظ''اولو''عربی زبان میں صاحب کے معنی میں آتا ہے، جس کا ترجمہ اردو میں والے سے کیا جاتا ہے، اولوالعقل عقل والے، اولوالامر، امر والے، اس لیے اولوالارحام کے معنی ہوئے، ارحام والے، اَرحام رَحم کی جمع ہے جو اصل میں اس عضو کا نام ہے جس کے اندر بچہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے اور چونکہ رشتہ داری کا تعلق رحم کی شرکت سے قائم ہوتا ہے اس لیے اولوالارحام رشتہ داروں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگرچہ ایک ولایت عامہ سب مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حاصل ہے جس کے سبب بوقت ضرورت ایک دوسرے کی امداد واعانت بھی واجب ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے ہیں لیکن جو مسلمان آپس میں قرابت اور رشتہ کا تعلق رکھتے ہوں وہ دوسرے مسلمانوں سے مقدم ہیں، **فی کتب اللہ** کے معنی اس جگہ **فی حکم اللہ** کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم خاص سے یہ قانون بنادیا ہے۔

اس آیت نے یہ ضابطہ بتادیا کہ تقسیم وراثت رشتہ داری کے معیار پر ہونا چاہئے اور لفظ اولوالارحام مطلقاً اقرباء اور رشتہ داروں کے لیے بولا جاتا ہے، ان میں سے

خاص خاص رشتہ داروں کے حصے تو خود قرآن کریم نے سورۂ نساء میں متعین فرمادیئے جن کو علم میراث کی اصطلاح میں اہل فرائض یا ذوی الفروض کہا جاتا ہے۔ ان کو دینے کے بعد جو مال بچے وہ اس آیت کی رو سے دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہونا چاہئے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سب رشتہ داروں میں کسی مال کا تقسیم کرنا کسی کی قدرت میں نہیں، کیونکہ دور کی رشتہ داری تو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان بلاشبہ موجود ہے کہ سب کے سب ایک ہی باپ اور ماں آدم وحوا علیہما السلام سے پیدا ہوئے ہیں، اس لیے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کی عملی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ قریبی رشتہ دراوں کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے، جس کا تفصیلی بیان احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں اس طرح موجود ہے کہ ذوی الفروض کے حصے دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ میت کے عصبات یعنی جدی رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ دیا جائے، یعنی عصبہ قریب کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے۔

اور اگر عصبات میں سے کوئی بھی زندہ موجود نہیں تو پھر باقی رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے۔

عصبات کے علاوہ جو دوسرے رشتہ دار ہوتے ہیں علم میراث وفرائض کی خاص اصطلاح میں لفظ ذوی الارحام کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے، لیکن یہ اصطلاح بعد میں مقرر کی گئی ہے، قرآن کریم میں اولوالارحام کا لفظ لغوی معنی کے مطابق تمام رشتہ داروں پر حاوی ہے جس میں ذوی الفروض، اور عصبات اور ذوی الارحام سب اجمالی طور پر داخل ہیں۔

پھر اس کی کچھ تفصیل سورۂ نساء کی آیات میں آگئی جن میں خاص خاص رشتہ داروں کے حصے حق تعالیٰ نے خود مقرر فرمادیئے جن کو اصطلاح میراث میں ذوی الفروض کہتے ہیں اور باقی کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھو لاولی رجل ذکر. (بخاری)

ان کو اصطلاحِ میراث میں عصبات کہا جاتا ہے، اگر کسی میت کے عصبات میں کوئی موجود نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق پھر دوسرے رشتہ داروں کو دیا جاتا ہے جن کو اصطلاح میں ذوی الارحام کہتے ہیں جیسے ماموں، خالہ وغیرہ۔ (معارف القرآن ۴/۳۰۱، سورہ انفال پ۱۰)

اولوالامر کی تعریف

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ (سورہ نساء پ۵)

اولواالامر کی تعیین میں متعدد اقوال ہیں:

حضرت حسن، قتادہ، ابن ابی لیلیٰ رحمھم اللہ کے نزدیک علماء اور فقہاء مراد ہیں، حضرت سُدّیؒ فرماتے ہیں کہ امراء اور حکام مراد ہیں، ابوبکر جصاص ان دونوں اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ دونوں مراد ہیں، اس لئے کہ اولواالامر کا اطلاق ان سب پر ہوتا ہے، البتہ اس پر بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ اولواالامر سے مراد فقہاء نہیں ہوسکتے، کیونکہ اولواالامر اپنے لفظی معنیٰ کے اعتبار سے وہ لوگ ہیں جن کا حکم چلتا ہو، اور ظاہر ہے کہ فقہاء کا یہ کام نہیں، حقیقت یہ ہے کہ حکم چلنے کی دو صورتیں ہیں، ایک جبر و تشدد سے وہ تو صرف اہل حکومت ہی کرسکتے ہیں، دوسری صورت اعتقاد و اعتماد کی وجہ سے حکم ماننے کی ہے، وہ حضرات فقہاء ہی کو حاصل ہے، جس کا مشاہدہ عام مسلمانوں کے حالات سے ہر دور میں ہوتا رہا ہے، کہ دین کے معاملات میں عام مسلمان اپنے اختیار سے علماء ہی کے حکم کو واجب العمل قرار دیتے ہیں، اور از روئے شرع ان پر ان کے احکام کی اطاعت واجب بھی ہے، لہٰذا اس وجہ سے ان پر بھی اولواالامر کا اطلاق صحیح ہے۔ (احکام القرآن للجصاص، معارف القرآن ج۲/ص۴۹۲، نساء)

اولوالامر کی تعریف اور ان کی اطاعت کا حکم

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (سورہ نساء پ۵)

اولی الامر ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کے ہاتھ میں کسی چیز کا نظام و انتظام ہو، اسی لیے حضرت ابن عباس، مجاہد اور حسن بصری وغیرہ رضی اللہ عنہم مفسرین قرآن نے اولی الامر کے مصداق علماء وفقہاء کو قرار دیا ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں، اور نظام دین ان کے ہاتھ میں ہے۔

اور ایک جماعت مفسرین نے جن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، فرمایا کہ اولی الامر حکام اور امراء ہیں جن کے ہاتھ میں نظام حکومت ہے۔

اور تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ لفظ دونوں طبقوں کو شامل ہے، یعنی علماء کو بھی اور حکام و امراء کو بھی، کیونکہ نظامِ امر انہی دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

اس آیت میں ظاہراً تینوں کی اطاعت کا حکم ہے اللہ، رسول، اولی الامر، لیکن قرآن کی دوسری آیت نے واضح فرمادیا کہ حکم واطاعت دراصل صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ہے، اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ، مگر اس کے حکم اور اس کی اطاعت کی عملی صورت چار حصوں میں منقسم ہے۔

حکم اور اطاعت کی تین عملی صورتیں

ایک وہ جس چیز کا حکم صراحۃً خود حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمادیا اور اس میں کسی تفصیل وتشریح کی حاجت نہیں، جیسے شرک وکفر کا انتہائی جرم ہونا، ایک اللہ وحدہ کی عبادت کرنا، اور آخرت اور قیامت پر یقین رکھنا، اور محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری برحق رسول ماننا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو فرض سمجھنا، یہ وہ چیزیں ہیں جو براہ راست احکام ربانی ہیں، ان کی تعمیل بلاواسطہ حق تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

دوسرا حصہ احکام کا وہ ہے جس میں تفصیلات وتشریحات کی ضرورت ہے، ان

میں قرآن کریم کا اکثر ایک مجمل یا مبہم حکم دینا ہے اور اس کی تشریح و تفصیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کی جاتی ہے، پھر وہ تفصیل وتشریح جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث کے ذریعہ دیتے ہیں وہ بھی ایک قسم کی وحی ہوتی ہے، اگر اس تفصیل وتشریح میں اجتہادی طور پر کوئی کمی یا کوتاہی رہ جاتی ہے تو بذریعہ وحی اس کی اصلاح فرمادی جاتی ہے، اور بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وعمل جو آخر میں ہوتا ہے وہ حکم الٰہی کا ترجمان ہوتا ہے۔

اس قسم کے احکام کی اطاعت بھی اگرچہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے، لیکن ظاہری اعتبار سے چونکہ یہ احکام صریح طور پر قرآن نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے امت کو پہنچے ہیں اس لیے ان کی اطاعت ظاہری اعتبار سے اطاعت رسولؐ ہی کہلاتی ہے، جو حقیقت میں اطاعت الٰہی کے ساتھ متحد ہونے کے باوجود ظاہری اعتبار سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، اسی لیے پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دینے کے ساتھ اطاعت رسول کا حکم مستقلاً مذکور ہے۔

تیسرا درجہ احکام کا وہ ہے جو نہ قرآن میں صراحۃً مذکور ہیں نہ حدیث میں، یا ذخیرہ احادیث میں اس کے متعلق متضاد روایات ملتی ہیں، ایسے احکام میں علماء مجتہدین قرآن وسنت کے منصوصات اور زیر غور مسئلہ کے نظائر میں غور وفکر کرکے ان کا حکم تلاش کرتے ہیں، ان احکام کی اطاعت بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے قرآن وسنت سے مستفاد ہونے کی وجہ سے اطاعت خداوندی ہی کی ایک فرد ہیں، مگر ظاہری سطح کے اعتبار سے یہ فقہی فتاوی کہلاتے ہیں اور علماء کی طرف منسوب ہیں۔

(معارف القرآن ۲/۴۵۱، سورۂ نساء پ ۵)

اسی تیسری قسم میں ایسے احکام بھی ہیں جن میں کتاب وسنت کی رُو سے کوئی پابندی عائد نہیں، بلکہ ان میں عمل کرنے والوں کو اختیار ہے جس طرح چاہیں کریں، جن کو اصطلاح میں مباحات کہا جاتا ہے، ایسے احکام میں عملی انتظام حکام وامراء کے

سپرد ہے کہ وہ حالات اور مصالح کے پیش نظر کوئی قانون بنا کر سب کو اس پر چلائیں مثلاً شہر کراچی میں ڈاک خانے پچاس ہوں یا سو، پولیس اسٹیشن کتنے ہوں، ریلوے کا نظام کس طرح ہو، آبادکاری کا انتظام کن قواعد پر کیا جائے، یہ سب مباحات ہیں، ان کی کوئی جانب نہ واجب ہے نہ حرام، بلکہ اختیاری ہے، لیکن یہ اختیار عوام کو دے دیا جائے تو کوئی نظام نہیں چل سکتا، اس لیے نظام کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔

آیت مذکورہ میں اولوالامر کی اطاعت سے علماء اور حکام دونوں کی اطاعت مراد ہے، اس لیے اس آیت کی رو سے فقہی تحقیقات میں فقہاء کی اطاعت اور انتظامی امور میں حکام وامراء کی اطاعت واجب ہوگئی۔

یہ اطاعت بھی درحقیقت اللہ جل شانہ کے احکام ہی کی اطاعت ہے، لیکن ظاہری سطح کے اعتبار سے یہ احکام نہ قرآن میں ہیں، نہ سنت میں بلکہ ان کا بیان یا علماء کی طرف سے ہو یا حکام کی طرف سے اس لیے اس اطاعت کو تیسرا نمبر جداگانہ قرار دے کر اولوالامر کی اطاعت نام رکھا گیا، اور جس طرح منصوصات قرآن میں قرآن کا اتباع اور منصوصاتِ رسول میں رسول کا اتباع لازم وواجب ہے اسی طرح غیر منصوص فقہی چیزوں میں فقہاء کا اور انتظامی امور میں حکام وامراء کا اتباع واجب ہے، یہی مفہوم ہے اطاعت اولی الامر کا۔ (معارف القرآن ۲/۴۵۲، سورۂ نساء پ ۵)

اولیاء اللہ کی تعریف اور ان کا مصداق

اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ. (یونس پ ۱۱)

اولیاء ولی کی جمع ہے، لفظ ولی عربی زبان میں قریب کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوست ومُحب کے معنی میں بھی، اللہ تعالیٰ کے قرب ومحبت کا ایک عام درجہ تو ایسا ہے کہ اس سے دنیا کا کوئی انسان وحیوان بلکہ کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں، اگر یہ قرب نہ ہو تو سارے عالم میں کوئی چیز وجود ہی میں نہیں آسکتی، تمام عالم کے وجود کی اصلی علت

وہی خاص رابطہ ہے، جو اس کو حق تعالیٰ شانہ سے حاصل ہے گو اس رابطہ کی حقیقت کو نہ کسی نے سمجھا اور نہ سمجھ سکتا ہے۔ مگر ایک بے کیف رابطہ کا ہونا یقینی ہے، مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت و محبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے۔ یہ قرب محبت کہلاتا ہے، جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے: حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے، میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے، میں ہی اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی حرکت وسکون اور کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا۔

اور اس ولایت خاصہ کے درجات بے شمار اور غیر متناہی ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے۔ کیونکہ ہر نبی کا ولی اللہ ہونا لازمی ہے، اور اس میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں درجۂ فنا کہا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے، وہ جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لیے کرتا ہے، جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کے لیے کرتا ہے، اس کے حُب و بغض اور محبت و عداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ

کے نزدیک ناپسند ہو، اسی حالت کی علامت ہے کثرتِ ذکر اور دوامِ طاعت، یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا، یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں، وہ ولی اللہ کہلاتا ہے، جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنیٰ واعلیٰ کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار سے اولیاء اللہ کے درجات، متفاضل اور کم وبیش ہوتے ہیں۔

(معارف القرآن ۴/ ۵۴۹ سورۂ یونس پ ۱۱)

اہل کی تعریف

قُوا انفُسَکُم وَاھلِیکُم نَاراً (سورہ التحریم پ ۲۸)

اس آیت میں عام مسلمانوں کو حکم ہے کہ جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور اپنے اہل وعیال کو بھی، لفظ اَھلِیکُم میں اہل وعیال سب داخل ہیں جن میں بیوی، اولاد، غلام، باندیاں سب داخل ہیں اور بعید نہیں کہ ہمہ وقتی نوکر چاکر بھی غلام باندیوں کے حکم میں ہوں۔ (معارف القرآن ص ۵۰۲، ج ۸، سورۂ التحریم پ ۲۸)

اہل بیت کی تعریف اور ان کا مصداق

''اِنَّمَا یُرِیدُ اللّٰہُ لِیُذھِبَ عَنکُمُ الرِّجسَ اَھلَ البَیت''۔

(سورہ احزاب ب ۲۲)

اوپر کی آیات میں یا نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب تھا اس لیے بصیغۂ تانیث خطاب کیا گیا، یہاں اہل البیت میں ازواج مطہرات کے ساتھ ان کی اولاد وآباء بھی داخل ہیں، اس لیے بصیغۂ مذکر فرمایا ''عَنکُم وَیُطَھِّرکُم'' اور بعض ائمہ

تفسیر نے اہل بیت سے مراد صرف ازواج مطہرات کو قرار دیا ہے۔

حضرت عکرمہ و مقاتل نے یہی فرمایا ہے، اور سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے آیت میں اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات کو قرار دیا، اور استدلال میں اگلی آیت پیش فرمائی ''وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ''۔ (رواہ ابن ابی حاتم وابن جریر)

اور سابقہ آیت میں نساء النبی کے الفاظ سے خطاب بھی اس کا قرینہ ہے، حضرت عکرمہ تو بازار میں منادی کرتے تھے کہ آیت میں اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات ہیں، کیونکہ یہ آیت انہیں کی شان میں نازل ہوئی ہے اور فرماتے تھے کہ میں اس پر مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں، لیکن حدیث کی متعدد روایات جن کو ابن کثیر نے اس جگہ نقل کیا ہے اس پر شاہد ہیں کہ اہل بیت میں حضرت فاطمہ اور علی اور حضرت حسن و حسین بھی شامل ہیں، جیسے صحیح مسلم کی حدیث حضرت عائشہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لے گئے اور اس وقت آپ ایک سیاہ رومی چادر اوڑھے ہوئے تھے، حسن بن علی رضی اللہ عنہ آ گئے تو ان کو اسی چادر میں لے لیا، پھر حسین آ گئے ان کو بھی اسی طرح چادر کے اندر داخل فرمالیا، اس کے بعد حضرت فاطمہ پھر حضرت علی مرتضٰی آ گئے ان کو بھی چادر میں داخل فرمالیا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ''اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا '' اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آیت پڑھنے کے بعد فرمایا ''اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلُ بَيْتِيْ ''۔ رواہ ابن جریر۔ (معارف القرآن ۱۴۰/۷ پ:۲۲، سورہ احزاب)

اہل قبلہ کی تعریف و تشریح

خوب سمجھ لیجئے کہ لفظ اہل قبلہ ایک شرعی اصطلاح ہے جس کے معنی اہل اسلام

کے ہیں اور اسلام وہی ہے جس میں کوئی بات کفر کی نہ ہو، لہٰذا یہ لفظ صرف ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو تمام ضروریاتِ دین کو تسلیم کریں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر (بشرط ثبوت) ایمان لائیں۔ نہ ہر اس شخص کے لیے جو قبلہ کی طرف منھ کرلے۔ جیسے دنیا کی موجودہ عدالتوں میں اہل کار کا لفظ صرف ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو باضابطہ ملازم اور قوانینِ ملازمت کے پابند ہوں۔ اس کے مفہوم لغوی کے موافق ہر کام والے آدمی کو اہل کار نہیں کہا جاتا۔ اور یہ جو کچھ لکھا گیا علم فقہ وعقائد کی کتابیں تقریباً تمام اس پر شاہد ہیں جن میں سے بعض عبارات درج ذیل ہیں۔

حضرت ملا علی قاریؒ شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں:

إعلم أن المراد باهل القبلة الذين اتفقوا على ما هو من ضروريات الدين كحدوث العالم وحشر الاجساد وعلم الله تعالىٰ بالكليات والجزئيات وما اشبه ذلك من المسائل المهمات فمن واظب طول عمره على الطاعات والعبادات مع اعتقاد قدم العالم ونفي الحشر اونفي علمه سبحانه وتعالىٰ بالجزئيات لا يكون من اهل القبلة وان المراد بعدم تكفير احد من اهل القبله عند اهل السنة انه لا يكفر احد ما لم يوجد شيء من امارات الكفر وعلاماته ولم يصدر عنه شئ من موجباته۔

خوب سمجھ لو کہ اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان تمام عقائد پر متفق ہوں جو ضروریات دین میں سے ہیں جیسے حدوثِ عالم اور قیامت وحشر ابدان اور اللہ تعالیٰ کا علم تمام کلیات وجزئیات پر حاوی ہونا اور اسی قسم کے دوسرے عقائد مہمہ پس جو شخص تمام عمر طاعات وعبادات پر مداومت کرے مگر ساتھ ہی عالم کے قدیم ہونے کا معتقد

ہو یا قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے کا یا حق تعالیٰ کے علم جزئیات کا انکار کرے وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اور یہ کہ اہل سنت کے نزدیک اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے سے مراد یہی ہے کہ ان میں سے کسی شخص کو اس وقت تک کافر نہ کہیں جب تک اس سے کوئی ایسی چیز سرزد نہ ہو جو علاماتِ کفر یا موجباتِ کفر میں سے ہے۔

اور شرح مقاصد مبحث سابع میں مذکور الصدر مضمون کو مفصل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

فلا نزاع فی کفر اهل القبلة المواظب طول العمر علی الطاعات باعتقاد قدم العالم ونفی الحشر ونفی العلم بالجزئیات ونحو ذلک وکذلک بصدور شیٔ من موجبات الکفر عنه۔

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے اس شخص کو کافر کہا جائے گا جو اگرچہ تمام عمر طاعات وعبادات میں گذارے مگر عالم کے قدیم ہونے کا اعتقاد رکھے یا قیامت وحشر کا یا حق تعالیٰ کے عالم جزئیات ہونے کا انکار کرے اسی طرح وہ شخص جس سے کوئی چیز موجباتِ کفر میں سے صادر ہو جائے۔

اور علامہ شامی نے ردالمحتار باب الامامۃ جلد اول میں بحوالہ تحریر الاصول نقل فرمایا ہے:

لاخلاف فی کفر المخالف من اهل القبلة. (ای للضروریات) المواظب طول عمره علی الطاعات کما فی شرح التحریر. (۱/۳۷۷)

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے جو شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا منکر ہو وہ کافر ہے اگرچہ تمام عمر طاعات وعبادات میں گزار دے۔

اور شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس ص:۵۷۲ میں ہے:

اهل القبلة فی اصطلاح المتکلمین من یصدق بضروریات

الدين إلى قوله فمن انكر شيئاً من الضروريات (الى قوله) لم يكن من أهل القبلة ولو كان مجاهداً بالطاعات وكذلك من باشر شيئا من أمارات التكذيب كسجود الصنم والإهانة بامر شرعي والاستهزاء عليه فليس من اهل القبلة ومعنى عدم تكفير اهل القبلة ان لا يكفر بارتكاب المعاصي ولا بانكار الامور الخفية غير المشهورة هذا ما حققه المحققون.

اہل قبلہ متکلمین کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو تمام ضروریاتِ دین کی تصدیق کرے پس جو شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اگرچہ عبادت واطاعت میں مجاہدات کرنے والا ہو، ایسے ہی وہ شخص جو علامات کفر وتکذیب میں سے کسی چیز کا مرتکب ہو جیسے بُت کو سجدہ کرنا یا کسی امر شرعی کی اہانت واستہزاء کرنا وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اور اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہیں اور نہ ایسے امور کے انکار کی وجہ سے کافر کہیں جو اسلام میں مشہور نہیں یعنی ضروریات دین میں سے نہیں۔

(جواہر الفقہ ۳۲ تا ۳۴، ج ۱، رسالہ تکفیر کے اصول)

اہل کتاب اور صابئین کی تعریف

اہل کتاب قرآن وسنت کی اصطلاح میں کون لوگ ہیں، کتاب سے کیا مراد ہے؟ اور کیا اہل کتاب ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ اپنی کتاب پر صحیح طور سے ایمان وعمل رکھتے ہوں، اس میں یہ تو ظاہر ہے کہ کتاب کے لغوی معنی یعنی ہر لکھا ہوا ورق تو مراد ہو نہیں سکتا، وہی کتاب مراد ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہو۔ اس لیے باتفاق امت کتاب سے مراد وہ آسمانی کتاب ہے جس کا کتاب اللہ

ہونا بتصدیق قرآن یقینی ہو، جیسے تورات، انجیل، زبور، صحف موسیٰ وابراہیم وغیرہ۔ اس لیے وہ قومیں جو کسی ایسی کتاب پر ایمان رکھتی اور اس کو وحی الٰہی قرار دیتی ہوں جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن وسنت کے یقینی ذرائع سے ثابت نہیں، وہ قومیں اہل کتاب میں داخل نہیں ہوں گی جیسے مشرکین مکہ، مجوس، بت پرست، ہندو، بدھ، آریہ، سکھ وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہود ونصاریٰ جو تورات وانجیل پر ایمان رکھنے والے ہیں، وہ باصطلاح قرآن اہل کتاب میں داخل ہیں۔

تیسری ایک قوم جس کو صابئین کہتے ہیں ان کے حالات مشتبہ ہیں، جن حضرات کے نزدیک یہ لوگ زبور داؤد علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان کو بھی اہل کتاب میں شامل قرار دیتے ہیں۔ اور جن کو یہ تحقیق ہوا کہ زبور سے ان کا کوئی تعلق نہیں یہ نجوم پرست قوم ہیں، وہ ان کو بت پرستوں اور مجوس کے ساتھ شریک قرار دیتے ہیں۔ بہرحال یقینی طور پر جن کو باتفاق اہل کتاب کہا جاتا ہے وہ یہود ونصاریٰ ہیں، تو قرآن حکیم کے اس حکم کا حاصل یہ ہوا کہ یہود ونصاریٰ کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے اور مسلمانوں کا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے۔

اب رہا یہ معاملہ کہ یہود ونصاری کو اہل کتاب کہنے اور سمجھنے کے لیے کیا یہ شرط ہے کہ وہ صحیح طور پر اصلی تورات وانجیل پر عمل رکھتے ہوں، یا محرّف تورات، اور انجیل کا اتباع کرنے والے اور عیسیٰ ومریم علیہما السلام کو خدا کا شریک قرار دینے والے بھی اہل کتاب میں داخل ہیں، سو قرآن کریم کی بے شمار تصریحات سے واضح ہے کہ اہل کتاب ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اس کی اتباع کرنے کے دعویدار ہوں۔ خواہ وہ اس کے اتباع میں کتنی گمراہیوں میں جا پڑے ہوں۔

قرآن کریم نے جن کو اہل کتاب کا لقب دیا انہیں کے بارے میں یہ بھی جابجا ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ اور یہ بھی فرمایا کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا اور نصاریٰ نے حضرت عیسی علیہ السلام کو قَالَتِ الْيَهُوْدُ عزير بن الله وَقَالَتِ النَّصَارٰى الْمَسِيْحُ بن الله ان حالات وصفات کے باوجود جب قرآن نے ان کو اہل کتاب قرار دیا تو معلوم ہوا کہ یہود و نصاری جب تک یہودیت و نصرانیت کو بالکل نہ چھوڑ دیں وہ اہل کتاب میں داخل ہیں، خواہ وہ کتنے ہی عقائد فاسدہ اور اعمال سیئہ میں مبتلا ہوں۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں آپ کے کسی عامل یا گورنر نے ایک خط لکھ کر یہ دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات پڑھتے ہیں اور یوم السبت یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم بھی یہود کی طرح کرتے ہیں، مگر قیامت پر ان کا ایمان نہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے تحریر فرمایا کہ وہ اہل کتاب ہی کا ایک فرقہ سمجھے جائیں گے۔

صرف نام کے یہود و نصرانی جو درحقیقت دہریئے ہیں وہ اس میں داخل نہیں

آج کل یورپ کے عیسائی اور یہودیوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنی مردم شماری کے اعتبار سے یہودی یا نصرانی کہلاتے ہیں مگر درحقیقت وہ خدا کے وجود اور کسی مذہب ہی کے قائل نہیں۔ نہ تورات و انجیل کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور نہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی و پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ

وہ شخص مردم شماری کے نام کی وجہ سے اہل کتاب کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتے۔

نصاریٰ کے بارے میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ان کا ذبیحہ حلال نہیں اس کی وجہ یہ بتلائی کہ یہ لوگ دین نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کسی چیز کے قائل نہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد یہ ہے کہ:

روی ابن الجوزی بسنده عن علیؓ قال لاتأكلوا من ذبائح نصاری بنی تغلب فانهم لم يتمسكوا من النصرانية بشيء إلاشرابهم الخمر ورواه الشافعي بسند صحيح عنه۔ (تفسیر مظہری ص:۳۴، جلد۳ مائدہ)

ابن جوزی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نصاری بنی تغلب کے ذبائح کو نہ کھاؤ، کیونکہ انہوں نے مذہب نصرانیت میں سے شراب نوشی کے سوا کچھ نہیں لیا، امام شافعی نے بھی سند صحیح کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بنی تغلب کے متعلق یہی معلومات تھیں کہ وہ بے دین ہیں، نصرانی نہیں۔ اگر چہ نصرانی کہلاتے ہیں، اس لیے ان کے ذبیحہ سے منع فرمایا جمہور صحابہ و تابعین کی تحقیق یہ تھی کہ یہ بھی عام نصرانیوں کی طرح ہیں، بالکل دین کے منکر نہیں۔ اس لیے انہوں نے ان کا ذبیحہ بھی حلال قرار دیا۔

وقال جمهور الامة إن ذبيحة كل نصراني حلال سواء كان من بني تغلب او غيرهم وكذلك اليهود۔ (تفسیر قرطبی ۶/۷۸)

اور جمہور امت کہتے ہیں کہ نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے، خواہ بنی تغلب میں سے ہو، یا ان کے سوا کسی دوسرے قبیلہ اور جماعت سے ہو، اسی طرح ہر یہودی کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن نصرانیوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے یا حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی نہیں مانتے، وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔

طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟

طعام کے لغوی معنی کھانے کی چیز کے ہیں، جس میں از روئے لغت عربی ہر قسم کی کھانے کی چیزیں داخل ہیں، لیکن جمہور امت کے نزدیک اس جگہ طعام سے مراد صرف اہل کتاب کے ذبائح کا گوشت ہے، کیونکہ گوشت کے سوا دوسری اشیاء خوردنی میں اہل کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی امتیاز اور فرق نہیں، کھانے پینے کی خشک چیزیں، گیہوں، چنا، چاول اور پھل وغیرہ ہر کافر کے ہاتھ کا حلال و جائز ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ (معارف القرآن سورۂ مائدہ ۴۸/۳)

آیت اور آیات کی تعریف

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسٰى تِسْعَ آيَاتٍ: (بنی اسرائیل) آیت کا لفظ معجزہ کے معنی میں بھی آتا ہے اور آیاتِ قرآن یعنی احکام الٰہیہ میں بھی۔ اس جگہ دونوں معنی کا احتمال ہے، اسی لیے ایک جماعت مفسرین نے اس جگہ آیات سے مراد معجزات لیے ہیں۔

(معارف القرآن، بنی اسرائیل ۵۲۷/۵)

''آیات'' آیۃ کی جمع ہے اور یہ لفظ چند معانی کے لیے بولا جاتا ہے، آیات معجزات کو بھی کہا جاتا ہے اور قرآن مجید کی آیات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس کے تیسرے معنی دلیل اور نشانی کے بھی ہیں، یہاں پر یہی تیسرے معنی مراد ہیں، یعنی ان امور میں اللہ کی بڑی نشانیاں اور قدرت کے دلائل ہیں۔

(معارف القرآن ۲۶۲/۲، سورۂ آل عمران پ۴)

ایّام اللہ کی تعریف

ایّام یوم کی جمع ہے، جس کے معنیٰ دن کے مشہور ہیں، لفظ ایام اللہ دو معنی کے

لئے بولا جاتا ہے، اور وہ دونوں یہاں مراد ہو سکتے ہیں، اول وہ خاص ایام جن میں کوئی جنگ یا انقلاب آیا ہے، جیسے غزوۂ بدر و اُحد اور احزاب وحنین وغیرہ کے واقعات، یا پچھلی امتوں پر عذاب نازل ہونے کے واقعات ہیں، جن میں بڑی بڑی قومیں زیروزبر یا نیست ونابود ہوگئیں، اس صورت میں ایام اللہ یاددلانے سے ان قوموں کو کفر کے انجامِ بد سے ڈرانا اور متنبہ کرنا مقصود ہوگا۔

دوسرے معنیٰ ایام اللہ کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کے بھی آتے ہیں تو ان کو یاددلانے کا مقصد یہ ہوگا کہ شریف انسان کو جب کسی محسن کا احسان یاددلایا جائے تو وہ اس کی مخالفت اور نافرمانی سے شرماجاتا ہے۔

(معارف القرآن ص ۲۳۱، ج ۵، سورہ ابراہیم،)

ایمان وکفر اور نفاق کی تعریف

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (بقرہ پ ۱)

ایمان کی تعریف کو قرآن نے یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے صرف دو لفظوں میں پورا بیان کردیا ہے، لفظ ایمان اور غیب کے معنیٰ سمجھ لیے جاویں تو ایمان کی پوری حقیقت اور تعریف سمجھ میں آجاتی ہے۔

لغت میں کسی کی بات کو کسی کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے اسی لیے محسوسات ومشاہدات میں کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے مثلاً کوئی شخص سفید کپڑے کو سفید یا سیاہ کو سیاہ کہہ رہا ہے اور دوسرا اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو تصدیق کرنا تو کہیں گے ایمان لانا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے اعتماد کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بناء پر ہے اور اصطلاح شرع میں خبر رسول کو ایمان بالغیب کی حقیقت اور ایمان مجمل ومفصل بغیر

مشاہدہ کے محض رسول کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے۔

لفظ غیب لغت میں ایسی چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواس خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں، یعنی نہ وہ آنکھ سے نظر آئیں نہ کان سے سنائی دیں نہ ناک سے سونگھ کر یا زبان سے چکھ کر ان کا علم ہو سکے، اور نہ ہاتھ سے چھو کر ان کو معلوم کیا جا سکے۔

قرآن میں لفظ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور ان کا علم بداہت عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات بھی آجاتی ہیں، تقدیری امور، جنت ودوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنے والے واقعات بھی فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیاء سابقین بھی، جس کی تفصیل اسی سورہ بقرہ کے ختم پر آمن الرسول میں بیان کی گئی ہے، گویا یہاں ایمان مجمل کا بیان ہوا ہے، اور آخری آیت میں ایمان مفصل کا۔

تو اب ایمان بالغیب کے معنی یہ ہو گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات وتعلیمات لے کر آئے ہیں ان سب کو یقینی طور پر دل سے ماننا، شرط یہ ہے کہ اس تعلیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا قطعی طور پر ثابت ہو، جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے۔ (عقیدہ طحاوی، عقائد نسفی وغیرہ)

اس تعریف میں ماننے کا نام ایمان بتلایا گیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض جاننے کو ایمان نہیں کہتے کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس وشیطان اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کا یقین تھا مگر اس کو مانا نہیں اس لیے وہ مؤمن نہیں۔ (معارف القرآن ص:۱۰۹ ج ا سورہ بقرہ پ:۱)

ایمان اور اسلام میں فرق

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (بقرہ پ ۱)

لغت میں ایمان کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے اور اسلام اطاعت وفرمانبرداری کا، ایمان کا محل قلب ہے، اور اسلام کا بھی قلب اور سب اعضاء وجوارح، لیکن شرعاً ایمان بغیر اسلام کے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں، یعنی اللہ اور اس کے رسول کی محض دل میں تصدیق کر لینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت وفرمانبرداری کا اقرار نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار یا فرمانبرداری کا اقرار اس وقت تک معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے ایمان اور اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں اور قرآن وحدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بناء پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر بھی ہے، مگر شرعاً ایمان بدون اسلام کے اور اسلام بدون ایمان کے معتبر نہیں۔

(معارف القرآن ص:۱۱۱ ج ۱، سورہ بقرہ پ ۱)

کفر ونفاق کی تعریف

جب اسلام یعنی ظاہری اقرار وفرمانبرداری کے ساتھ دل میں ایمان نہ ہو تو اس کو قرآن کی اصطلاح میں نفاق کا نام دیا گیا ہے اور اس کو کھلے کفر سے زیادہ شدید جرم ٹھہرایا ہے:

''اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ''۔ (سورۂ نساء پ:۵)

یعنی منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں رہیں گے۔

اسی طرح ایمان یعنی تصدیق قلبی کے ساتھ اگر اقرار واطاعت نہ ہو تو اس کو بھی قرآنی نصوص میں کفر ہی قرار دیا ہے ارشاد ہے ''یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ ''، یعنی یہ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی حقانیت کو ایسے ہی یقینی طریق پر جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

''وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا''۔(پ:۱۹،سورۂ نمل)

یعنی یہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ان کے دلوں میں ان کا یقین کامل ہے اور ان کی یہ حرکت محض ظلم وتکبر کی وجہ سے ہے۔

میرے استاذ محترم حضرت العلام سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کو اس طرح بیان فرماتے تھے کہ ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہے فرق صرف ابتداء وانتہاء میں ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے اور اسلام ظاہر عمل سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہنچ کر مکمل سمجھا جاتا ہے، اگر تصدیق قلبی ظاہری اقرار واطاعت تک نہ پہنچے وہ تصدیق ایمان معتبر نہیں، اسی طرح اگر ظاہری اطاعت واقرار تصدیق قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام معتبر نہیں، امام غزالیؒ اور امام سبکیؒ کی بھی یہی تحقیق ہے اور امام ابن ہمام نے مسامرہ میں اسی تحقیق پر تمام اہل حق کا اتفاق ذکر کیا ہے۔ (معارف القرآن ص:۱۱۲، ج۱، سورہ بقرہ پ۱)

ایّم اور ایامیٰ کی تعریف

اَیَامیٰ اَیم کی جمع ہے جو ہر اس مرد وعورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس کا نکاح موجود نہ ہو خواہ اول ہی سے نکاح نہ کیا ہو یا زوجین میں کسی ایک کی موت سے یا طلاق سے نکاح ختم ہو چکا ہو، ایسے مردوں وعورتوں کے نکاح کے لئے ان کے اولیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان کے نکاح کا انتظام کریں۔ (معارف القرآن ۴۰۸، ج۶ سورہ نور)

بالغ کی تعریف اور بلوغت کا معیار

فَاِذَا بَلَغُوْا النِّکَاح الآیۃ: (سورۂ نساء پ۵)

اس آیت میں جہاں بلوغ کا حکم بیان فرمایا گیا وہاں قرآن کریم نے اس بارے میں بچہ کا بالغ ہونا کس عمر میں سمجھا جائے گا ''فَاِذَا بَلَغُوْا النِّکَاح'' فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ اصل بلوغ کسی عمر کے مقید نہیں بلکہ اس کا مدار ان آثار (وعلامات) پر ہے جو بالغوں کو پیش آتے ہیں، ان آثار کے اعتبار سے جس وقت بھی وہ نکاح کے قابل ہو جائیں بالغ سمجھے جائیں گے، خواہ عمر تیرہ، چودہ سال ہی کی ہو، البتہ اگر کسی بچہ میں آثارِ بلوغ نمودار ہی نہ ہوں تو عمر کے اعتبار سے اس کو بالغ قرار دیا جائے گا، جس میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض نے لڑکے کے لیے اٹھارہ سال اور لڑکی کے لیے سترہ سال مقرر کئے ہیں، اور بعض نے دونوں کے لیے پندرہ سال قرار دیئے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مذہب میں فتویٰ اس قول پر ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں پندرہ سال کی عمر پوری ہونے پر شرعاً بالغ قرار دیئے جائیں گے، خواہ آثار بلوغ پائے جائیں یا نہیں۔ (معارف القرآن ۲/۳۰۴، سورۂ نساء پ۵)

(غزوۂ احزاب میں) اسلامی لشکر میں کچھ نابالغ بچے بھی اپنے جوش ایمانی سے نکل کھڑے ہوئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بچوں کو واپس کر دیا جو

پندرہ سال سے کم عمر والے تھے، پندرہ سالہ نوعمر کے لیے گئے جن میں حضرت عبید اللہ بن عمر، زید بن ثابت، ابوسعید خدری، براء بن عازب رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

(معارف القرآن ۷/۱۰۳، سورہ احزاب)

بالغ کی تعریف

لڑکے کا بلوغ اصل میں انزال واحتلام سے ہوتا ہے اور لڑکی کا حیض آنے یا حاملہ ہونے سے یا احتلام سے، لیکن اگر کسی لڑکے یا لڑکی میں مذکورۃ الصدر علامات بلوغ میں سے کوئی نہ پائے تو پندرہ برس کی عمر سے اس کو شرعاً بالغ سمجھا جائے گا خواہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ (امداد المفتین، ص ۷۳۹، ج ۲)

بخل اور شُح کی تعریف

وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتَاھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ۔ الآیۃ۔ (آل عمران پ ۴)

بخل کے معنی شرعی یہ ہیں کہ جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کسی پر واجب ہو اس کو خرچ نہ کرے، اسی لیے بخل حرام ہے، اور اس پر جہنم کی وعید شدید ہے، اور جن مواقع پر خرچ کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے وہ اس بخل حرام میں داخل نہیں مگر خلاف اولیٰ ہے۔

بخل ہی کے معنی میں ایک دوسرا لفظ بھی احادیث میں آیا ہے یعنی شُح، اس کی تعریف یہ ہے کہ اپنے ذمہ جو خرچ کرنا واجب تھا وہ ادا نہ کرے اس پر مزید یہ کہ مال بڑھانے کی حرص میں مبتلا رہے، تو وہ بخل سے بھی زیادہ شدید جرم ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یَجْتَمِعُ شُحٌّ وَاِیْمَانٌ فِیْ قَلْبِ رَجُلٍ مسلم أبداً۔ (رواہ النسائی عن ابی ہریرہؓ)

یعنی شح وایمان کسی مسلمان کے قلب میں جمع نہیں ہوسکتے۔ (قرطبی)

بخل کی جو سزا اس آیت میں ذکر کی گئی ہے کہ قیامت کے روز جس چیز کے دینے میں بخل کیا اس کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا، اس کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو اللہ نے کوئی مال عطا فرمایا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو قیامت کے روز یہ مال ایک سخت زہریلا سانپ بن کر اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا، وہ اس شخص کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، تیرا سرمایہ ہوں۔

(قرطبی- معارف القرآن ۲/۲۵۲، سورۂ آل عمران پ۴)

بخل اور شُح کا فرق

لفظ ''شُحّ'' اور بخل تقریبا ہم معنیٰ ہیں، لفظ شُح میں کچھ مبالغہ ہے، کہ بہت شدید بخل کو کہا جاتا ہے، بخل و شح اگر حقوق واجبہ میں کیا جائے، خواہ وہ اللہ کے حقوق ہوں جیسے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، عشر، قربانی وغیرہ کی ان کی ادائیگی میں بوجہ بخل کے کوتاہی کرے، یا انسانوں کے حقوق واجبہ ہوں جیسے اہل وعیال کا نفقہ یا اپنے حاجتمند والدین اور عزیزوں کا نفقہ واجبہ، جو بخل ان حقوقِ واجبہ کی ادائیگی سے مانع ہو وہ قطعاً حرام ہے اور جو امور مستحبہ اور فضائل انفاق سے مانع ہو وہ مکروہ و مذموم ہے اور جو محض رسمی چیزوں میں خرچ سے مانع ہو وہ شرعاً بخل نہیں۔

(معارف القرآن ۳۷۹، ج۸، سورہ حشر)

بدر کی تعریف

''بدر'' مدینہ کے جنوب مغرب میں بیس میل کے فاصلہ پر ایک پڑاؤ اور منڈی کا نام ہے، اس وقت اس کو اس لیے اہمیت حاصل تھی کہ یہاں پانی کی افراط تھی اور

یہ عرب کے ریگستانی میدانوں میں بڑی چیز تھی، توحید اور شرک کے درمیان یہیں سب سے پہلا معرکہ بروز جمعہ ۱۷ رمضان المبارک سن ۲ ہجری مطابق ۱۱ مارچ ۶۲۴ء کو پیش آیا تھا۔ (معارف القرآن، سورۂ آل عمران ۲/۱۷۰)

بدعت کی تعریف اور اس کی حقیقت

اصل لغت میں بدعت ہر نئی چیز کو کہتے ہیں خواہ عبادات سے متعلق ہو یا عادات سے، اور اصطلاح شرع میں ہر ایسے نو ایجاد طریقۂ عبادت کو بدعت کہتے ہیں، جو زیادہ ثواب حاصل کرنے کی نیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے بعد اختیار کیا گیا ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد مبارک میں اس کا داعیہ اور سبب موجود ہونے کے باوجود نہ قولاً ثابت ہو نہ فعلاً نہ صراحۃً نہ اشارۃً، بدعت کی یہ تعریف علامہ برکوئی کی کتاب **الطریقة المحمدیه**، اور علامہ شاطبی کی کتاب ''الاعتصام'' سے لی گئی ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ عادات اور دنیوی ضروریات کے لیے جو نئے نئے آلات اور طریقے روزمرہ ایجاد ہوتے رہتے ہیں ان کا شرعی بدعت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بطور عبادت اور بہ نیت ثواب نہیں کئے جاتے یہ سب جائز اور مباح ہیں، بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم کے مخالف نہ ہوں۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو عبادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے قولاً ثابت ہو یا فعلاً صراحۃً یا اشارۃً وہ بھی بدعت نہیں ہوسکتی۔

نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس کام کی ضرورت عہد رسالت میں موجود نہ تھی بعد میں کسی دینی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پیدا ہوگئی، وہ بھی بدعت میں داخل نہیں۔ جیسے مروجہ مدارس اسلامیہ اور تعلیمی تبلیغی انجمنیں اور دینی نشر و اشاعت کے ادارے اور قرآن وحدیث سمجھنے کے لیے صرف ونحو اور ادب عربی اور فصاحت و بلاغت کے

فنون یا مخالف اسلام فرقوں کا رد کرنے کے لیے منطق اور فلسفہ کی کتابیں یا جہاد کے لیے جدید اسلحہ اور جدید طریقۂ جنگ کی تعلیم وغیرہ کہ یہ سب چیزیں ایک حیثیت سے عبادت بھی ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں موجود بھی نہ تھیں مگر پھر بھی ان کو بدعت اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ان کا سبب داعی اور ضرورت اس عہد مبارک میں موجود نہ تھی، بعد میں جیسی جیسی ضرورت پیدا ہوتی گئی علماء امت نے اس کو پورا کرنے کے لیے مناسب تدبیریں اور صورتیں اختیار کر لیں۔

احداث فی الدّین اور احداث للدّین کی تفصیل

اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب چیزیں نہ اپنی ذات میں عبادت ہیں نہ کوئی ان کو اس خیال سے کرتا ہے کہ ان میں زیادہ ثواب ملے گا بلکہ وہ چیزیں عبادت کا ذریعہ اور مقدمہ ہونے کی حیثیت سے عبادت کہلاتی ہیں گویا یہ احداث فی الدین نہیں بلکہ احداث للدین ہے اور احادیث میں ممانعت احداث فی الدین کی آئی ہے، احداث للدّین کی نہیں یعنی کسی منصوص دینی مقصد کو پورا کرنے کے لیے بضرورت زمان ومکان کوئی نئی صورت اختیار کر لینا ممنوع نہیں۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن کاموں کی ضرورت عہد رسالت میں اور زمان مابعد میں یکساں ہے ان میں کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرنا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے ثابت نہیں اس کو بدعت کہا جائے گا اور یہ از روئے قرآن وحدیث ممنوع وناجائز ہوگا۔

مثلاً درود وسلام کے وقت کھڑے ہو کر پڑھنے کی پابندی، فقراء کو کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنے کے لیے کھانے پر مختلف سورتیں پڑھنے کی پابندی، نماز باجماعت کے بعد پوری جماعت کے ساتھ کئی کئی مرتبہ دعاء مانگنے کی پابندی، ایصالِ

ثواب کے لیے تیجہ، چہلم وغیرہ کی پابندی، رجب وشعبان وغیرہ کی متبرک راتوں میں خود ایجاد قسم کی نمازیں اور ان کے لیے چراغاں وغیرہ اور پھر ان خود ایجاد چیزوں کو فرض وواجب کی طرح سمجھنا ان میں شریک نہ ہونے والوں پر ملامت اور لعن طعن کرنا وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ درود وسلام، صدقہ وخیرات، اموات کو ایصال ثواب متبرک راتوں میں نماز وعبادت، نمازوں کے بعد دعا، یہ سب چیزیں عبادات ہیں، ان کی ضرورت جیسے آج ہے ایسے ہی عہد صحابہ میں بھی تھی، ان کے ذریعہ ثواب آخرت اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ذوق وشوق جیسے آج کسی نیک بندے کو ہوسکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کو ان سب سے زائد تھا، کون دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کو صحابہ کرام سے زائد ذوق عبادت اور شوق رضاء الٰہی حاصل ہے، حضرت حذیفہ بن یمانؓ فرماتے ہیں کہ:

کل عبادة لم یتعبدها اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فلا تعبدوها فان الاول لم یدع للآخر مقالا فاتقوا اللہ یا معشر المسلمین وخذوا بطریق من کان قبلکم۔

یعنی جو عبادت صحابہ کرام نے نہیں کی وہ عبادت نہ کرو، کیونکہ پہلے لوگوں نے پچھلوں کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کو یہ پورا کریں اے مسلمانو! خدا تعالیٰ سے ڈرو اور پہلے لوگوں کے طریقے کو اختیار کرو، اور اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی منقول ہے۔ (اعتصام للشاطبی ۱/۳۱۰)

بدعت حسنہ اور سیئہ کی تعریف

صحیح حدیث میں ہے کہ **کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار**۔ یعنی ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاح شرع میں ہر بدعت سیئہ اور گمراہی ہے، کسی بدعت اصطلاحی کو بدعت حسنہ نہیں کہا جا سکتا، البتہ لغوی معنی میں ہر نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں اس اعتبار سے ایسی چیزوں کو بدعت حسنہ کہہ دیتے ہیں جو صریح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نہیں تھی بعد میں کسی ضرورت کی بنا پر ان کو اختیار کیا گیا جیسے آج کل کے مدارس اسلامیہ اور ان میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون کہ در اصل بنیاد تعلیم اور درس اور مدرسہ کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، آپ نے خود فرمایا ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً'' یعنی میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ لیکن جس طرح کے مدارس کا قیام اور ان میں جس طرح کی تعلیم آج کل بضرورت زمانہ ضروری ہوگئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں اس کی ضرورت نہ تھی آج ضرورت پیش آئی تو احیاء سنت کے لیے اس کو اختیار کیا گیا، جو تعریف بدعت کی اوپر لکھی جا چکی ہے اس کی رو سے ایسے اعمال بدعت میں داخل نہیں لیکن لغوی معنی کے اعتبار سے کوئی ان کو بدعت کہہ دے تو بدعت حسنہ ہی کہا جائے گا۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے تراویح کی یکجا جماعت کو دیکھ کر اس معنی کے اعتبار سے فرمایا: **نعمت البدعة هذه** یعنی یہ بدعت تو اچھی ہے کیونکہ ان کو اور سب کو معلوم تھا کہ تراویح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی اور پڑھائی اور زبانی اس کی تاکید کی اس لیے حقیقۃً اور شرعاً تو اس میں بدعت کا کوئی احتمال نہ تھا، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک خاص عذر کی وجہ سے تراویح کی جماعت کا ایسا اہتمام نہ کیا گیا تھا جو بعد میں حضور ہی کی تعلیم کے مطابق کیا گیا اس لیے ظاہری اور لغوی طور پر یہ کام بھی نیا تھا اس کو نعمت البدعۃ فرمایا، بدعت حسنہ کا اس سے زیادہ کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔

حضرت امام مالکؒ نے فرمایا من ابتدع بدعة یراها حسنة فقد زعم ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالة لان اللہ تعالیٰ یقول الیوم اکملت لکم دینکم فما لم یکن یومئذٍ دیناً لا یکون الیوم دینا۔

(اعتصام ۱/۴۸)

فاروقؓ کے ارشاد یا بعض بزرگوں کے ایسے کلمات کی آڑ لے کر طرح طرح کی بدعتیں بدعت حسنہ کے نام سے ایجاد کرنے والوں کے لیے اس میں کوئی وجہ جواز نہیں ہے، بلکہ جو چیز اصطلاح شرع میں بدعت ہے وہ مطلقاً ممنوع و ناجائز ہے۔ البتہ بدعات میں پھر کچھ درجات ہیں، بعض سخت حرام قریب شرک کے ہیں، بعض مکروہ تحریمی بعض تنزیہی۔ (جواہر الفقہ ۶/۴۶۴)

بدعت کی جامع تعریف

بدعت لغت میں ہر نئے کام کو کہتے ہیں خواہ عادت ہو یا عبادت، جن لوگوں نے یہ معنی لیے ہیں انہوں نے بدعت کی تقسیم دو قسم میں کی ہے، سیئہ اور حسنہ۔ جن فقہاء کے کلام میں بعض بدعت حسنہ کہا گیا ہے وہ اس معنی لغوی کے اعتبار سے بدعت ہیں، ورنہ درحقیقت بدعت نہیں۔

اور معنی شرعی بدعت کے یہ ہیں کہ دین میں کسی کام کو زیادہ یا کم کرنا جو قرنِ صحابہ، تابعین کے بعد ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے کرنے کی اجازت منقول نہ ہو، نہ قولاً نہ فعلاً نہ صراحۃً، نہ اشارۃً۔ (امداد المفتین ۲/۱۵۵)

سنت اور بدعت کے حدود

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات، معاملات اور معاشرت سب ہی چیزوں میں اپنے قول وعمل سے اعتدال کی حدود و مقرر فرما دی ہیں اور ان سے پیچھے

رہنا کوتاہی اور آگے بڑھنا گمراہی ہے، اسی لیے آپ نے بدعات اور محدثات کو بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے، ارشاد فرمایا:

"كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ".

یعنی ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔

بدعت اسی چیز کو کہا جاتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل میں صراحۃً یا اشارۃً موجود نہ ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے لکھا ہے کہ اسلام میں بدعت کو اس لیے سخت جرم قرار دیا کہ وہ تحریف دین کا راستہ ہے، پچھلی امتوں میں یہی ہوا کہ انہوں نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تعلیمات پر اپنی طرف سے اضافے کر لیے اور ہر آنے والی نسل ان میں اضافہ کرتی رہی، یہاں تک کہ یہ پتہ نہ رہا کہ اصل دین کیا تھا، اور لوگوں کے اضافے کیا ہیں۔ (معارف القرآن ۶۲۱/۲ سورۂ نساء)

بِرّ (نیکی) کی تعریف

بِرّ بکسر الباء عربی زبان میں مطلق خیر کے معنی میں ہے، جو تمام ظاہری اور باطنی طاعات وخیرات کو جامع ہے اور اوّل آیات میں الفاظ جامعہ سے کلی اور اصولی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً ایمان بالکتاب وایتاء مال ووفاء عہد وصبر حین الباس وغیرہ جس میں قرآنی تمام احکام کے بنیادی اصول آ گئے، کیونکہ شریعت کے سہل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں، عقائد، اعمال، اخلاق، باقی تمام جزئیات انہیں کلیات کے تحت میں داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں قسم کے بڑے بڑے شعبے آ گئے۔

آگے اس بر کی تفصیل چلی ہے جس میں سے بہت سے احکام با قتضائے وقت ومقام مثل قصاص ووصیت وروزہ وجہاد، حج وانفاق وحیض وایلاء ویمین وطلاق ونکاح وعدت ومہر وتکرار ذکر جہاد، وانفاق فی سبیل اللہ، وبعض معاملات بیع وشراء وشہادت

بقدر ضرورت بیان فرما کر بشارت و وعدہ و رحمت و مغفرت پر ختم فرما دیا، سبحان اللہ! کیا بلیغ ترتیب ہے، پس چونکہ ان مضامین کا حاصل برّ کا بیان ہے اجمالاً و تفصیلاً اس لیے اگر اس مجموعہ کا لقب ابواب البرّ رکھا جائے تو نہایت زیبا ہے۔ واللہ الموفق۔

(معارف القرآن ۱/۴۲۷، سورۂ بقرہ پ۲)

برّ اور تقویٰ، اثم کی تعریف

بر و تقویٰ کے دو لفظ اختیار فرمائے، جمہور مفسرین نے بر کے معنی اس جگہ فعل الخیرات یعنی نیک عمل قرار دیئے ہیں، اور تقویٰ کے معنی ترک المنکرات یعنی برائیوں کا ترک بتلائے ہیں، اور لفظ اثم مطلق گناہ اور معصیت کے معنی میں ہے، خواہ وہ حقوق سے متعلق ہو یا عبادات سے اور عُدوان کے لفظی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، مراد اس سے ظلم و جور ہے۔ (معارف القرآن ۳/۲۵، سورہ مائدہ پ۶)

برزخ کی تعریف

''برزخ'' کے لفظی معنیٰ حاجز اور فاصل کے ہیں، دو حالتوں یا دو چیزوں کے درمیان جو چیز فاصل ہو اس کو برزخ کہتے ہیں، اس لئے موت کے بعد قیامت اور حشر تک کے زمانہ کو برزخ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیاوی حیات اور آخرت کی حیات کے درمیان حد فاصل ہے۔ (معارف القرآن سورہ مومنون پ۱۸، ص۳۳۱ ج۶)

برزخی زندگی کی تعریف

ثُمَّ یُمِیتُکُم ثُمَّ یُحیِیکُم (سورہ البقرہ پ۱)

اس آیت میں دنیا کی زندگی اور موت کے بعد صرف ایک حیات کا ذکر ہے جو قیامت کے روز ہونے والی ہے، قبر کی زندگی جس کے ذریعہ قبر کا سوال و جواب

اور قبر میں ثواب وعذاب ہونا قرآن کریم کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے ثابت ہے اس کا ذکر نہیں، وجہ یہ ہے کہ یہ برزخی زندگی اس طرح کی زندگی نہیں ہے جو انسان کو دنیا میں حاصل ہے، یا آخرت میں پھر ہوگی، بلکہ ایک درمیانی صورت مثلِ خواب کی زندگی کے ہے، اس کو دنیا کی زندگی کا تکملہ بھی کہا جاسکتا ہے اور آخرت کی زندگی کا مقدمہ بھی، اس لئے کوئی مستقل زندگی نہیں جس کا جداگانہ ذکر کیا جائے۔

(معارف القرآن سورہ البقرہ پ ا،ص ۳۷۱ ج ۱)

برزخی زندگی کے مختلف درجات اور شہید کی تعریف

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُّقتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَموَات بَل اَحيَاءٌ وَلٰكِن لَا تَشعُرُون (سورہ البقرہ پ ا)

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی رو سے ہر مرنے والے کو برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ قبر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مومن وکافر یا صالح وفاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات ہیں، ایک درجہ تو سب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجے انبیاء وصالحین کیلئے مخصوص ہیں اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلے کی تحقیق پر علماء کے مقالات وتحقیقات بے شمار ہیں لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب والسنہ ہے اور شبہات سے پاک ہے، اس کو سیدی حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے بیان القرآن میں واضح فرمادیا ہے اس جگہ اسی کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

فائدہ: ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں، اور اس کی نسبت کو گو یہ کہنا کہ وہ مرگیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی

حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے، اور اسی سے جزا و سزا کا ادراک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مردوں سے ایک دو گونہ امتیاز ہے، اور وہ امتیاز یہ ہے کہ اس کی یہ حیات آثار میں اوروں سے قوی ہے جیسے انگلیوں کے اگلے پوروے اور ایڑی، اگر چہ دونوں میں حیات ہے، اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن انگلیوں کے پورووں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثار حیات عام مردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلاف معمولی مردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے، کہ اس کا جسم باوجود مجموعہ گوشت پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسم زندہ کے صحیح سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیاء کہا گیا ہے، اور ان کو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی، مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مردوں کی طرح ہیں ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہے، اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، یہاں تک سلامت جسم کے علاوہ اس حیات برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی ان کی ازواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آسکتیں، پس اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں پھر شہداء اور عام مردے، البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء وصالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں سو مجاہدہ نفس میں مرنے کو بھی معناً شہادت میں داخل سمجھیں گے، اس طور پر وہ بھی شہداء ہو گئے، یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام قرون کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہم رتبہ دوسرے لوگ صالحین وصدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

(معارف القرآن ص ۳۹۷، ج ۱، سورہ بقرہ پ ۲)

برقع کی تعریف اور ستر وحجاب کا فرق

ستر عورت اور حجاب نساء یہ دو مسئلے الگ الگ ہیں، ستر عورت ہمیشہ سے فرض ہے، حجاب نساء ۵ھ میں فرض ہوا، ستر عورت مرد و عورت دونوں پر فرض ہے اور حجاب صرف عورتوں پر، ستر عورت لوگوں کے سامنے اور خلوت دونوں میں فرض ہے، حجاب صرف اجنبی کی موجودگی میں، یہ تفصیل اس لئے لکھی گئی کہ ان دونوں مسئلوں کو خلط ملط کر دینے سے بہت سے شبہات مسائل واحکام قرآن کے سمجھنے میں پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں ستر عورت سے باجماع مستثنیٰ ہیں اسی لئے نماز میں چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی ہوں تو نماز بالاتفاق وباجماع جائز ہے، چہرہ اور ہتھیلیاں تو از روئے نص مستثنیٰ ہیں، قدمین کو فقہاء نے ان پر قیاس کر کے مستثنیٰ قرار دیا ہے، لیکن اجنبی مردوں سے پردے میں بھی چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔

ضرورت کے مواقع میں جب عورت کو گھر سے باہر جانا پڑے تو اس وقت کسی برقع یا لمبی چادر کو سر سے پیر تک اوڑھ کر نکلنے کا حکم ہے، جس میں بدن کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو، یہ سورہ احزاب کی اس آیت سے ثابت ہے جو آگے آرہی ہے یَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّأَزۡوَٰجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ يُدۡنِينَ عَلَيۡهِنَّ مِن جَلَٰبِيبِهِنَّ یعنی اے نبی آپ اپنی ازواج مطہرات اور بنات طاہرات کو اور عام مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیں کہ اپنی جلباب استعمال کریں، جلباب اس لمبی چادر کو کہتے ہیں جس میں عورت سر سے پیر تک مستور ہو جائے (روی ذٰلک عن ابن عباس)

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس سے استعمالِ جلباب کی صورت یہ نقل کی ہے کہ عورت سر سے پاؤں تک اس میں لپٹی ہوئی ہو اور چہرہ اور ناک بھی اس سے مستور ہو، صرف ایک آنکھ راستہ دیکھنے کیلئے کھلی ہو، اس آیت کی پوری

تفسیر آگے آتی ہے، یہاں صرف یہ بتلانا منظور ہے کہ ضرورت کے وقت جب عورت گھر سے نکلنے پر مجبور ہو تو اسکو پردہ کا یہ درجہ اختیار کرنا ضروری ہے کہ جلباب وغیرہ میں سر سے پاؤں تک مستور ہو اور چہرہ بھی بجز ایک آنکھ کے چھپا ہوا ہو۔

(معارف القرآن ص ۲۱۳، ۲۱۷، ج ۷، سورہ احزاب پ ۲۲)

تنبیہ: امام جصاصؒ نے فرمایا کہ جب (عورت کیلئے) زیور کی آواز تک کو قرآن نے اظہار زینت میں قرار دے کر ممنوع کیا ہے تو مزین رنگوں کے کامدار برقعے پہن کر نکلنا بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوں گا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا چہرہ اگر چہ ستر میں داخل نہیں مگر وہ زینت کا سب سے بڑا مرکز ہے اسلئے اسکا بھی غیر محرموں سے چھپانا واجب ہے الا بضرورۃ (جصاص)

(معارف القرآن ص ۴۰۶، ج ۶، سورہ نور، پ ۱۸)

برکت کی تعریف

برکت کے معنی ہیں بڑھنا اور ثابت رہنا، پھر کسی چیز کا بڑھنا اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا وجود کھلے طور پر مقدار میں بڑھ جائے، اور اس طرح بھی کہ اگر چہ اس کی مقدار میں کوئی خاص اضافہ نہ ہو، لیکن اس سے کام اتنے نکلیں جتنے عادۃً اس سے زائد سے نکلا کرتے ہیں، اس کو بھی معنوی طور پر زیادتی کہا جا سکتا ہے۔

(معارف القرآن ۲/ ۱۱۷، سورہ آل عمران پ ۴)

تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (سورہ فرقان پ: ۱۸)

تبارک برکت سے مشتق ہے، برکت کے معنی خیر کی کثرت کے ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہر خیر و برکت اللہ کی طرف سے ہے۔

(معارف القرآن ۶/ ۴۴۵ سورہ فرقان پ: ۱۸)

برکت کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں آسمان اور زمین کی برکتوں سے مراد یہ ہے

کہ ہر طرح کی بھلائی ہر طرف سے ان کے لیے کھول دیتے، آسمان سے پانی ضرورت کے مطابق وقت پر برستا، زمین سے ہر چیز خواہش کے مطابق پیدا ہوتی، پھر ان چیزوں سے نفع اٹھانے اور راحت حاصل کرنے کے سامان جمع کر دیئے جاتے، کہ کوئی پریشانی اور فکر لاحق نہ ہوتی جس کی وجہ سے بڑی سے بڑی نعمت مکدر ہو جاتی ہے، ہر چیز میں برکت یعنی زیادتی ہوتی ہے۔

پھر برکت کا ظہور دنیا میں دو طرح سے ہوتا ہے، کبھی تو اصل چیز واقع میں بڑھ جاتی ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں ایک معمولی برتن کے پانی سے پورے قافلہ کا سیراب ہونا، یا تھوڑے سے کھانے سے ایک مجمع کا شکم سیر ہو جانا روایات صحیحہ میں مذکور ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ ظاہری طور پر اس چیز میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی مقدار اتنی ہی رہی جتنی تھی، لیکن اس سے کام اتنے نکلے جتنے اس سے دوگنی چوگنی چیز سے نکلتے، اور اس کا مشاہدہ عام طور سے کیا جاتا ہے کہ کوئی برتن کپڑا گھر یا گھر کا سامان ایسا مبارک ہوتا ہے کہ اس سے عمر بھر آدمی راحت اٹھاتا ہے، اور وہ پھر بھی قائم رہتا ہے اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بناتے ہی ٹوٹ گئیں یا سالم بھی ہیں مگر ان سے نفع اٹھانے کا موقع ہاتھ نہ آیا یا نفع بھی اٹھایا لیکن پورا نفع نہ اٹھا سکے۔

اور یہ برکت انسان کے مال میں بھی ہوتی ہے جان میں بھی، کام میں بھی، اور وقت میں بھی، بعض مرتبہ ایک لقمہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی قوت وصحت کا سبب بن جاتا ہے، اور بعض اوقات بڑی سے بڑی طاقت ور غذا اور دوا کام نہیں دیتی، اسی طرح بعض وقت میں برکت ہوتی ہے تو ایک گھنٹہ میں اتنا کام ہو جاتا ہے کہ دوسرے اوقات میں چار گھنٹوں میں بھی نہیں ہوتا۔ ان سب صورتوں میں اگرچہ مقدار کے اعتبار سے نہ مال بڑھا ہے نہ وقت مگر برکت کا ظہور اس طرح ہوا کہ اس سے کام بہت نکلے۔

(معارف القرآن ص ۱۴، ج ۵، سورہ اعراف پ ۹)

تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ،اس میں لفظ تبارک برکت سے بنا ہے،اور لفظ برکت بڑھنے ،زیادہ ہونے ،ثابت رہنے وغیرہ کے کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس جگہ لفظ تبارک کے معنیٰ بلند وبالا ہونے کے ہیں، جو بڑھنے کے معنیٰ سے لیا جاسکتا ہے،اور ثابت رہنے کے معنیٰ سے بھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ قائم اور ثابت بھی ہیں، اور بلندوبالا بھی، بلند ہونے کے معنیٰ کی طرف حدیث کے ایک جملہ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے:تَبَارَکْتَ وَتَعَالَیْتَ،یَاذَالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام ، یہاں تبارکت کی تفسیر تعالیت کے لفظ سے کردی گئی ہے۔ (معارف القرآن ج۳/ ۵۷۵،اعراف:پ۸)

بروج وسماء کی تعریف

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجاً (سورہ فرقان پ۱۹)

بروج بُرُج کی جمع ہے، جو بڑے محل اور قلعہ وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے، ائمہ تفسیر مجاہد قتادہ وغیرہ نے اس جگہ بروج کی تفسیر بڑے ستاروں سے کی ہے، اور اس آیت میں جوان بڑے ستاروں کا آسمان میں پیدا کرنا ارشاد ہے، یہاں آسمان سے مراد فضاءِ آسمانی ہے، جس کو آج کل اصطلاح میں خلاء کہا جاتا ہے، اور لفظ سماء کا دونوں معنیٰ میں اطلاق عام ومعروف ہے، جِرمِ آسمان کو بھی سماء کہا جاتا ہے اور آسمان سے بہت نیچے جو فضائے آسمانی ہے اس کو بھی قرآن کریم میں جابجا لفظ سماء سے تعبیر کیا گیا ہے۔(معارف القرآن ۲۸۶،ج ۵،سورہ حجر)

جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجاً کے الفاظ سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بروج یعنی سیارے آسمانوں کے اندر ہیں کیونکہ حرف فی ظرفیت کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔اول تو یہ کہ قرآن کریم میں لفظ سماء جس طرح اس عظیم الشان اور وہم وگمان سے زائد وسعت رکھنے والی مخلوق کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں قرآن کی تصریحات کے مطابق دروازے ہیں اور

دروازوں پر فرشتوں کے پہرے ہیں جو خاص خاص اوقات میں کھولے جاتے ہیں اور جن کی تعداد قرآن کریم نے سات بتلائی ہے، اسی طرح یہ لفظ سماء ہر بلند چیز جو آسمان کی طرف ہو اس پر بھی بولا جاتا ہے، آسمان وزمین کے درمیان کی فضاء اور اس سے آگے جس کو آج کل کی اصطلاح میں خلاء بولتے ہیں یہ سب دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے لفظ سماء کے مفہوم میں داخل ہیں، وَاَنْزَلنَامِنَ السَّمَآءِ مَاءً طَهُوْراً اور اسی طرح کی دوسری آیتیں جن میں آسمان سے پانی برسانے کا ذکر ہے، ان کو اکثر مفسرین نے اسی دوسرے معنیٰ پر محمول فرمایا ہے کیونکہ عام مشاہدات سے بھی یہ ثابت ہے کہ بارش اِن بادلوں سے برستی ہے، جو آسمان کی بلندی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے، قرآن مجید کی اِن واضح تصریحات اور عام مشاہدات کی بناء پر جن آیات قرآن میں بارش کا آسمان سے برسانا مذکور ہے اُن میں بھی اکثر مفسرین نے لفظ سماء کے یہی دوسرے معنیٰ لئے ہیں یعنی فضاء آسمانی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن کریم اور لغت کی تصریحات کے مطابق لفظ سماء فضاء آسمانی کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور خود جرم آسمان کے لئے بھی، تو ایسی صورت میں جن آیات میں کواکب اور سیارات کے لئے فی السماء کا لفظ استعمال ہوا ہے اُن کے مفہوم میں دونوں احتمال موجود ہیں کہ یہ کواکب اور ستارے جرم آسمان کے اندر ہوں یا فضائے آسمانی میں آسمانوں کے نیچے ہوں، اور دو احتمالوں کے ہوتے ہوئے کوئی قطعی فیصلہ قرآن کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن نے ستاروں اور سیاروں کو آسمان کے اندر قرار دیا ہے یا اُن سے باہر فضائے آسمانی میں، بلکہ الفاظ قرآنی کے اعتبار سے دونوں صورتیں ممکن ہیں، کائنات کی تحقیقات اور تجربہ اور مشاہدے سے جو صورت بھی ثابت ہوجائے قرآن کی کوئی تصریح اس کے منافی نہیں ہے۔

علماء اہل حق قدیم وجدید اس پر متفق ہیں کہ ان مسائل کے متعلق جو بات قرآن

کریم سے یقینی طور پر ثابت ہے۔ اگر کوئی قدیم یا جدید نظریہ اس سے مختلف ہو تو اس کی وجہ سے قرآنی آیات میں کھینچ تان اور تاویل جائز نہیں، اس نظریہ ہی کو مغالطہ قرار دیا جائے گا، البتہ جن مسائل میں قرآن کریم کی کوئی تصریح موجود نہیں الفاظ قرآنی میں دونوں معنیٰ کی گنجائش ہے وہاں اگر مشاہدات اور تجربہ سے کسی ایک نظریہ کو قوت حاصل ہو جائے تو آیت قرآنی کو بھی اُسی معنیٰ پر محمول کر لینے پر کوئی مضائقہ نہیں، جیسے اسی آیت جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوجاً میں ہے کہ قرآن کریم نے اس بارے میں کوئی واضح فیصلہ نہیں دیا کہ ستارے آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضائے آسمانی میں ہیں۔

قرآن کریم کی آیت كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ سے ستاروں کا حرکت کرنا ثابت ہے تو اس معاملے میں بطلیموسی نظریہ کو غلط قرار دیا جائے گا جس کی رو سے ستارے آسمان کے جِرم میں پیوست ہیں وہ خود حرکت نہیں کرتے بلکہ آسمان کی حرکت کے تابع اُن کی حرکت ہوتی ہے۔

(معارف القرآن ۴۸۸، ۴۹۱، ج ۶، سورہ فرقان پ ۱۹)

برہان کا مصداق

برہان سے کیا مراد ہے: قولہ تعالیٰ: قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ، برہان کے لفظی معنی دلیل کے ہیں، اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ (روح)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو لفظ بُرہان سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ آپ کی ذات مبارک اور آپ ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ، آپ ﷺ کے معجزات اور آپ ﷺ پر کتاب کا نزول، یہ سب چیزیں آپ ﷺ کی نبوت اور آپ کی رسالت کے کھلے کھلے دلائل ہیں، جن کو دیکھنے کے بعد کسی اور دلیل کی احتیاج باقی نہیں

رہتی، تو یوں سمجھنا چاہئے کہ آپ کی ذات خود ہی ایک مجسم دلیل ہے۔

(معارف القرآن ۲/۶۲۵، سورۂ نساء پ ۶)

بشارت کی تعریف

لفظ بشارت بمعنیٰ خوشخبری ایسی خبر دینی کو کہا جاتا ہے جس کو سن کر انسان کے چہرہ بشرہ پر خوشی کے آثار نمایاں ہو جائیں (معارف القرآن ص ۱۱۰، ج ۱، بقرہ، پ ۱)

بصیرت اور بصائر کی تعریف

بصائر بصیرت کی جمع ہے جس کے لفظی معنیٰ تو دانش بینش کے ہیں، مراد اس سے وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ انسانوں کے قلوب میں پیدا فرماتے ہیں جن سے وہ حقائقِ اشیاء کو دیکھ سکے اور حق و باطل کا امتیاز کر سکے۔

(معارف القرآن سورہ قصص پ ۲۰، ص ۶۴۲ ج ۶)

بصیر اور بصیرۃ کے معنیٰ دیکھنے والے کے بھی آتے ہیں اور بصیرت کے معنیٰ حجت کے بھی آتے ہیں جیسے قرآن کریم میں ہے: قد جاءکم بصائر من ربکم، اس میں بصائر بصیرہ کی جمع ہے اور معنیٰ اسکے حجت کے ہیں، اور معاذیر معذار بمعنیٰ عذر کی جمع ہے۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۶۰۸ سورہ قیامہ پ ۲۹)

بطن مکہ کی تعریف

اس لفظ کے اصلی معنٰی عین مکہ کے ہیں، مگر یہاں اس سے مراد مقام حدیبیہ ہے اس کو مکہ مکرمہ سے بہت متصل ہونے کی بناء پر بطنِ مکہ سے تعبیر کر دیا گیا ہے اور اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے جو حنفیہ نے اختیار کی ہے کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں داخل ہے۔

(معارف القرآن ص ۸۶، ج ۸، سورہ فتح پ ۲۶)

بغی وبغاوت کی تعریف

لفظ ''بغی'' چند معانی کے لئے آتا ہے، مشہور معنیٰ ظلم کے ہیں یہاں یہ معنیٰ بھی مراد سکتے ہیں کہ اس نے (قارون نے) اپنے مال ودولت کے نشے میں دوسروں پر ظلم کرنا شروع کیا۔ (معارف القرآن سورہ قصص پ۲۰، ص۶۶۵ ج۶)

بقعۂ مبارکہ کی تعریف

کوہِ طور کے اُس مقام کو قرآن کریم نے بُقعہ مبارکہ فرمایا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اس کے مبارک ہونے کا سبب یہ تجلی خداوندی ہے جو اس مقام پر بشکلِ نار دکھائی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ جس مقام میں کوئی نیک عمل اہم واقع ہوتا ہے وہ مقام بھی متبرک ہوجاتا ہے۔ (معارف القرآن ص۶۳۴، ج۶، سورہ قصص)

بلاء کی تعریف

بلاء کے لفظی معنیٰ امتحان کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا امتحان کبھی مصیبت ومشقت میں مبتلاء کر کے ہوتا ہے، اور کبھی راحت ودولت دے کر، بلاء حسن اس امتحان کو کہا گیا ہے جو راحت دولت اور فتح ونصرت دے کر لیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس کو ہمارا انعام سمجھ کر شکر گذار ہوتے ہیں یا اس کو اپنی ذاتی قابلیت کا اثر سمجھ کر فخر وناز میں مبتلاء ہوجاتے اور اپنے عمل کو برباد کردیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی کے فخر وناز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (معارف القرآن سورہ انفال پ۹، ص۲۰۳ ج۴)

بیت اللہ کی تعریف

امام تفسیر مجاہد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی جگہ کو پوری زمین سے دو ہزار سال پہلے بنایا ہے اور اس کی بنیادیں ساتویں زمین کے اندر تک پہنچی ہوئی

ہیں اور مسجد اقصیٰ کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے۔

(رواہ النسائی باسناد صحیح عن عبداللہ بن عمرؓ تفسیر قرطبی س ۱۳۷، ج ۴، معارف القرآن ج ۵ ص ۴۴۳)

بیت عتیق کی تعریف

یہاں بیت عتیق سے مراد پورا حرم شریف ہے جو درحقیقت بیت اللہ ہی کا حریم خاص ہے جیسے سابقہ آیت میں مسجد حرام کے لفظ سے پورا حرم مراد لیا گیا ہے، یہاں بیت عتیق کے لفظ سے بھی پورا حرم مراد ہے۔ (معارف القرآن ۶/۲۶۳ سورۂ حج)

بیتِ معمور کی تعریف

بیت معمور آسمان میں فرشتوں کا کعبہ ہے، دنیا کے کعبہ کے بالمقابل ہے، صحیحین کی احادیث میں ثابت ہے کہ شب معراج میں رسول اللہ ﷺ جب ساتویں آسمان پر پہنچے تو آپ کو بیت معمور کی طرف لے جایا گیا، جس میں ہر روز ستّر ہزار فرشتے عبادت کے لئے داخل ہوتے ہیں، پھر کبھی ان کو دوبارہ یہاں پہنچنے کی نوبت نہیں آتی (کیونکہ ہر روز دوسرے نئے فرشتوں کا نمبر ہوتا ہے) ابن کثیر۔

بیت معمور ساتویں آسمان کے رہنے والے فرشتوں کا کعبہ ہے، اسی لئے شبِ معراج میں رسول اللہ ﷺ جب بیت معمور پر پہنچے تو دیکھا کہ ابراہیم علیہ السلام اس کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، چونکہ وہ دنیا کے کعبہ کے بانی تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی جزاء میں آسمان کے کعبہ سے بھی ان کا خاص تعلق قائم کر دیا۔

ابن کثیر (معارف القرآن ص ۱۷۹، ج ۸، سورہ طور)

بیضاء کی تعریف

بیضاء کے لفظی معنی سفید کے ہیں، اور ہاتھ کا سفید ہو جانا کبھی برص کی بیماری کے سبب بھی ہوا کرتا ہے، اس لیے ایک دوسری آیت میں اس جگہ من غیر سوء کا لفظ

بھی آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہاتھ کی سفیدی کسی بیماری کے سبب نہ تھی، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفیدی بھی معمولی سفیدی نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ روشنی ہوتی تھی، جس سے ساری فضا روشن ہو جاتی تھی۔

(قرطبی، معارف القرآن ۴/۴۵، سورہ اعراف پ ۹)

بیعت کی تعریف

انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء و مشائخ میں بھی جو بیعت لینے کا دستور رہا ہے وہ بھی اسی سنت الٰہیہ کا اتباع ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے صحابہ کرام سے بیعت لی، جن میں سے بیعت رضوان کا تذکرہ قرآن کریم میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے "لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" یعنی اللہ راضی ہو گیا ان لوگوں سے جنہوں نے ایک خاص درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، ہجرت سے پہلے انصار مدینہ کی بیعت عقبہ بھی اسی قسم کے معاہدات میں سے ہے، بہت سے صحابہ کرام سے ایمان اور عمل صالح کی پابندی پر بیعت لی۔

صوفیائے کرام میں جو بیعت مروج ہے وہ بھی ایمان اور عمل صالح کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کے اہتمام کا عہد ہے اور اسی سنت اللہ اور سنت الانبیاء کا اتباع ہے، اسی وجہ سے اس میں خاص برکات ہیں کہ انسان کو گناہوں سے بچنے اور احکام شرعیہ بجالانے کی ہمت اور توفیق بڑھ جاتی ہے، بیعت کی حقیقت معلوم ہونے سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جس طرح کی بیعت عام طور پر ناواقف جاہلوں میں رواج پا گئی ہے کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دینے ہی کو نجات کے لیے کافی سمجھ بیٹھتے ہیں یہ سراسر جہالت ہے، بیعت ایک معاہدہ کا نام ہے، اس کا فائدہ جبھی ہے جب اس معاہدہ کو عملاً پورا کیا جائے ورنہ وبال کا خطرہ ہے۔

(معارف القرآن ۴/۱۱۱، سورہ اعراف پ ۹)

بہیمیت کی تعریف

''اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ'' لفظ بہیمہ ان جانوروں کے لیے بولا جاتا ہے جن کو عادۃً غیر ذوی العقول سمجھا جاتا ہے، کیونکہ لوگ ان کی بولی کو عادۃً نہیں سمجھتے، تو ان کی مراد مبہم رہتی ہے، اور امام شعرانیؒ نے فرمایا کہ بہیمہ کو بہیمہ اس لیے نہیں کہتے کہ اس کو عقل نہیں اور عقل کی باتیں اس پر مبہم رہتی ہیں، جیسا کہ لوگوں کا عام خیال ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عقل وادراک سے کوئی جانور بلکہ کوئی شجر وحجر بھی خالی نہیں، ہاں درجات کا فرق ضرور ہے، ان چیزوں میں اتنی عقل نہیں ہے جتنی انسان میں، اسی لیے انسان کو احکام کا مکلّف بنایا گیا ہے، جانوروں کو مکلّف نہیں بنایا گیا، ورنہ اپنی ضروریات زندگی کی حد تک ہر جانور بلکہ ہر شجر وحجر کو حق تعالیٰ نے عقل وادراک بخشا ہے، یہی تو وجہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے، ''وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ'' عقل نہ ہوتی تو اپنے خالق ومالک کو کس طرح پہچانتی اور کس طرح تسبیح کرتی۔

امام شعرانی کے فرمانے کا خلاصہ یہ ہے کہ بہیمہ کو بہیمہ اس لیے نہیں کہتے کہ اس کی بے عقلی کے سبب معلومات اس پر مبہم رہتے ہیں بلکہ اس لیے کہ اس کی بولی لوگ نہیں سمجھتے، اس کا کلام لوگوں پر مبہم رہتا ہے، بہرحال لفظ بہیمہ ہر جاندار کے لیے بولا جاتا ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چوپایہ جانداروں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(معارف القرآن ۱۳/۳، سورہ مائدہ پ ۶)

تجسّس و تحسُّس کی تعریف

تجسس یعنی کسی کے عیب کی تلاش اور سراغ لگانا ہے اس میں قرائتیں دو ہیں ایک لا تَجَسَّسُوْا بالجیم دوسرے لا تَحَسَّسُوْا بالحاء۔اور حدیث صحیحین میں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے یہ دونوں لفظ آئے ہیں۔

ارشاد ہے ’’لا تَجَسَّسُوْا لا تَحَسَّسُوْا ‘‘اور ان دونوں لفظوں کے معنی متقارب ہیں، اخفش نے دونوں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ تجسس بالجیم کسی ایسے امر کی جستجو اور تلاش کو کہا جاتا ہے جس کو لوگوں نے آپ سے چھپایا ہو، اور تحسس بالحاء مطلق تلاش اور جستجو کے معنی میں آتا ہے۔سورہ یوسف میں تَحَسَّسُوْا مِنْ یُوْسُفَ وَاَخِیْهِ اسی معنی کے لیے آیا ہے۔ (معارف القرآن سورہ حجرات پ:۲۶،۱۲۰/۸)

تجلّی کی تعریف

’’تجلّی‘‘ کے معنیٰ عربی لغت میں ظاہر اور منکشف ہونے کے ہیں اور صوفیاء کرام کے نزدیک تجلّی کے معنیٰ کسی چیز کو بالواسطہ دیکھنے کے ہیں، جیسے کوئی چیز بواسطۂ آئینہ کے دیکھی جائے، اسی لئے تجلّی کو رؤیت نہیں کہہ سکتے، خود اسی آیت میں اس کی شہادت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رؤیت کی تو نفی فرمائی ہے اور تجلّی کا اثبات۔

(معارف القرآن سورہ اعراف پ۹،ص۶۲ ج۴)

تحریف لفظی ومعنوی کی تعریف

تیسری بُری خصلت ان لوگوں کی (یعنی یہودیوں کی) یہ بیان فرمائی کہ یہ لوگ اللہ کے کلام کو اس کے موقع سے ہٹا کر غلط معنیٰ پہناتے اور احکام خدا تعالیٰ کی تحریف کرتے ہیں، اس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ تورات کے الفاظ میں کچھ ردّ وبدل کردیں، اور یہ بھی کہ الفاظ تو وہی رہیں ان کے معنیٰ میں لغو قسم کی تاویل وتحریف کریں، یہودی ان دونوں قسموں کی تحریف کے عادی ہیں۔

مسلمانوں کیلئے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے، اس میں لفظی تحریف کی تو کوئی جرأت نہیں کرسکتا کہ لکھے ہوئے صحیفوں کے علاوہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ کلام میں ایک زیر وزبر کی غلطی کوئی کرتا ہے تو فوراً پکڑا جاتا ہے۔

معنوی تحریف بظاہر کی جاسکتی ہے اور کرنے والوں نے کی بھی ہے، مگر اس کی حفاظت کیلئے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمادیا ہے کہ اس امت میں قیامت تک ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو قرآن وسنت کے صحیح مفہوم کی حامل ہوگی اور تحریف کرنے والوں کی قلعی کھول دے گی۔ (معارف القرآن ص ۱۵۰، ج ۳ سورہ مائدہ پ ۶)

تحیّہ وحیّاک اللہ کی تعریف

''تحیّہ'' کے لفظی معنیٰ ہیں کسی کو ''حیاک اللہ'' کہنا، یعنی اللہ تم کو زندہ رکھے، قبل از اسلام عرب کی عادت تھی کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو ''حیاک اللہ'' یا ''انعم اللہ بک عینا'' یا ''انعم صباحا'' وغیرہ الفاظ سے سلام کیا کرتے تھے، اسلام نے اس طرز تحیّہ کو بدل کر ''السلام علیکم'' کہنے کا طریقہ جاری کیا، جس کے معنیٰ ہیں، تم ہر

تکلیف اور رنج و مصیبت سے سلامت رہو۔

(معارف القرآن سورہ نساء پ۲،ص ۵۰۱ ج ۲)

تحیّہ عرف میں اس کلمہ کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ کسی آنے والے یا ملنے والے شخص کا استقبال کیا جاتا ہے، جیسے ''سلام'' یا ''خوش آمدید'' یا ''اہلاً وسہلاً'' وغیرہ اللہ جل شانہ کی طرف سے یا فرشتوں کی طرف سے اہل جنت کا تحیّہ لفظ ''سلام'' سے ہوگا، یعنی یہ خوشخبری کہ تم ہر تکلیف اور ناگوار چیز سے سلامت رہو گے، سلام کا لفظ اگرچہ دنیا میں دعاء ہے لیکن جنت میں پہونچ کر تو ہر مطلب حاصل ہوگا، اس لئے وہاں یہ لفظ دعا کے بجائے خوشخبری کا کلمہ ہوگا۔

(معارف القرآن سورہ یونس پ ۱۱، ص ۵۱۲ ج ۴)

ترتیل کی تعریف اور اس کے معنی

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا۔ (سورہ مزّمل پ ۲۹)

ترتیل کے لفظی معنی کلمہ کو سہولت اور استقامت کے ساتھ منھ سے نکالنے کے ہیں۔ (مفردات، امام راغب)

مطلب آیت کا یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن میں جلدی نہ کریں بلکہ ترتیل وتسہیل کے ساتھ ادا کریں، اور ساتھ ہی اس کے معانی میں تدبر وغور کریں۔ (قرطبی)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کا صرف پڑھنا مطلوب نہیں بلکہ ترتیل مطلوب ہے جس میں ہر ہر کلمہ صاف صاف اور صحیح ادا ہو۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح ترتیل فرماتے تھے، حضرت ام سلمہؓ سے بعض لوگوں نے رات کی نماز میں آپ کی تلاوتِ قرآن کی کیفیت دریافت کی تو انھوں نے نقل کر کے بتلایا جس میں ایک ایک حرف واضح تھا۔

(ترمذی، ابوداؤد از مظہری)

ترتیل میں تحسین صوت یعنی بقدر اختیار خوش آوازی سے پڑھنا بھی شامل ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی کی قرأت وتلاوت کو ایسا نہیں سنتا جیسا اس نبی کی تلاوت کو سنتا ہے جو خوش آوازی کے ساتھ جہراً تلاوت کرے۔ (مظہری)

حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حسن صوت کے ساتھ تلاوت کرتے دیکھا تو فرمایا ''**لقد رتل القرآن فداہ ابی و امی**'' یعنی اس شخص نے قرآن کی ترتیل کی ہے، میرے ماں باپ اس پر قربان ہوں۔ (قرطبی)

اور اصل ترتیل وہی ہے کہ حروف والفاظ کی ادائیگی بھی صحیح اور صاف ہو، اور پڑھنے والا اس کے معانی پر غور کرکے اس سے متاثر بھی ہو رہا ہو، جیسا کہ حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک شخص پر ہوا جو قرآن کی ایک آیت پڑھ رہا تھا اور رو رہا تھا آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم نے اللہ کا یہ حکم سنا ہے **وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا**، بس یہی ترتیل ہے جو یہ شخص کر رہا ہے۔

(قرطبی، معارف ۵۹۱/۸، سورہ مزّمل پ:۲۹)

تزکیہ وتصوف کی تعریف

''تزکیہ'' کے معنی ہیں ظاہری و باطنی نجاسات سے پاک کرنا، ظاہری نجاسات سے تو عام مسلمان واقف ہیں، باطنی نجاست کفر اور شرک، غیر اللہ پر اعتماد کلی اور اعتقاد فاسد، نیز تکبر وحسد، بغض، حب دنیا وغیرہ ہیں، اگرچہ علمی طور پر قرآن وسنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آ گیا ہے، لیکن تزکیہ کو آپ کا جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کردیا گیا کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا اسی طرح نظری وعملی طور پر فن حاصل ہو جانے سے اس کا استعمال اور

کمال حاصل نہیں ہوتا، جب تک کسی مربی کے زیرِ نظر اس کی مشق کر کے عادت نہ ڈالے، سلوک و تصوف میں کسی شیخ کامل کی تربیت کا یہی مقام ہے کہ قرآن وسنت میں جن احکام کو علمی طور پر بتلایا گیا ہے ان کی علمی طور پر عادت ڈالی جائے۔

تزکیہ کو تعلیم سے جدا کر کے مستقل مقصد رسالت اور رسول کا فرض منصبی قرار دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تعلیم کتنی ہی صحیح ہو محض تعلیم سے عادۃً اصلاح اخلاق نہیں ہوتی جب تک کہ کسی تربیت یافتہ مربی کے زیرِ نظر عملی تربیت حاصل نہ کرے، کیونکہ تعلیم کا کام درحقیقت سیدھا اور صحیح راستہ دکھلا دیتا ہے مگر ظاہر ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے محض راستہ جان لینا تو کافی نہیں جب تک ہمت کر کے قدم اٹھائے اور راستہ نہ چلے اور ہمت کا نسخہ بجز اہلِ ہمت کی صحبت اور اطاعت کے اور کچھ نہیں، عمل کی ہمت و توفیق کسی کتاب کے پڑھنے یا سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتی، اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اور ان سے ہمت کی تربیت حاصل کرنا اسی کا نام تزکیہ ہے۔

(معارف القرآن ۱/۳۴۰، سورۂ بقرہ، پ ۱)

علمِ تصوف کی تعریف

تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اعمال باطنہ اور محرّ ماتِ باطنہ کا علم جس کو عرف میں علمِ تصوف کہا جاتا ہے چونکہ یہ باطنی اعمال بھی ہر شخص پر فرضِ عین ہیں تو ان کا علم بھی سب پر فرضِ عین ہے، آج کل جس کو علمِ تصوف کہا جاتا ہے وہ بھی بہت سے علوم ومعارف اور مکاشفات وواردات کا مجموعہ بن گیا ہے، اس جگہ فرضِ عین سے مراد اس کا صرف وہ حصہ ہے جس میں اعمال باطنہ فرض وواجب کی تفصیل ہے، مثلاً عقائد صحیحہ جس کا تعلق باطن سے ہے یا صبر، شکر، توکل، قناعت وغیرہ ایک خاص درجہ میں

فرض ہیں، یا غرور وتکبّر، حسد وبغض، بخل وحرصِ دنیا وغیرہ جوازروئے قرآن وسنت حرام ہیں ان کی حقیقت اوراس کے حاصل کرنے یا حرام چیزوں سے بچنے کے طریقہ معلوم کرنا بھی ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، علمِ تصوف کی اصل بنیاد اتنی ہی ہے جو فرض عین ہے۔ (معارف القرآن، ج۴، ص،۴۹۰ سورۂ توبہ، پ۱۱)

تسبیح کی تعریف

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (سورہ ق)

سَبِّــحْ تسبیح سے مشتق ہے، اس کے حقیقی معنیٰ اللہ کی تسبیح کرنا یعنی پاکی بیان کرنا ہے، وہ زبانی تسبیح کو بھی شامل ہے اور عبادت نماز کو بھی، اسی لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ تسبیح قبل طلوع الشّمس سے مراد نماز فجر ہے، اور تسبیح قبل الغروب سے مراد نماز عصر ہے، اور آیت کے مفہوم میں وہ عام تسبیحات بھی داخل ہیں جن کے صبح وشام پڑھنے کی ترغیب احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے۔ (معارف القرآن ص۱۵۰، ج۸ سورہ ق)

تضرع کی تعریف

''تضرع'' کے معنیٰ عجز وانکسار اور اظہار تذلل کے ہیں، خفیہ کے معنیٰ پوشیدہ چھپا ہوا، جیسا کہ اردو زبان میں بھی یہ لفظ اسی معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔

(معارف القرآن سورہ اعراف پ۸، ص۵۷۶ ج۳)

تطفیف کے معنی اور اس کا مصداق

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ۔ (پ:۳۰، سورہ تطفیف)

مطففین تطفیف سے مشتق ہے جس کے معنی ناپ تول میں کمی کرنے کے ہیں، اور ایسا کرنے والے کو مطفف کہا جاتا ہے، قرآن حکیم کے اس ارشاد سے ثابت ہوا

کہ تطفیف کرنا حرام ہے۔ قرآن وحدیث میں ناپ تول میں کمی کرنے کو حرام قرار دیا ہے، کیونکہ عام طور سے معاملات کا لین دین انہیں دو طریقوں سے ہوتا ہے، انہیں کے ذریعہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حق دار کا حق ادا ہو گیا یا نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ مقصود اس سے ہر ایک حق دار کا حق پورا پورا دینا ہے۔ اس میں کمی کرنا حرام ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ صرف ناپ تول کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس سے کسی کا حق پورا کرنا یا نہ کرنا جانچا جاتا ہے اس کا یہی حکم ہے خواہ ناپ تول سے ہو یا عدد شماری سے یا کسی اور طریقہ سے ہر ایک میں حق دار کے حق سے کم دینا بحکم تطفیف حرام ہے۔

مؤطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز کے رکوع وسجدہ وغیرہ پورے نہیں کرتا جلدی جلدی نماز ختم کر ڈالتا ہے تو اس کو فرمایا **لقد طففت** یعنی تو نے اللہ کے حق میں تطفیف کردی، فاروق اعظم کے اس قول کو نقل کر کے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **لكل شئ وفاء وتطفيف** یعنی پورا حق دینا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے، یہاں تک کہ نماز، وضو، طہارت میں بھی، اور اسی طرح دوسرے حقوق اللہ اور عبادات میں کمی کوتاہی کرنے والا تطفیف کرنے کا مجرم ہے۔

اسی طرح حقوق العباد میں جو شخص مقررہ حق سے کم کرتا ہے وہ بھی تطفیف کے حکم میں ہے، مزدور ملازم نے جتنے وقت کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے اس میں سے وقت چرانا اور کم کرنا بھی اس میں داخل ہے، وقت کے اندر جس طرح محنت سے کام کرنے کا عرف میں معمول ہے اس میں سستی کرنا بھی تطفیف ہے۔ اس میں عام لوگوں میں یہاں تک کہ اہل علم میں بھی غفلت پائی جاتی ہے، اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا۔ **اعاذنا الله منه۔**

(معارف القرآن: ۶۹۴/۸، پ: ۳۰، سورہ تطفیف)

تعزیر کی تعریف

جن جرائم پر شرعاً حد واجب نہیں ان میں ہر جرم کی سزا اس کے انداز کے موافق ہے، جس کی کوئی کیفیت یا تعداد شرعاً مقرر نہیں بلکہ قاضی یا اس کے قائم مقام حکم وغیرہ کی رائے پر ہے کہ جس جرم کی مناسب جو سزا مارنا یا قید یا زبانی تنبیہ وغیرہ کافی سمجھے اس کا استعمال کرے، البتہ اگر مارنے کی سزا تجویز کرے تو اس میں یہ شرط ہے کہ انتالیس کوڑے سے زیادہ تجویز نہ کرے اور اس سزا میں اس شخص کے حال کی بھی رعایت کی جائے جس پر سزا جاری کی جاتی ہے، اگر کوئی شریف آدمی ہے جس کے لئے زبانی تنبیہ مارنے پیٹنے کے برابر یا زیادہ سمجھی جاتی ہے تو اس کے لئے زبانی تنبیہ پر اکتفاء کیا جائے۔

زنا کی حدّ شرعی دارالحرب (یعنی غیر اسلامی حکومت) میں جاری نہیں ہوسکتی کیونکہ اجراءِ حدود کیلئے دارالاسلام شرط ہے، صرّح بہ فی الدّر المختار لیکن اگر مسلمان کسی جگہ متفق ہوں اور سب متفق ہوکر زانی سے قطع تعلقات کردیں اور جب تک توبہ نہ کرے مقاطع جاری رکھیں تو مناسب ہے۔

(امداد المفتین ص۷۵۲، ج۲)

تعزیر مالی

مالی تعزیر و جرمانہ وغیرہ شرعاً معتبر نہیں نہ جرمانہ لینا جائز ہے اور نہ اس کیلئے کوئی مصرف مقرر ہے، اگر کوئی دوسری سزا جاری نہ کرسکے تو پھر انسداد جرائم کی صورت یہ ہے کہ ایسے شخص سے سب مسلمان ایک مدت کیلئے قطع تعلق کردیں۔

(امداد المفتین ص۷۵۲، ج۲)

تفقہ فی الدین کی تعریف

علم دین کا محض پڑھ لینا کافی نہیں وہ تو بہت سے کافر یہودی نصرانی بھی پڑھتے ہیں، اور شیطان کو سب سے زیادہ حاصل ہے، بلکہ علم دین سے مراد دین کی سمجھ پیدا کرنا ہے، یہی لفظ تفقہ کا ترجمہ ہے، اور یہ فقہ سے مشتق ہے، فقہ کے معنی سمجھ بوجھ ہی کے ہیں، یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ مجرد کے صیغے سے لیفقھو الدین (یعنی تاکہ دین کو سمجھ لیں) نہیں فرمایا بلکہ لِیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْن جو باب تفعل سے ہے اس کے معنی میں محنت ومشقت کا مفہوم شامل ہے، مراد یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے میں پوری محنت و مشقت اٹھا کر مہارت حاصل کریں، یہ بھی ظاہر ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ صرف اتنی بات سے پیدا نہیں ہوتی کہ طہارت، نجاست، یا نماز، روزے، زکوٰۃ، حج کے مسائل معلوم کرے، بلکہ دین کی سمجھ بوجھ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے ہر قول وفعل اور حرکت وسکون کا آخرت میں اس سے حساب لیا جائے گا، اسی لیے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف یہ کی ہے کہ انسان ان تمام کاموں کو سمجھ لے جن کا کرنا اس کے لیے ضروری ہے، اور ان تمام کاموں کو بھی سمجھ لے جن سے بچنا اس کے لیے ضروری ہے، آج کل جو علم فقہ مسائل جزئیہ کے علم کو کہا جاتا ہے یہ بعد کی اصطلاح ہے۔

قرآن وسنت میں فقہ کی حقیقت وہی ہے جو امام اعظمؒ نے بیان فرمائی ہے کہ جس شخص نے دین کی کتابیں سب پڑھ ڈالیں، مگر یہ سمجھ بوجھ پیدا نہ کی وہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں عالم نہیں، اس تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ علم دین حاصل کرنے کا مفہوم قرآن کی اصطلاح میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے، وہ جن ذرائع سے حاصل ہو، وہ ذرائع خواہ کتابیں ہوں یا اساتذہ کی صحبت سب اس نصاب کے اجزاء ہیں۔

(معارف القرآن ۴/۴۹۰، سورہ توبہ پ ۱۱)

تفصیل کی تعریف

تفصیل کے اصلی معنیٰ یہ ہیں کہ مضمون کا تجزیہ کر کے ایک ایک فصل کو الگ الگ بیان کیا جائے، اس طریقہ پر پورا مضمون ذہن نشین ہو جاتا ہے، اس لئے تفصیل کا حاصل صاف صاف بیان کرنا ہو گیا، مطلب یہ ہے کہ ہم نے بنیادی اور اصولی مسائل کو صاف صاف تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، جس میں کوئی اجمال اور ابہام باقی نہیں چھوڑا۔ (معارف القرآن ج ۳/ ۴۴۸، انعام: پ ۸)

تقلید کی تعریف

آیت مذکورہ کا یہ جملہ: فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ

(سورہ نحل پ ۱۴)

اس جگہ اگرچہ ایک خاص مضمون کے بارے میں آیا ہے مگر الفاظ عام ہے جو تمام معاملات کو شامل ہے، اس لئے قرآنی اسلوب کے اعتبار سے درحقیقت یہ اہم ضابطہ ہے جو عقلی بھی ہے اور نقلی بھی کہ جو لوگ یہ احکام نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کرے اور نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کرے اسی کا نام تقلید ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ناواقف عوام کو علماء اگر قرآن وحدیث کے دلائل بتلا بھی دیں تو وہ ان دلائل کو بھی انہی علماء کے اعتماد پر قبول کریں گے، ان میں خود دلائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت ہے ہی نہیں، اور تقلید اسی کا نام ہے کہ نا جاننے والا کسی جاننے والے کے اعتماد پر کسی حکم کو شریعت کا حکم قرار دے کر عمل کرے، یہ تقلید وہ ہے جس کے جواز بلکہ وجوب میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔

(معارف القرآن ص ۳۳۴، ج ۵، سورہ نحل)

تقویٰ کی تعریف

تقویٰ کی تعریف متعدد تعبیرات سے کی گئی لیکن سب سے زیادہ جامع تعریف وہ ہے جو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کرنے پر فرمائی، حضرت عمرؓ نے پوچھا تھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! کبھی آپ کا ایسے راستہ پر بھی گذر رہوا ہوگا جو کانٹوں سے پُر ہو، حضرت عمرؓ نے فرمایا، کئی بار ہوا ہے، حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا، ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دامن سمیٹ لئے، اور نہایت احتیاط سے چلا، حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ بس تقویٰ اسی کا نام ہے، یہ دنیا ایک خارستان ہے، گناہوں کے کانٹوں سے بھری پڑی ہے، اس لیے دنیا میں اس طرح چلنا اور زندگی گذارنا چاہئے کہ دامن گناہوں کے کانٹوں سے نہ الجھے، اسی کا نام تقویٰ ہے، جو سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ (معارف القرآن ۲/۲۴۲، سورۂ آل عمران پ۴)

تقویٰ کے معنی

لفظ تقویٰ اصل عربی زبان میں بچنے اور اجتناب کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے، اس کا ترجمہ ڈرنا بھی اس مناسبت سے کیا جاتا ہے کہ جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ڈرنے ہی کی چیزیں ہوتی ہیں، یا کہ ان سے عذاب الٰہی کا خطرہ ہے، وہ ڈرنے کی چیز ہے۔

تقویٰ کے درجات

تقویٰ کے کئی درجات ہیں، ادنیٰ درجہ کفر و شرک سے بچنا ہے، اس معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان متقی کہا جا سکتا ہے، اگر چہ گناہوں میں مبتلا ہو، اس معنی کے لیے بھی

قرآن میں کئی جگہ لفظ متقین اور تقویٰ استعمال ہوا ہے، دوسرا درجہ جو اصل میں مطلوب ہے وہ ہے اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ نہیں، تقویٰ کے فضائل و برکات جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ اسی درجہ پر موعود ہیں۔

تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاص نائبین اولیاء کو نصیب ہوتا ہے کہ اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچانا اور اللہ کی یاد اور اس کی رضا جوئی سے معمور رکھنا، مذکورہ آیت میں اتقوا اللہ کے بعد حق تقاتہ کا کلمہ بڑھایا گیا ہے کہ تقویٰ کا وہ درجہ حاصل کرو جو حق ہے تقویٰ کا۔ (معارف القرآن ۲/ ۱۲۷، سورہ آل عمران پ ۴)

حق تقویٰ کیا ہے؟

اس کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ربیع اور قتادہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم نے یہ فرمائی ہے جو مرفوعاً خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے۔

حق تقاته هو ان يطاع فلا يعصى ويذكر فلاينسى ويشكر فلا يكفر۔ (بحر محیط)

حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے کوئی کام طاعت کے خلاف نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی بھولیں نہیں اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کریں، کبھی ناشکری نہ کریں، اسی مفہوم کو ائمہ تفسیر نے دوسرے عنوانات سے بھی ادا کیا ہے مثلاً بعض نے فرمایا کہ حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت اور برائی کی پروا نہ کرے اور ہمیشہ انصاف پر قائم رہے، اگر چہ انصاف کرنے میں خود اپنے نفس یا اپنی اولاد یا ماں باپ ہی کا نقصان ہوتا ہو اور بعض نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک حق تقویٰ ادا نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اپنی زبان کو محفوظ نہ رکھے۔

(معارف القرآن پ: ۴، ۲/ ۲۸، سورہ آل عمران)

تکبیر کی تعریف

تکبیر کے لفظی معنیٰ اللہ اکبر کہنے کے بھی آتے ہیں جس میں نماز کی تکبیر تحریمہ اور دوسری تکبیرات بھی داخل ہیں اور خارج نماز اذان واقامت وغیرہ کی تکبیر اس میں شامل ہے۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۶۱۱ سورہ المدثر پ ۲۹)

ترک دنیا کی تعریف

ترمذی میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت ہے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ترک دنیا اس کا نام نہیں کہ تم اپنے اوپر اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کرلو، یا جو مال تمہارے پاس ہو اسے خوامخواہ اڑادو، بلکہ ترک دنیا اس کا نام ہے کہ تمہارا اعتماد اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جو چیز ہے اس پر زیادہ ہو بہ نسبت اس کے جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ (معارف القرآن ۸/۵۹۵، سورہ مزمل پ:۲۹)

تلاوت کی تعریف

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ آیَاتِکَ: (بقرہ پ ۱) مصدر تلاوۃ سے مشتق ہے، تلاوت کے اصلی معنی اتباع اور پیروی کے ہیں، اصطلاح قرآن وحدیث میں یہ لفظ قرآن کریم اور دوسری آسمانی کتابوں اور کلام الٰہی کے پڑھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کلام کے پڑھنے والے کو اس کا پورا اتباع کرنا لازم ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ٹھیک اسی طرح پڑھنا ضروری ہے، اپنی طرف سے کسی لفظ یا اس کی حرکات میں کمی بیشی یا تبدیلی کی اجازت نہیں، امام راغب اصفہانی نے ''مفردات القرآن'' میں فرمایا ہے کہ کلام الٰہی کے سوا کسی دوسری کتاب یا کلام کے پڑھنے کو عرفاً تلاوت نہیں کہا جا سکتا۔

(معارف القرآن ۱/۳۳۰، سورۂ بقرہ پ ۱)

تمثال وتصویر کی تعریف

تماثیل تمثال کی جمع ہے، قاموس میں ہے کہ تَمثال بفتح التاء مصدر ہے اور بکسر التاء تِمثال تصویر کو کہا جاتا ہے، ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ تِمثال یعنی تصویر دو طرح کی ہوتی ہے، ایک ذی روح جاندار چیزوں کی تصویر، دوسرے غیر ذی روح بے جان چیزوں کی، پھر بے جان چیزوں میں دو قسمیں ہیں، ایک جماعت جس میں زیادتی اور نمو نہیں ہوتا جیسے پتھر مٹی وغیرہ، دوسرے نامی جس میں نمو اور زیادتی ہوتی رہتی ہے جیسے درخت اور کھیتی وغیرہ، جنّات حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ان سب قسم کی چیزوں کی تصویریں بناتے تھے۔ (معارف القرآن ص ۲۶۸، ج ۷، پ ۲۲)

تصویر کشی صرف اسی کا نام نہیں کہ قلم سے تصویر بنائی جائے یا پتھر وغیرہ کا بت تراشا جائے، بلکہ وہ تمام صورتیں تصویر کشی میں داخل ہیں جن کے ذریعہ تصویریں تیار ہوتی ہیں خواہ وہ آلات قدیمہ کے ذریعہ ہو یا آلات جدیدہ فوٹو گرافی اور طباعت وغیرہ سے، کیونکہ آلات وذرائع کی تخصیص ظاہر ہے کہ کسی کام میں مقصود نہیں ہوتی ،احکام کا تعلق اصل مقصد سے ہوتا ہے اس لئے جیسے قلم ذریعۂ تصویر کشی ہے ایسے ہی طباعت اور آلات فوٹو گرافی ذریعۂ تصویر سازی ہیں، بلکہ بلا واسطہ آلہ کے تو کوئی تصویر بھی نہیں بنتی، کیا قلم آلہ نہیں ہے؟ پھر آلات کے احکام مختلف ہونے کے کوئی معنی نہیں۔

(تصویر کے شرعی احکام، جواہر الفقہ ص ۲۴۶ ج ۷)

تنّور کی تعریف

لفظ تنّور کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے، سطح زمین کو بھی تنور کہتے ہیں، روٹی پکانے کے تنور کو بھی تنور کہا جاتا ہے، زمین کے بلند حصہ کے لیے بھی لفظ تنور بولا جاتا ہے، اسی لیے ائمہ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا کہ اس جگہ تنور سے مراد سطح زمین ہے کہ اس سے

پانی ابلنے لگا، بعض نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تنور مقام عین وردۃ ملک شام میں تھا وہ مراد ہے، اس سے پانی نکلنے لگا بعض نے فرمایا حضرت نوح علیہ السلام کا اپنا تنور کوفہ میں تھا وہ مراد ہے، اکثر مفسرین حضرت حسنؒ، مجاہدؒ، شعبیؒ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ (معارف القرآن ۶۲۲/۴، سورہ ہود پ۱۲)

توبہ کی حقیقت

توبہ کے لفظی معنیٰ لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں کسی گناہ سے باز آنے کو توبہ کہتے ہیں، اور اس کے صحیح اور معتبر ہونے کے لئے تین شرائط ہیں:

(۱) ایک یہ جس گناہ میں فی الحال مبتلا ہے اس کو فوراً ترک کردے۔

(۲) یہ کہ ماضی میں جو گناہ ہوا اس پر نادم ہو۔

(۳) یہ کہ آئندہ اسے ترک کرنے کا پختہ عزم کرلے۔

اور کوئی شرعی فریضہ چھوڑا ہو تو اسے ادا یا قضا کرنے میں لگ جائے، اور اگر گناہ حقوق العباد سے متعلق ہے تو اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر کسی کا مال اپنے اوپر واجب ہے اور وہ شخص زندہ ہے تو یا اسے وہ مال لوٹائے یا اس سے معاف کرائے، اور اگر وہ زندہ نہیں اور اس کے ورثہ موجود ہیں تو ان کو لوٹائے، اگر ورثہ بھی نہیں ہیں، تو بیت المال میں داخل کرائے، بیت المال بھی نہیں یا اس کا انتظام صحیح نہیں ہے تو اس کی طرف سے صدقہ کردے۔

اور اگر کوئی غیر مالی حق کسی کا اپنے ذمہ واجب ہے مثلاً کسی کو ناحق ستایا ہے برا بھلا کہا ہے، یا اس کی غیبت کی ہے تو اسے جس طرح ممکن ہو راضی کرکے اس سے معافی حاصل کرے۔

اور یہ تو ہر قسم کی توبہ کے لئے ضروری ہے گناہ کا ترک کرنا اللہ کے لئے ہو

اپنے کسی جسمانی ضعف یا مجبوری کی بنا پر نہ ہو، اور شریعت میں اصل مطلوب یہ ہے کہ توبہ سارے ہی گناہوں سے کی جائے لیکن اگر صرف خاص گناہ سے توبہ کی گئی تو اہل سنت کے مسلک کے مطابق اس گناہ کی حد تک تو معافی ہو جائے گی، دوسرے گناہوں کا وبال سر پر رہے گا۔ (معارف القرآن ج ۷ ص ۶۹۵ سورہ شوریٰ پ ۲۵)

توبہ کی تعریف اور اس کی حقیقت

لفظ توبہ کے اصلی معنیٰ رجوع کے ہیں گناہ سے توبہ کو بھی اسی لئے توبہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے پچھلے جرم و گناہ سے رجوع ہوتا ہے۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۵۹۹ سورہ مزمل پ ۲۹)

توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے کے ہیں اور جب توبہ کی نسبت بندہ کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

اول: اپنے کئے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اس پر نادم و شرمندہ ہونا۔

دوسرے: اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا۔

تیسرے: آئندہ کے لیے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرنا۔ اگر ان تین چیزوں میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ توبہ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے ''اللہ توبہ'' کے الفاظ بول دینا نجات کے لیے کافی نہیں جب کہ یہ تینوں چیزیں جمع نہ ہوں، یعنی گذشتہ پر ندامت، اور حال میں اس کا ترک اور مستقبل میں اس کے نہ کرنے کا عزم و ارادہ۔

تَابَ عَلَیْهِ (میں) توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور اس کے معنی ہیں توبہ قبول کرنا۔

فائدہ : امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ لفظ توّاب بندہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے جیسے اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ اور اللہ تعالیٰ کے لیے بھی جیسے اس آیت میں هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْم جب بندہ کے لیے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں گناہ سے

اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا۔ یہ صرف لفظ توّاب کا حکم ہے۔

اسی معنی کا دوسرا لفظ تائب ہے اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے جائز نہیں، اگر چہ لغوی معنی کے لحاظ سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور القاب استعمال کرنا جائز ہیں جن کا ذکر قرآن وسنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگر چہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں مگر اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا استعمال درست نہیں۔

(معارف القرآن ۱/۱۹۰، سورہ بقرہ پ:۱)

توبہ کے تین رکن

توبہ کے تین رکن ہیں:

اول! اپنے کئے پر ندامت اور شرمساری، حدیث میں ارشاد ہے **انما التوبة الندم**، یعنی توبہ نام ہی ندامت کا ہے۔

دوسرا رکن توبہ کا یہ ہے کہ جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے اس کو فوراً چھوڑ دے، اور آئندہ کو بھی اس سے باز رہنے کا پختہ عزم وارادہ کرے۔

تیسرا رکن یہ ہے کہ تلافی مافات کی فکر کرے یعنی جو گناہ سرزد ہو چکا ہے اس کا جتنا تدارک اس کے قبضہ میں ہے اس کو پورا کرے، مثلاً نماز روزہ فوت ہوا ہے، تو اس کو قضا کرے، فوت شدہ نمازوں اور روزوں کی صحیح تعداد یاد نہ ہو تو غور وفکر سے کام لے کر تخمینہ متعین کرے، پھر ان کی قضا کرنے کا پورا اہتمام کرے، بیک وقت نہیں کرسکتا تو ہر نماز کے ساتھ ایک ایک نماز قضاء عمری کی پڑھ لیا کرے، ایسے ہی متفرق اوقات میں روزوں کی قضا کا اہتمام کرے، فرض زکوٰۃ ادا نہیں کی تو گذشتہ زمانہ کی زکوٰۃ بھی یک مشت یا تدریجاً ادا کرے، کسی انسان کا حق لیا ہے تو اس کو واپس کرے، کسی کو تکلیف پہنچائی ہے تو اس سے معافی طلب کرے، لیکن اگر اپنے کئے پر ندامت

نہ ہو یا ندامت تو ہو مگر آئندہ کے لیے اس گناہ کو ترک نہ کرے، تو یہ توبہ نہیں ہے۔ گو ہزار مرتبہ زبان سے توبہ کرے۔ (معارف القرآن سورہ نساء پ: ۴-۲/۲۴۷)

توبۂ نصوح کی تعریف

توبہ کے لفظی معنی لوٹنے اور رجوع ہونے کے ہیں، مراد گناہوں سے لوٹنا ہے، اور اصطلاحِ قرآن وسنت میں توبہ اس کا نام ہے کہ آدمی اپنے پچھلے گناہ پر نادم ہو اور آئندہ اس کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم کرے، اور نصوح کو اگر مصدر ''نصح'' اور ''نصیحت'' سے لیا جائے تو اس کے معنی خالص کرنے کے ہیں، اور مصدر ''نصاحت'' سے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی کپڑے کو سینے اور جوڑ لگانے کے ہیں، پہلے معنی کے اعتبار سے نصوح کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ریا اور نمود سے خالص ہو، محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوفِ عذاب سے گناہ پر نادم ہو کر چھوڑ دے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے نصوح اس مطلب کے لئے ہوگا کہ اعمالِ صالحہ کا لباس جو گناہ کی وجہ سے پھٹ گیا ہے تو یہ اس کے خرق یعنی پھٹن کو جوڑنے والی ہے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ:

توبۂ نصوح یہ ہے کہ آدمی اپنے گذشتہ عمل پر نادم ہو اور پھر اس کی طرف نہ لوٹنے کا پختہ ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔

اور کلبی نے فرمایا کہ: توبۂ نصوح یہ ہے کہ زبان سے استغفار کرے اور دل میں نادم ہو اور اپنے بدن اور اعضاء کو آئندہ اس گناہ سے روکے۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سوال کیا گیا کہ توبہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

جن میں چھ چیزیں جمع ہوں، (۱) اپنے گذشتہ برے عمل پر ندامت (۲) جو فرائض وواجبات اللہ تعالیٰ کے چھوٹے ہیں ان کی قضاء (۳) کسی کا مال وغیرہ ظلماً لیا تھا تو اس کی واپسی (۴) کسی کو ہاتھ یا زبان سے ستایا اور تکلیف پہنچائی تھی تو اس سے معافی (۵) آئندہ گناہ کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم وارادہ (۶) اور یہ کہ

جس طرح اس نے اپنے نفس کو اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھا ہے اب وہ اطاعت کرتے ہوئے دیکھ لے۔ (مظہری)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو شرائط توبہ بیان فرمائے ہیں وہ سبھی کے نزدیک مسلّم ہیں، بعض نے مختصر بعض نے مفصل بیان کردیا ہے۔ (پ۲۸، ص۵۰۶ ج۸ سورۂ تحریم)

توبہ واستغفار اور اس کے قبول ہونے کی شرط

"وَمَنْ يَعْمَلْ سُوْءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَه" (سورہ نساء پ۵) سے یہ معلوم ہوا کہ گناہ خواہ متعدی ہو یا لازمی یعنی حقوق العباد سے متعلق ہو یا حقوق اللہ سے، ہر قسم کا گناہ توبہ واستغفار سے معاف ہوسکتا ہے، البتہ توبہ واستغفار کی حقیقت جاننا ضروری ہے، محض زبان سے استغفر اللہ واتوب الیہ کہنے کا نام توبہ واستغفار نہیں ہے، اس لیے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو اس پر اس کو ندامت بھی نہیں، اور اس کو چھوڑا بھی نہیں یا آئندہ کے لیے چھوڑنے کا عزم نہیں کیا، اور اس حالت میں زبان سے استغفر اللہ کہتا ہے تو یہ توبہ کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ توبہ کے لیے تین چیزیں ہونا ضروری ہیں، ایک گذشتہ گناہوں پر نادم ہونا، دوسرے جس گناہ میں مبتلا ہو اس کو اسی وقت چھوڑ دینا، اور تیسرے آئندہ کے لیے گناہ سے بچنے کا پختہ ارادہ کرنا، البتہ جن گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے ان کو انہی سے معاف کرانا یا حقوق ادا کرنا بھی توبہ کی شرط ہے۔

(معارف القرآن ۲/۵۴۳، سورہ نساء پ۵)

توبہ کی تفصیل

اس جگہ یہ بات خاص طور پر قابل نظر ہے کہ اس آیت میں گناہگاروں سے مغفرت ورحمت کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک توبہ،

دوسرے اصلاح عمل، توبہ کے معنی ہیں گناہ پر ندامت کے، حدیث میں ارشاد ہے:
انما التوبة الندم، یعنی توبہ نام ہے ندامت کا۔

دوسرے آئندہ کے لیے اصلاح عمل، اس اصلاحِ عمل میں یہ بھی داخل ہے کہ آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا عزم اور پورا اہتمام کرے، اور یہ بھی شامل ہے کہ سابقہ گناہ سے جو حقوق کسی کے ضائع ہوئے ہیں تا حد اختیار ان کو ادا کرے، خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، حقوق اللہ کی مثال نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ فرائض میں کوتاہی کرنا ہے .... اور حقوق العباد کی مثال کسی کے مال پر ناجائز قبضہ وتصرف کرنا، کسی کی آبرو پر حملہ کرنا، کسی کو گالی گلوج کے ذریعہ یا کسی دوسری صورت سے ایذاء پہنچانا ہے۔

اس لیے تکمیل توبہ کے لیے جس طرح یہ ضروری ہے کہ گزشتہ گناہ پر ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے، اور آئندہ کے لیے اپنے عمل کو درست رکھے، اس گناہ کے پاس نہ جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو نمازیں یا روزے غفلت سے ترک ہوگئے ہیں ان کی قضاء کرے، جو زکوۃ نہیں دی گئی وہ اب ادا کرے، قربانی، صدقۃ الفطر کے واجبات میں کوتاہی ہوئی ہے تو ان کو ادا کرے، حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہیں کیا تو اب ادا کرے، اور خود نہ کرسکے تو حج بدل کرائے، اور اگر اپنے سامنے حج بدل اور دوسری قضاؤں کا موقع پورا نہ ملے تو وصیت کرے کہ اس کے وارث اس کے ذمہ عائد شدہ واجبات کا فدیہ یا حج بدل کا انتظام کرلیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصلاح عمل کے لیے صرف آئندہ کا عمل درست کرلینا کافی نہیں، پچھلے فرائض وواجبات کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح حقوق العباد میں اگر کسی کا مال ناجائز طور پر لیا ہے تو اس کو واپس کرے، یا اس سے معاف کرائے اور کسی کو ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہنچائی ہے تو اس

سے معاف کرائے، اور اگر اس سے معاف کرانا اختیار میں نہ ہو مثلاً وہ مر جائے یا ایسی جگہ چلا جائے جس کا اس کو پتہ معلوم نہیں تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرتے رہنے کا التزام کرے، اس سے امید ہے کہ صاحبِ حق راضی ہو جائے گا، اور یہ شخص سبکدوش ہو جائے گا۔

(معارف القرآن ۳/۳۴۰، سورہ انعام پ ۷)

توحید کی تعریف اور اس کا وسیع مفہوم

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ۔ (سورہ بقرہ پ۲)

اللہ تعالیٰ کی توحید متعدد اور مختلف حیثیتوں سے ثابت ہے مثلاً وہ ایک ہے یعنی کائنات میں کوئی اس کی نظیر وشبیہ نہیں، نہ کوئی اس کا ہمسر و برابر ہے اس لیے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے۔

دوسرے یہ کہ وہ ایک ہے استحقاق عبادت میں یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

تیسرے یہ کہ وہ ایک ہے یعنی ذی اجزاء نہیں وہ اجزاء و اعضاء سے پاک ہے نہ اس کا تجزیہ اور تقسیم ہو سکتی ہے۔

چوتھے یہ کہ وہ ایک ہے، یعنی اپنے وجود ازلی ابدی میں ایک ہے وہ اس وقت بھی موجود تھا جب کوئی چیز موجود نہ تھی، اور اس وقت بھی موجود رہے گا جب کوئی چیز موجود نہ رہے گی، اس لیے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے، لفظ واحد میں یہ تمام حیثیتیں توحید کی ملحوظ ہیں۔ (جصاص)

(معارف القرآن ۱/۴۰۶، سورہ بقرہ پ:۲)

تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کا طغرائے امتیاز اور اس کا رکن اعظم عقیدۂ توحید ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ایک اور اکیلا جاننے کا نام

توحید نہیں، بلکہ اس کو تمام صفات کمال میں یکتا و بے مثل ماننے اور اسکے سوا کسی مخلوق کو اِن صفاتِ کمال میں اس کا سہیم و شریک نہ سمجھنے کو توحید کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کمال: حیات[۱]، علم[۲]، قدرت[۳]، سمع[۴]، بصر[۵]، ارادہ[۶]، مشیت[۷]، خلق[۸]، رزق[۹]، وغیرہ، وہ ان سب صفات میں ایسا کامل ہے کہ اس کے سوا کوئی مخلوق کسی صفت میں اس کے برابر نہیں ہوسکتی، پھر ان صفات میں بھی دو صفتیں سب سے زیادہ ممتاز ہیں، ایک علم، دوسرے قدرت، اس کا علم بھی تمام موجود و غیر موجود، ظاہر اور مخفی، بڑے اور چھوٹے ہر ذرّہ ذرّہ پر حاوی اور محیط ہے، اور اس کی قدرت بھی ان سب پر پوری پوری محیط ہے۔ (معارف القرآن ۳۴۴،۳، پ ۷ سورہ انعام)

تَوْرِیَہ کی تعریف اور اس کا حکم

ضرورت کے موقع پر تورِیہ کرنا جائز ہے، تَوْرِیہ ایک تو قولی ہوتا ہے یعنی ایسی بات کہنا جس کا ظاہری مفہوم خلاف واقعہ ہو اور باطنی مراد مطابق واقعہ، اور ایک تورِیہ عملی ہوتا ہے، یعنی ایسا عمل کرنا جس کا مقصد دیکھنے والا کچھ سمجھے اور درحقیقت اس کا مقصد کچھ اور ہو، اسے اِیہام بھی کہا جاتا ہے، حضرت ابرہیم علیہ السلام کا ستاروں کو دیکھنا (اکثر مفسرین کے قول کے مطابق) اِیہام تھا اور اپنے آپ کو بیمار کہنا تورِیہ۔

ضرورت کے مواقع پر توریہ کی یہ دونوں قسمیں خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، جس وقت آپ ہجرت کے لئے تشریف لے جارہے تھے اور مشرکین آپ کی تلاش میں لگے ہوئے تھے، تو راستہ میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون ہے؟ حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا: ''هُوَ هَادٍ يَهْدِينِي'' (وہ میرے رہنما ہیں مجھے راستہ دکھاتے ہیں) سننے والا یہ سمجھا کہ عام راستہ بتانے والے رہنما مراد ہیں، اس لئے چھوڑ کر چل دیا، حالانکہ حضرت ابوبکرؓ کا مقصد یہ تھا کہ آپ دینی اور روحانی رہنما ہیں (روح المعانی)

اسی طرح حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو جہاد کے لئے جس سمت میں جانا ہوتا مدینہ طیبہ سے نکلتے وقت اس سمت میں روانہ ہونے کے بجائے کسی دوسری سمت میں چلنا شروع فرماتے تھے، تاکہ دیکھنے والوں کو صحیح منزل معلوم نہ ہو سکے (صحیح مسلم وغیرہ) یہ عملی توریہ اور ایہام تھا۔

مزاح اور خوش طبعی کے مواقع پر بھی آنحضرت ﷺ سے توریہ ثابت ہے، شمائل ترمذی میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک بوڑھی عورت سے مزاحاً فرمایا: ''کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی'' وہ عورت یہ سن کر بہت پریشان ہوئی تو آپ نے تشریح فرمائی کہ بوڑھیوں کے جنت میں نہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہ جائیں گی ہاں جوان ہو کر جائیں گی۔

(معارف القرآن ۴۵۴، ج ۷، سورہ صفّت)

توکل کے شرعی معنیٰ

قرآن کریم کا ارشاد ہے ''وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ'' یعنی جو شخص اللہ پر توکل یعنی بھروسہ کرتا ہے اللہ اس کے سب مہمات و مشکلات کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔

اللہ پر توکل اور بھروسہ کے یہ معنی نہیں کہ کسبِ معاش اور دفع بلاء کے جو اسباب و آلات قدرت حق نے آپ کو عطا فرمائے ہیں ان کو معطل کر کے اللہ پر بھروسہ کرو، بلکہ توکل کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے مقاصد کے لیے اللہ کی دی ہوئی قوت و توانائی اور جو اسباب میسر ہیں ان سب کو پورا استعمال کرو، مگر اسباب مادیہ میں غلو اور انہماک زیادہ نہ کرو، اعمال اختیاریہ کو کر لینے کے بعد نتیجہ کو اللہ کے سپرد کر کے بے فکر ہو جاؤ۔

توکل کا یہ مفہوم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ امام بغوی نے شرح السنہ میں، بیہقی نے شعب الایمان میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ان نفسا لن تموت حتی تستکمل رزقها ألا فاتقوا الله واجملوا في الطلب" (مظہری) یعنی روح القدس جبرئیل امین نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ اپنے مقدر میں لکھا ہوا اللہ کا رزق پورا پورا حاصل نہیں کرلے گا اس لیے تم خدا سے ڈرو، اور اپنے مقاصد کی طلب میں اختصار سے کام لو۔ زیادہ منہمک نہ ہو کہ قلب کی توجہ ساری انہیں مادی اسباب وآلات میں محصور ہو کر رہ جائے، اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔

اور ترمذی نے حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ترکِ دنیا اس کا نام نہیں کہ تم اپنے اوپر اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کرلوں یا جو مال تمہارے پاس ہو اسے خواہ مخواہ اڑادو، بلکہ ترکِ دنیا اس کا نام ہے کہ تمہارا اعتماد اللہ کے ہاتھ میں جو چیز ہے اس پر زیادہ ہو بہ نسبت اس کے جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ (مظہری) (معارف القرآن ۵۹۵، ج۸، پ۲۹، سورہ المزمل)

توکل کی تعریف

"وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ" (سورہ آل عمران پ:۴)

توکل کے معنی یہ نہیں کہ تمام اسباب ظاہری کو بالکل قطع تعلق کر کے اللہ پر اعتماد کیا جائے، بلکہ توکل کے معنی یہ ہیں کہ تمام اسباب ظاہری کو اپنی قدرت کے مطابق جمع کرے اور اختیار کرے اور پھر نتائج اللہ کے سپرد کرے اور ان ظاہری اسباب پر فخر و ناز نہ کرے بلکہ اعتماد صرف اللہ پر رہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہمارے سامنے ہے، خود اسی جہاد میں مسلمانوں کے لشکر کو جنگ (احد) کے لیے منظم کرنا، اپنی قدرت کے موافق اسلحہ اور دیگر سامان

حرب فراہم کرنا، محاذ جنگ پر پہنچ کر مناسب حال ومقام نقشہ جنگ تیار کرنا، مختلف مورچے بنا کر صحابہ کرام کو ان پر بٹھانا وغیرہ یہ سب مادی انتظامات ہی تو تھے جن کو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے استعمال فرما کر بتلا دیا کہ مادی اسباب بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، ان سے قطع نظر کرنے کا نام توکل نہیں۔

یہاں مومن اور غیر مومن میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ مومن سب سامان اور مادی طاقتیں حسب قدرت جمع کرنے کے بعد بھی بھروسہ وتوکل صرف اللہ پر کرتا ہے، غیر مومن کو یہ روحانیت نصیب نہیں، اس کو صرف اپنی مادی طاقت پر بھروسہ ہوتا ہے۔

(معارف القرآن سورہ آل عمران ۲/۲۰۷، پ:۴)

توکل ترک اسباب وترک تدبیر کا نام نہیں

''فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ'' (سورہ آل عمران پ۴)

اس جملہ ''فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ'' سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ توکل ترک اسباب وترک تدبیر کا نام نہیں، بلکہ اسباب قریبہ کو چھوڑ کر توکل کرنا سنت انبیاء اور تعلیم قرآن کے خلاف ہے، ہاں اسباب بعیدہ اور دور از کار فکروں میں پڑے رہنا یا صرف اسباب اور تدابیر ہی کو موثر سمجھ کر مسبب الاسباب اور مدبر الامور سے غافل ہو جانا بے شک خلاف توکل ہے۔ (معارف القرآن سورہ آل عمران پ:۴، ۲/۲۲۷)

توکل کے معنی اعتماد اور بھروسہ کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال و احوال میں اس کا مکمل اعتماد اور بھروسہ صرف ذات واحد حق تعالیٰ پر ہو، صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ اپنی ضروریات کے لیے مادی اسباب اور تدابیر کو ترک کر کے بیٹھ جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادی اسباب وآلات کو اصل کامیابی کے لیے کافی نہ سمجھے بلکہ بقدر قدرت وہمت مادی اسباب اور تدابیر کو فراہم کرنے اور استعمال کرنے کے بعد معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد

کرے اور سمجھے کہ اسباب بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اور ان اسباب کے ثمرات بھی وہی پیدا کرتے ہیں، ہوگا وہی جو وہ چاہیں گے۔ایک حدیث میں فرمایا ''اجملوا فی الطلب وتوکلوا علیه ''یعنی رزق اور اپنی حاجات کے حاصل کرنے کے لیے متوسط درجہ کی طلب اور مادی اسباب کے ذریعہ کوشش کرلو، پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو، اپنے دل ودماغ کو صرف مادی تدبیروں اور اسباب ہی میں نہ الجھا رکھو۔ (معارف القرآن ۱۷۹/۴، سورہ انفال پ ۹)

ث

ثبات، ثابت قدمی کی تعریف

ثَبات یعنی ثابت رہنا اور جمنا جس میں ثَباتِ قلب اور ثَباتِ قدم دونوں داخل ہیں کیونکہ جب تک کسی شخص کا دل مضبوط اور ثابت نہ ہو اس کا قدم اور اعضاء ثابت نہیں رہ سکتے اور یہ چیز ایسی ہے جس کو ہر مومن وکافر جانتا اور سمجھتا ہے، اور دنیا کی ہر قوم اپنی جنگوں میں اس کا اہتمام کرتی ہے، کیونکہ اہل تجربہ سے مخفی نہیں کہ میدان جنگ کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کامیاب ہتھیار ثبات قلب اور قدم ہی ہے، دوسرے سارے ہتھیار اس کے بغیر بے کار ہے۔ (معارف القرآن ۲۵۱ ج ۴، سورہ انفال)

ثوب کی تعریف

ثیاب ثوب کی جمع ہے، اس کے اصلی اور حقیقی معنیٰ کپڑے کے ہیں اور مجازی طور پر عمل کو بھی ثوب اور لباس کہا جاتا ہے، قلب اور نفس کو بھی اور خُلق اور دین کو بھی انسان کے جسم کو بھی لباس سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کے شواہد قرآن اور محاورات عرب میں بکثرت ہیں۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۶۱۱ سورہ المدثر پ ۲۹)

﴿ج﴾

جار ذی القربیٰ والجار الجنب کی تعریف (پڑوسی)

وَالْجَارِ الْجُنُبِ: جار کے معنی پڑوسی کے ہیں، اس آیت میں اس کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک جار ذی القربی، دوسرے جار جنب، ان دو قسموں کی تفسیر و تشریح میں صحابہ کرامؓ کے مختلف اقوال ہیں۔

عام مفسرین نے فرمایا کہ جار ذی القربیٰ سے مراد وہ پڑوسی ہے جو تمہارے مکان کے متصل رہتا ہے، اور جار جنب سے وہ پڑوسی مراد ہے جو تمہارے مکان سے کچھ فاصلہ پر رہتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جار ذی القربیٰ سے وہ شخص مراد ہے جو پڑوسی بھی ہے اور رشتہ دار بھی، اس طرح اس میں دو حق جمع ہو گئے، اور جار جنب سے مراد وہ ہے جو صرف پڑوسی ہے رشتہ دار نہیں، اس لیے اس کا درجہ پہلے سے مؤخر رکھا گیا۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ جار ذی القربی وہ پڑوسی ہے جو اسلامی برادری میں داخل اور مسلمان ہے اور جار جنب سے غیر مسلم پڑوسی مراد ہے۔

الفاظ قرآن ان سب معانی کو متحمل ہیں اور حقیقت کے اعتبار سے بھی درجہ میں فرق ہو جانا امر معقول ہے اور معتبر ہے اور پڑوسی کے رشتہ دار یا غیر ہونے کے اعتبار سے بھی اور مسلم اور غیر مسلم ہونے کے اعتبار سے بھی............ اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پڑوسی خواہ قریب ہو یا بعید، رشتہ دار ہو یا غیر، مسلم ہو یا غیر مسلم، بہر حال اس کا حق ہے بقدر استطاعت کے امداد و اعانت اور خبر گیری لازم ہے۔ (معارف القرآن ۲/۴۱۲، سورۂ نساء پ ۵)

جدال کی تعریف

جدال کے معنیٰ ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کے ہیں اس لئے سخت قسم کے جھگڑے کو جدال کہا جاتا ہے، یہ لفظ بھی بہت عام ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے عام ہی معنیٰ مراد لئے ہیں اور بعض حضرات نے مقام حج واحرام کی مناسبت سے اس جگہ جدال کے (خاص) معنیٰ لئے ہیں۔ (معارف القرآن ج۱ ص۴۸۵ سورہ بقرہ پ۲)

جرّاب کی تعریف اور اس کی قسمیں

کپڑے کے اعتبار سے جرابوں کی دو قسمیں ہیں ثخین اور رقیق، ثخین اصطلاح فقہاء میں وہ جراب ہے جس کا کپڑا اس قدر دبیز، موٹا اور مضبوط ہو کہ اس میں تین میل (تقریبا پانچ کلومیٹر) بغیر جوتہ کے سفر کرسکیں، اور وہ ساق پر بغیر (گیٹس وغیرہ سے) باندھے ہوئے قائم رہ سکے، بشرطیکہ یہ قائم رہنا کپڑے کی تنگی اور چستی کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اس کی ضخامت اور جرم کے موٹا ہونے کی وجہ سے ہو، نیز یہ کہ وہ پانی کو جلدی سے جذب نہ کرے اور پانی اس میں نہ چھنے، الغرض ثخین کے لئے تین شرطیں ہیں ایک یہ کہ اس میں کم از کم تین میل بغیر جوتہ کے سفر کریں تو پھٹے نہیں، دوسرے یہ کہ ساق پر بغیر باندھے ہوئے قائم رہ جائے، تیسرے یہ کہ اس میں پانی نہ چھنے اور جلدی سے جذب نہ ہو اور جس جراب میں ان شرطوں میں کوئی شرط نہ پائی جائے وہ رقیق ہے۔

کپڑے کی جرابوں پر بعض لوگ کچھ چمڑا بھی لگاتے ہیں جس کی مختلف صورتیں ہیں، اس اعتبار سے فقہائے کرام نے جرابوں کی دو قسمیں اور کی ہیں، ایک مجلد دوسرے منعل، مجلد وہ ہے کہ جس کے نیچے اوپر پورے قدم پر کعبین تک چمڑا چڑھا دیا جائے، اور منعل وہ ہے کہ جس کے صرف تلے پر چمڑا چڑھا دیا جائے۔ (جواہر الفقہ جلد دوم ص:۲۹۸، ۳۰۱)

جزیہ کی تعریف

جزیہ کے لفظی معنیٰ بدلہ اور جزاء کے ہیں، اصطلاح شرع میں اس سے مراد وہ رقم ہے جو کفار سے قتل کے بدلہ میں لی جاتی ہے۔ (معارف القرآن سورہ توبہ پ۱۰، ص۳۶۰ ج۴)

جمال اور زینت کی تعریف

زینت لغوی معنیٰ کے اعتبار سے اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان اپنے آپ کو مُزین اور خوش منظر بنائے، وہ عمدہ کپڑے بھی ہو سکتے ہیں، زیور بھی، یہ چیزیں جب کہ کسی عورت کے بدن پر نہ ہوں علاحدہ ہوں تو بہ اتفاق امت ان کا دیکھنا مردوں کے لئے حلال ہے، جیسے بازار میں بکنے والے زنانہ کپڑے اور زیور کہ ان کے دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں (معارف القرآن ج۶ ص۴۰۱، سورہ نور)

جمال اور تفاخر کا فرق

لِتَرْكَبُوهَا وَزِيْنَةً (سورہ نحل پ۱۴) اس آیت سے جمال اور زینت کا جواز معلوم ہوتا ہے، اگر چہ تفاخر و تکبر حرام ہیں، فرق یہ ہے کہ جمال اور زینت کا حاصل اپنے دل کی خوشی یا اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہوتا ہے، نہ دل میں اپنے کو اس نعمت کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ دوسروں کو حقیر جانتا ہے، بلکہ حق تعالیٰ کا عطیہ اور انعام ہونا اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے، اور تکبر و تفاخر میں اپنے آپ کو اُس نعمت کا مستحق سمجھنا، دوسروں کو حقیر سمجھنا پایا جاتا ہے وہ حرام ہے۔ (بیان القرآن، معارف القرآن ۳۲۱، ج۵، سورہ نحل پ۱۴)

جمرات کی تعریف

جمرات یا جمار: منیٰ میں تین مقام ہیں جن پر قد آدم ستون بنے ہوئے ہیں، یہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں، ان میں سے جو مسجد خیف کے قریب مشرق کی طرف

ہے اس کو جمرۃ الاولیٰ کہتے ہیں اور اس کے بعد والے کو جمرۃ الوسطیٰ اور اس کے بعد والے کو جمرۃ الکبریٰ اور جمرۃ العقبہ اور جمرۃ الاخریٰ کہتے ہیں۔ (احکام حج ص:۱۰)

جنّات کی تعریف

''جن'' مخلوقات الٰہیہ میں ایک ایسی مخلوق کا نام ہے جو اجسام بھی ہیں ذی روح بھی ہیں اور انسان کی طرح عقل وشعور والے بھی، مگر لوگوں کی نظروں سے مخفی ہیں، اسی لئے ان کا نام جنّ رکھا گیا، کہ جن کے لفظی معنیٰ مخفی کے ہیں، ان کی تخلیق کا غالب مادّہ آگ ہے، جیسے انسان کی تخلیق کا غالب مادّہ مٹی ہے، اس نوع میں بھی انسان کی طرح نر ومادہ، یعنی مرد وعورت ہیں، اور انسان ہی کی طرح ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ بھی ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ جن کو شیاطین کہا گیا ہے وہ بھی جنات ہی میں سے شریر لوگوں کا نام ہے، جنات اور فرشتوں کا وجود قرآن وسنت کے قطعی دلائل سے ثابت ہے جس کا انکار کفر ہے۔ (تفسیر مظہری) (معارف القرآن ج ۸ ص ۵۷۴ سورہ جن پ ۲۹)

جنت اور جہنم کی تعریف

بیہقی نے دلائل النبوت میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ روایت کیا ہے کہ جنت آسمان میں ہے اور جہنم زمین میں اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ قیامت کے روز جہنم کو لایا جائے گا **وَجِيْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ** اس کا مطلب کیا ہے؟ جہنم کو کہاں سے لایا جائیگا؟ تو آپ نے فرمایا کہ جہنم کو ساتویں زمین سے لایا جائے گا، ان روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم ساتویں زمین میں ہے وہیں سے بھڑک کر سارے سمندر اور دریا اُس کی آگ میں شامل ہوجائیں گے، اور سب کے سامنے آجائے گی، جہنم کے لائے جانے کا بھی یہ مطلب ہوسکتا ہے، اس طرح جن

روایات میں یہ آیا ہے کہ سجّین جہنم کے ایک مقام کا نام ہے وہ بھی اس پر منطبق ہو گیا۔ (مظہری) واللہ اعلم (معارف القرآن ص ۶۹۵، ج ۸، سورہ تطفیف پ ۳۰)

جنت و دوزخ کا جائے وقوع

عِندَهَا جَنَّةُ الْمَاوىٰ (سورہ نجم پ ۲۷)

اس آیت نے یہ بھی بتلا دیا کہ جنت اس وقت بھی موجود ہے جیسا کہ جمہور امت کا عقیدہ یہی ہے کہ جنت و دوزخ قیامت کے بعد پیدا نہیں کی جائیں گی، یہ دونوں مقام اس وقت بھی موجود ہیں، اس آیت نے جنت کا محل وقوع بھی بتلا دیا کہ وہ ساتویں آسمان کے اوپر، عرش رحمان کے نیچے ہے، گویا ساتواں آسمان جنت کی زمین اور عرشِ رحمان اس کی چھت ہے۔

دوزخ کا محل وقوع کسی آیتِ قرآن یا روایت حدیث میں صراحتاً نہیں بتلایا، سورہ طور کی آیت وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ سے بعض مفسرین نے یہ مفہوم نکالا ہے کہ دوزخ سمندر کے نیچے زمین کے قعر میں ہے، جس پر اس وقت کوئی بھاری اور سخت غلاف چڑھا ہوا ہے، جو قیامت میں پھٹ جائے گا اور اس کی آگ پھیل کر پورے سمندر کو آگ میں تبدیل کر دے گی۔

زمانۂ حال میں یورپ کے بہت سے ماہرین نے جو زمین کو برما کر ایک طرف سے دوسری طرف جانے کا راستہ بنانے کی کوشش سالہا سال جاری رکھی، اور بڑی سے بڑی مشینیں اس کام کے لئے ایجاد کیں، مختلف جماعتوں نے اس پر محنت خرچ کی، سب سے زیادہ جو جماعت کامیاب ہوئی وہ مشینوں کے ذریعے زمین کی گہرائی میں چھ میل تک پہنچ سکی، مگر چھ میل کے بعد سخت پتھر نے ان کو عاجز کر دیا، تو پھر دوسری جگہ سے کھدائی شروع کی، مگر وہی چھ میل کے بعد سخت پتھر سے سابقہ پڑا متعدد جگہوں میں

اس کا تجربہ کرنے کے بعد ان کی تحقیق یہ قرار پائی کہ چھ میل کی گہرائی کے بعد کوئی غلاف حجری پوری زمین پر چڑھا ہوا ہے جس میں کوئی مشین کام نہیں کر سکتی، زمین کا قطر جو ہزاروں میل کا ہے اس میں سے سائنس کے اس عروج کے زمانے میں سائنس کی رسائی صرف چھ میل تک ہو سکی آگے غلاف حجری کا اقرار کر کے اپنی کوشش چھوڑنا پڑی، اس واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ پوری زمین کسی غلاف حجری سے بند کی ہوئی ہے، اگر کسی روایتِ صحیحہ سے جہنم کا محل وقوع اس غلاف کے اندر ہونا ثابت ہو جائے تو بعید کچھ نہیں۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۲۰۰ سورہ نجم پ ۲۷)

جنت البقیع کی تعریف

یہ مدینہ طیبہ کا وہ قبرستان ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا سیدنا عباسؓ اور سیدنا امام حسن اور سیدنا عثمان غنیؓ اور دیگر ہزار ہا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین مدفون ہیں۔ علاوہ ازیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے سیدنا ابراہیم، حضرت فاطمہ، حلیمہ سعدیہ اور امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن اجمعین بھی یہیں مدفون ہیں، سوائے حضرت میمونہؓ کے کیوں کہ ان کا مدفن مقام سرف ہے۔ (احکام حج ص:۱۰)

جنت المعلیٰ کی تعریف

مکہ کا وہ قبرستان ہے جہاں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے اور دوسرے صحابۂ کرامؓ مدفون ہیں، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی قبر بھی یہیں ہے۔ (احکام حج)

جنت الماویٰ کی تعریف

ماویٰ کے معنیٰ ٹھکانا اور آرام کی جگہ، جنت کو ماویٰ اس لئے فرمایا کہ انسان کا

اصل ٹھکانا اور مقام یہی ہے، یہیں آدم وحوا علیہما السلام کی تخلیق ہوئی ہے یہیں سے ان کو زمین پر اتارا گیا، اور پھر یہیں اہل جنت کا مقام ہوگا۔

(معارف القرآن ج ۸ ص ۲۰۰ سورہ نجم پ ۲۷)

جناح کے معنی

جناح کے معنی بازو کے ہیں، لفظی معنی یہ ہیں کہ والدین کے لیے اپنے بازو عاجزی اور ذلت کے ساتھ جھکائے۔ (معارف القرآن ۴۴۵/۵، بنی اسرائیل)

جہاد کی تعریف

جہاد کے اصلی معنیٰ دین میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے ہیں، اس میں وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو کفار و فجار کی طرف سے پیش آتی ہیں، کفار سے جنگ مقاتلہ اس کی اعلیٰ فرد ہے، اور وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو اپنے نفس اور شیطان کی طرف سے پیش آتی ہیں۔

(معارف القرآن ص ۷۱۶، ج ۶، سورہ عنکبوت پ ۲۱)

جہاد باللسان کی تعریف

یَاأَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ واغْلُظْ عَلَیہِم (سورہ توبہ پ ۱۰)

اس آیت میں کفار اور منافقین دونوں سے جہاد اور ان کے معاملے میں شدت اختیار کرنے کا حکم رسول ﷺ کو دیا گیا ہے، ظاہری کفار سے جہاد کا معاملہ تو واضح ہے، لیکن منافقین سے جہاد کا مطلب خود رسول ﷺ کے تعامل سے یہ ثابت ہوا کہ ان کے ساتھ جہاد سے مراد زبانی جہاد ہے کہ ان کو اسلام کی حقانیت سمجھنے کی طرف دعوت دیں تاکہ وہ اپنے دعوای اسلام میں مخلص ہوجائیں (قرطبی ومظہری)

(معارف القرآن ص ۴۲۲، ج ۴، سورہ توبہ پ ۱۰)

جہاد بالقرآن کی تعریف

وَجَاهِدهُم بِهٖ جِهَاداً كَبِيراً (سورہ فرقان پ ۱۹)

یہ آیت مکی ہے جب کہ احکام، کفار سے قتال و جنگ کے نازل نہیں ہوئے تھے اسی لئے یہاں جہاد کو بہٖ کے ساتھ مقید کیا گیا، بہٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجح ہے، معنیٰ آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کے ذریعہ مخالفین اسلام سے جہاد کرو بڑا جہاد، قرآن کے ذریعے اس جہاد کا حاصل اس کے احکام کی تبلیغ اور خلقِ خدا کو اس کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش ہے خواہ زبان سے ہو یا قلم سے یا دوسرے طریقوں سے اس سب کو یہاں جہاد کبیر فرمایا ہے۔ (معارف القرآن ص ۴۷۳، ج ۶، سورہ فرقان پ ۱۹)

جہاد کی لغوی و شرعی تعریف اور اس کے اقسام

''جہاد'' لغت میں کسی کام کے لیے اپنی پوری کوشش اور توانائی خرچ کرنے کے ہیں، اور شریعت کی اصطلاح میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور دشمن کی مدافعت کرنے میں جان، مال، زبان اور قلم کی پوری طاقت خرچ کرنے کو جہاد کہا جاتا ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ نے لفظ جہاد کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ جہاد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک کھلے دشمن کا مقابلہ، دوسرے شیطان اور اس کے پیدا کئے ہوئے خیالات کا مقابلہ، تیسرے خود اپنے نفس کی ناجائز خواہشات کا مقابلہ۔

مطلب یہ ہے کہ جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے راستہ میں رکاوٹ ہے اس کی مدافعت جہاد ہے، اور یہ رکاوٹ عادتاً انہیں تین طرفوں سے ہوتی ہے، اس لیے جہاد کی تین قسمیں ہوگئیں، امام راغب نے یہ تین قسمیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ارشاد قرآنی: ''وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ'' یعنی جہاد کرو اللہ کی راہ میں پورا جہاد، یہ جہاد تینوں قسموں کو شامل ہے، بعض روایات حدیث میں نفس کی

ناجائز خواہشات کا مقابلہ اسی لیے جہاد قرار دیا ہے۔

قرآن کریم کی کئی آیتوں میں جہاد کے لیے مال خرچ کرنے کو بھی جہاد فرمایا ہے ''وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ'' کا بھی یہی مطلب ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی غازی کو سامان جہاد دے دیا اس نے بھی جہاد کرلیا۔

اور ایک حدیث میں زبان کے جہاد کو بھی جہاد قرار دیا ہے، اور قلم چونکہ ادائے مضمون میں زبان ہی کے حکم میں ہے، اس لیے قلمی دفاع کو علمائے امت نے جہاد میں شامل فرمایا ہے۔

مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا کہ لفظ جہاد اصطلاح شرع میں اللہ کی راہ میں پیش آنے والی ہر رکاوٹ کے مقابلہ اور مدافعت کے لیے عام معنی میں استعمال ہوتا ہے، مگر عرفِ عام میں جب لفظ جہاد بولا جاتا ہے تو عموماً اس کے معنی دشمنانِ دین کے مقابلہ میں جنگ ہی سمجھے جاتے ہیں، جس کے لیے قرآن کریم نے لفظ قتال یا مقاتلہ استعمال فرمایا ہے۔ (رسالہ جہاد ص:۱۰۰۹)

جہاد کا عام حکم

جہاد عام حالات میں فرض کفایہ ہے جس کا حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کی کچھ جماعت جو جہاد کے لیے کافی ہو جہاد میں مشغول رہے، تو باقی مسلمان بھی فرض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں، ہاں اگر جہاد میں شریک ہونے والی جماعت کافی نہ ہو وہ مغلوب ہونے لگے تو آس پاس کے مسلمانوں پر ان کی تقویت کے لیے نکلنا اور جہاد میں شریک ہونا فرض ہوجاتا ہے، وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے قریب کے لوگوں پر اور وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے متصل جو مسلمان ہیں ان پر یہاں تک کہ

سارے عالم کے مسلمانوں پر ایسی حالت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، جس سے تخلف حرام ہے۔

اسی طرح فرض ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا امیر ضرورت سمجھ کر نفیر عام کرے اور سب مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دے، تو اس وقت بھی جہاد کی شرکت فرض اور تخلف حرام ہو جاتا ہے، جیسا واقعہ غزوہ تبوک میں نفیر عام کی وجہ سے پیش آیا، مذکورالصدر آیت میں اسی حکم کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ غزوہ تبوک میں نفیر عام کی وجہ سے خصوصی حکم تھا، عام حالات میں جہاد فرض عین نہیں کہ سب مسلمانوں پر جہاد میں جانا فرض ہو کیونکہ جہاد کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مسائل اور مہمات بھی ہیں، جو جہاد ہی کی طرح فرض کفایہ ہیں ان کے لیے بھی مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تقسیم کار کے اصول پر کام کرنا ہے اس لیے سب مسلمانوں کو ہر جہاد میں نکلنا نہیں چاہیئے۔ (معارف القرآن ۴/۴۸۷، سورہ توبہ پ ۱۰)

جہاد فی سبیل اللہ کی حقیقت

وَجَاهِدُوْا فِي سَبِيْلِهٖ:(سورہ مائدہ پ ٦)

یعنی جہاد کرو، اللہ کی راہ میں اگرچہ اعمال صالحہ میں جہاد بھی داخل تھا، لیکن اعمال صالحہ میں جہاد کا اعلیٰ مقام بتلانے کے لیے اس کو علیحدہ کرکے بیان فرمادیا گیا، جیسا کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "**وذروة سنامه الجهاد**" یعنی اسلام کا اعلیٰ مقام جہاد ہے، دوسرے اس جگہ جہاد کو اہمیت کے ساتھ ذکر کرنے کی یہ حکمت بھی ہے کہ پچھلی آیتوں میں فساد فی الارض کا حرام و ناجائز ہونا، اور اس کی دنیوی اخروی سزاؤں کا بیان آیا تھا، جہاد بھی ظاہر کے اعتبار سے فساد فی الارض کی صورت معلوم ہوتی ہے، اس لیے ممکن تھا کہ کوئی ناواقف جہاد اور فساد میں فرق نہ سمجھے، اس لیے فساد فی الارض کی ممانعت کے بعد جہاد کا حکم اہمیت کے ساتھ

ذکر کر کے دونوں کے فرق کی طرف لفظ فی سبیلہ سے اشارہ فرما دیا، کیونکہ ڈاکہ، بغاوت وغیرہ میں جو قتل وقتال اور مال لوٹا جاتا ہے وہ محض اپنی ذاتی اغراض و خواہشات اور ذلیل مقاصد کے لیے ہوتا ہے، اور جہاد میں اگر اس کی نوبت آئے بھی تو محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور ظلم و جور کو مٹانے کے لیے ہے، جن میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ (معارف القرآن ۱۲۸/۳، سورہ مائدہ پ ۶)

جہالت کی تعریف

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ (سورہ انعام پ ۷)

اس آیت میں لفظ جہالت سے بظاہر کسی کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ گناہ کی معافی کا وعدہ صرف اس صورت میں ہے جب کہ ناواقفیت اور جہل کے سبب کوئی گناہ سرزد ہو جائے ، جان بوجھ کر گناہ کرنے والا اس حکم میں داخل نہیں، لیکن حقیقت یہ نہیں کیونکہ جہالت سے مراد اس جگہ عمل جہالت ہے، یعنی ایسا کام کر بیٹھے جیسا نتیجہ سے جاہل و بے خبر کیا کرتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ واقع میں جاہل ہو، اس کی تائید خود لفظ جہالت سے بھی ہوتی ہے، کہ یہاں لفظ جہل کے بجائے جہالت کا لفظ شاید اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہی استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ جہل تو علم کا مقابل ہے، اور جہالت علم ووقار کے مقابل ہے، یعنی لفظ جہالت محاورات میں بولا ہی جاتا ہے عملی جہالت کے لیے، اور اگر غور کیا جائے تو گناہ جب بھی کسی سے سرزد ہوتا ہے تو اس عملی جہالت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی لیے بعض بزرگوں کا قول ہے کہ جو شخص اللہ ورسول کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ جاہل ہے، مراد اس سے یہی عملی جہالت ہے، ناواقف اور بے علم ہونا ضروری نہیں۔

(معارف القرآن ۳۳۹/۳، سورہ انعام پ ۷)

ح

حاجت کی تعریف

حاجت کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو ہلاک تو نہیں ہوگا مگر مشقت اور تکلیف شدید ہوگی، یہ صورت اضطراب کی نہیں اس لیے اس کے واسطے روزے، نماز، طہارت وغیرہ کے بہت سے احکام میں رعایت اور سہولتیں تو دی گئی ہیں مگر ایسی حالت میں حرام چیزیں نص قرآنی کے تحت حلال نہیں ہوں گی۔

(جواہر الفقہ ،اعضاءانسانی کی پیوندکاری: ۳۵/۷)

حج کی تعریف

حج کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن وسنت میں خاص خانہ کعبہ کا قصد کرنے اور وہاں افعال مخصوصہ کے ادا کرنے کو حج کہا جاتا ہے۔

(معارف القرآن سورۂ بقرہ ۴۰۰/۱)

حجت کی تعریف

لَاحُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ: (سورہ شوریٰ پ۲۵) حجت سے مراد بحث ومباحثہ ہے، مراد یہ ہے کہ حق واضح اور ثابت ہوجانے کے بعد بھی اگر تم عناد سے کام لیتے ہو تو اب گفتگو فضول ہے۔

(معارف القرآن، سورۂ شوریٰ پ۲۵، ۶۸۱/۷)

حجر اسود کی تعریف

سیاہ پتھر، یہ جنت کا پتھر ہے، جنت سے آنے کے وقت دودھ کے مانند سفید تھا، لیکن بنی آدم کے گناہوں نے اس کو سیاہ کردیا، یہ بیت اللہ کے مشرق جنوبی

گوشے میں قدِ آدم کے قریب اونچائی پر دیوار میں گڑا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف چاندی کا حلقہ چڑھا ہوا ہے۔ (احکام حج ص:۱۱)

حدیبیہ کی تعریف

جدّہ سے مکہ جانے والے راستہ پر حدودِ حرم سے پہلے ایک مقام کا نام ہے، آج کل یہ شمیسیہ کے نام سے معروف ہے، اسی جگہ ایک مسجد بنی ہوئی ہے یہاں نبی علیہ السلام نے کفار کے ساتھ ایک معاہدہ فرمایا تھا، اور بیعت الرضوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں پر صحابۂ کرامؓ سے لی تھی، یہاں سے حرم کی حد شروع ہوتی ہے۔ (احکام حج ص:۱۱)

حدیث کی تعریف

یہ ظاہر ہے کہ معانی قرآن وہی (معتبر) ہیں جن کی تعلیم دینے کے لئے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے ''**لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ**'' یعنی آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ آپ بتلادیں لوگوں کو مفہوم اس کلام کا جو ان کے لئے نازل کیا گیا ہے، اور یہی معنیٰ اس آیت کے ہیں، **وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ**، اور اسی لئے آپ نے فرمایا: ''**اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً** میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں'' اور جب رسول اللہ ﷺ کو معانی قرآن کے بیان اور تعلیم کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے امت کو جن اقوال وافعال کے ذریعہ تعلیم دی، انہیں اقوال وافعال کا نام حدیث ہے۔ (معارف القرآن ص۲۷۲، ج۵)

حرب اور محاربہ کی تعریف

لفظ ''**مُحَارَبَه**'' حرب سے ماخوذ ہے، اور اس کے اصل معنیٰ سلب کرنے اور چھین لینے کے ہیں، اور محاورات میں یہ لفظ ''سلم'' کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے، جس

کے معنیٰ امن وسلامتی کے ہیں، تو معلوم ہوا کہ حرب کا مفہوم بدامنی پھیلانا ہے، اور ظاہر ہے کہ اِکا دُکا چوری یا قتل وغارت گری سے امن عامہ سلب نہیں ہوتا، بلکہ یہ صورت جبھی ہوتی ہے کہ جب کہ کوئی طاقت ور جماعت رہزنی اور قتل وغارت گری پر کھڑی ہوجائے، اسی لئے حضرات فقہاء نے اس سزا کا مستحق صرف اس جماعت یا فرد کو قرار دیا ہے جو مسلح ہوکر عوام پر ڈاکے ڈالے، اور حکومت کے قانون کو قوت کے ساتھ توڑنا چاہے، جس کو دوسرے لفظوں میں ڈاکو یا باغی کہا جاسکتا ہے، عام انفرادی جرائم کرنے والے چور، گرہ کٹ وغیرہ داخل نہیں ہیں۔ (تفسیر مظہری) (معارف القرآن ج۳/۱۱۹، مائدہ: پ۶)

حرمات اللہ کی تعریف

حرمات اللہ سے مراد اللہ کی محترم اور معزز بنائی ہوئی چیزیں یعنی احکام شرعیہ ہیں، ان کی تعظیم یعنی ان کا علم حاصل کرنا اور ان پر عمل کرنا سرمایۂ سعادت دنیا و آخرت ہے۔ (معارف القرآن ۶/۲۶۲، سورۂ حج پ۱۷)

حرم اور حرمی کی تعریف

مکہ مکرمہ کے چاروں طرف کچھ دور تک زمین حرم کہلاتی ہے، اس کی حدود پر نشانات لگے ہوئے ہیں، اس میں شکار کھیلنا، درخت کاٹنا، جانور کو گھاس چرانا حرام ہے۔

حرمی: وہ شخص جو زمین حرم میں رہتا ہو خواہ مکہ میں رہتا ہو یا مکہ سے باہر حدودِ حرم میں۔ (احکام حج)

حروف مقطعات کی تعریف

الٓمٓ (بقرہ پ۱) بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حرفوں سے مرکب ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے الٓـــمٓ، حٰمٓ وغیرہ ان کو اصطلاح میں حروف مقطّعہ کہا جاتا

ہے، ان میں سے ہر حرف جدا جدا ساکن پڑھا جاتا ہے، الف، لام، میم۔

حروف مقطّعہ جو اوائل سور میں آئے ہیں ان کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اسمائے الٰہیہ کے رموز ہیں، مگر جمہور صحابہ وتابعین اور علمائے امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز واسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں، اور ہوسکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو، جس کی تبلیغ امت سے روک دی گئی ہو، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر وتشریح میں کچھ منقول نہیں۔

جمہور صحابہ کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں ہمیں ان پر ایمان لانا چاہئے کہ اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور جس طرح آئے ہیں ان کی تلاوت کرنا چاہئے مگر معنیٰ معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں۔

عامر شعبی، سفیان ثوری اور ایک جماعت محدثین نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رموز واسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حروف مقطّعہ قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہے، اسی لئے یہ ان متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، ہمارے لئے ان میں بحث وگفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے لئے فائدہ سے خالی نہیں، اول تو ان پر ایمان لانا پھر ان کا پڑھنا ہمارے لئے ثواب عظیم ہے، دوسرے ان کے پڑھنے کے معنوی فوائد وبرکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں پہنچتے ہیں۔

(معارف القرآن ص:۱۰۷ ج ا البقرہ پ ا)

الٓرٰ (سورہ یونس پ ۱۱) یہ حروف مقطّعہ کہلاتے ہیں جو قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں، الٓمٓ، حٰمٓ، عٓسٓقٓ، وغیرہ ان کے معانی کی تحقیق میں مفسرین کی بحثیں طویل ہیں، صحابہ وتابعین اور جمہور سلف کی تحقیق

اس قسم کے تمام حروفِ مقطعہ کے متعلق یہ ہے کہ یہ خاص رموز ہیں، ان کے معنیٰ غالباً رسول کریم ﷺ کو بتلائے گئے ہیں مگر آپ نے عام اُمت کو صرف اُن علوم و معارف سے آگاہ فرمایا جن کو ان کے ذہن برداشت کرسکیں اور جن کے معلوم نہ ہونے سے اُمت کے کاموں میں کوئی حرج واقع ہوتا ہے، حروفِ مقطعہ کے رموز ایسے نہیں جن پر امت کا کوئی کام موقوف ہو یا ان کے نہ جاننے سے اُن کا کوئی حرج ہو اس لئے رسول کریم ﷺ نے بھی ان کے معانی کو امت کے لئے غیر ضروری سمجھ کر بیان نہیں فرمایا، اس لئے ہمیں بھی اس کی تفتیش میں نہ پڑنا چاہئے، کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر ان کے معانی جاننے میں ہماری مصلحت ہوتی تو رحمتِ عالم ﷺ اس کے بیان کرنے میں کوتاہی نہ فرماتے۔ (معارف القرآن ج ۴، ص ۴۹۹، سورہ یونس پ ۱۱)

حزبِ کی تعریف

احزاب حزب کی جمع ہے، جس کے معنیٰ پارٹی یا جماعت کے آتے ہیں، اس غزوہ میں کفار کی مختلف جماعتیں متحد ہوکر مسلمانوں کو ختم کردینے کا معاہدہ کرکے مدینہ پر چڑھ آئی تھیں، اس لئے اس غزوہ کا نام غزوہ احزاب رکھا گیا ہے، اور چونکہ اس غزوہ میں دشمن کے آنے کے راستہ پر بامر نبی ﷺ خندق کھودی گئی تھی، اس لئے اس غزوہ کو غزوہ خندق بھی کہتے ہیں۔ (معارف القرآن ج ۷ ص ۱۰۰ سورہ احزاب پ ۲۱)

حسد کی تعریف

علامہ نوویؒ شارح مسلم حسد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں: **الحسد تمنی زوال النعمة** یعنی دوسرے آدمی کی نعمت کے زوال کی خواہش کرنا حسد کہلاتا ہے اور یہ حرام ہے، حسد خواہ دنیاوی کمال پر ہو یا دینی کمال پر دونوں حرام ہیں۔

(معارف القرآن ۴۳۹/۲، سورہ نساء پ ۵)

حسنات کی تعریف

اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَات (ہود پ۱۲) یعنی نیک کام مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو، حضرات مفسرین نے فرمایا کہ نیک کام سے تمام نیک کام مراد ہیں جن میں نماز، روزہ، زکوۃ، صدقات، حسن خلق، حسن معاملہ وغیرہ سب داخل ہیں، مگر نماز کو ان سب میں اولیت حاصل ہے، اسی طرح ''سیئات'' کا لفظ تمام برے کاموں کو حاوی اور شامل ہے خواہ وہ کبیرہ گناہ ہوں یا صغیرہ لیکن قرآن مجید کی ایک دوسری آیت نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات نے اس کو صغیرہ گناہوں کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، معنی یہ ہیں کہ نیک کام جن میں نماز سب سے افضل ہے، صغیرہ گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں اور ان کے گناہ کو مٹا دیتے ہیں، قرآن کریم میں ہے ''اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ'' یعنی اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہو تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کا خود کفارہ کر دیں گے۔

(معارف القرآن ۴/۶۷۷، سورہ ہود پ۱۲)

حسنہ کی تعریف

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً. الخ (سورہ بقرہ پ۲)

اس میں لفظ حسنہ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے، مثلاً دنیا کی حسنہ میں بدن کی صحت، اہل وعیال کی صحت، رزق حلال میں وسعت وبرکت دنیوی، سب ضروریات کا پورا ہونا اعمال صالحہ، اخلاق محمودہ، علم نافع، عزت ووجاہت، عقائد کی درستی، صراط مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں، اور آخرت کی حسنہ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دعاء ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں، دنیا و آخرت دونوں جہاں میں راحت و سکون میسر آتا ہے۔
(معارف القرآن ج ۱ص ۴۹۲ سورہ بقرہ پ ۲)

حسن عمل کی تعریف

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا یہاں تک کہ اَحْسَنُ عَمَلًا تک پہونچے تو فرمایا کہ: اَحْسَنُ عَمَلًا وہ شخص ہے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے سب سے زیادہ پرہیز کرنے والا ہو اور اللہ کی اطاعت میں ہر وقت مستعد و تیار ہو۔ (قرطبی) (معارف القرآن ج ۸ص ۵۱۷ سورہ ملک پ ۲۹)

حطیم کی تعریف

بیت اللہ کی شمالی جانب بیت اللہ سے متصل قدِّ آدم دیوار سے کچھ حصہ زمین کا گھرا ہوا ہے، اس کو حطیم، حجر اور حظیرہ بھی کہتے ہیں، اس حصہ کو بھی طواف میں شامل کرنا واجب ہے۔ یہ کعبہ شریف کا حصہ ہے، قریش مکہ نے زمانۂ اسلام سے قبل کعبہ شریف کی تعمیر کی تھی تو حلال خرچہ کی کمی کے باعث اس حصہ کی تعمیر چھوڑ دی تھی۔ (احکام حج ص:۱۱)

حفیظ کے معنی

''حفیظ'' کے معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بتلائے ہیں کہ جو شخص اپنے گناہوں کو یاد رکھے تاکہ ان سے رجوع کر کے تلافی کرے، اور ان سے ایک روایت میں حفیظ کے معنی ''ھو الحافظ لامر اللہ'' کے بھی منقول ہیں، یعنی جو شخص اللہ کے احکام کو یاد رکھے۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شروع دن میں چار رکعتیں اشراق کی پڑھ لے وہ اواب اور حفیظ ہے۔ (قرطبی، معارف القرآن ۱۴۷/۸، سورہ ق پ: ۲۶)

حُقب اور احقاب کی تعریف

''احقاب'' حِقبہ کی جمع ہے، زمانہ دراز کو حقبہ کہا جاتا ہے، اس کی مقدار میں اقوال مختلف ہیں، ابن جریر نے حضرت علیؓ سے اس کی مقدار اسّی سال نقل کی، اور ہر سال بارہ مہینے کا، اور ہر مہینہ تیس دن کا اور ہر دن ایک ہزار سال کا، اس طرح تقریباً دو کروڑ اٹھاسی لاکھ سال کا ایک حقبہ، اور حضرت ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، ابن عباس وغیرہم نے مقدار حِقبہ اسّی کی بجائے ستّر سال قرار دی ہے، باقی حساب وہی ہے (ابن کثیر) مگر مسند بزار میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مرفوعاً یہ منقول ہیکہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ:

لا یخرج احدکم من النار حتی یمکث فیه احقاباً و الحقب بضع وثمانون سنةً، کل سنة ثلاث مائة وستّون یوماً ممّا تعدّون (ازمظہری)

تم میں سے جو لوگ گناہوں کی سزا میں جہنم میں ڈالے جائیں گے کوئی اس وقت تک جہنم سے نہ نکلے گا جب تک اس میں چند احقاب نہ رہ لے، اور حِقبہ کچھ اوپر اسّی سال کا، اور ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہے، تمہارے موجودہ دنوں کے مطابق۔

اس حدیث میں اگر چہ اس آیت مذکورہ کی تفسیر مذکور نہیں ہے مگر بہر حال لفظ احقاب کے معنی کا بیان ہے چند صحابہ کرام سے جو اس میں ہر دن ایک ہزار سال کا منقول ہے، اگر وہ بھی آنحضرت ﷺ سے سنا ہوا ہے تو روایات احادیث میں تعارض ہوا، اس تعارض کے وقت کسی ایک پر جزم ویقین تو نہیں ہوسکتا مگر اتنی بات دونوں ہی روایتوں میں مشترک ہیں کہ حقبہ یا حقب بہت ہی زیادہ طویل زمانے کا نام ہے، اسی لئے بیضاوی نے احقاباً کی تفسیر **دھـورا متتابـعة** سے کی ہے یعنی پے در پے بہت سے زمانے۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۶۵۶ سورہ نبا پ ۳۰)

حکمت کی تعریف

لفظ ''حکمت'' قرآن کریم میں متعدد معانی کے لیے استعمال ہوا ہے، علم، عقل، حلم بردباری، نبوت، اصابت رائے۔

ابو حیان نے فرمایا کہ حکمت سے مراد وہ کلام ہے جس سے لوگ نصیحت حاصل کریں اوران کے دلوں میں مؤثر ہو، اور جس کو لوگ محفوظ کر کے دوسروں تک پہنچائیں، اورابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حکمت سے مراد عقل وفہم اور ذہانت ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ علم کے مطابق عمل کرنا حکمت ہے، اور درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں، یہ سبھی چیزیں حکمت میں داخل ہیں۔ (معارف القرآن، لقمان ۷/۳۵)

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ: (سورہ بقرہ پ۱) اس میں کتاب سے مراد کتاب اللہ ہے، اور الحکمۃ کا لفظ عربی لغت میں کئی معنی کے لیے آتا ہے، حق بات پر پہنچنا، عدل وانصاف، علم وحلم وغیرہ (قاموس) امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں کہ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کے لیے بولا جائے تو موجودات کی صحیح معرفت اور نیک اعمال کے لیے جاتے ہیں۔ ترجمہ شیخ الہند میں اس کا ترجمہ ''تہہ کی باتیں'' اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے، اور لفظ حکمت عربی زبان میں کئی معنی کے لیے بولا جاتا ہے، علم صحیح، نیک عمل، عدل وانصاف، قول صادق وغیرہ۔ (قاموس وراغب)

اس لیے دیکھنا ہے کہ اس آیت میں لفظ حکمت سے کیا مراد ہے، مفسرین صحابہ وتابعین جو معانی قرآن کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر کرتے ہیں، اس جگہ لفظ حکمت کے معنی بیان کرنے میں اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہیں، لیکن خلاصہ سب کا ایک ہی ہے یعنی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، امام تفسیر ابن کثیر وابن جریرؒ نے حضرت قتادہ سے یہی تفسیر نقل کی ہے، کسی نے تفسیر قرآن اور کسی نے تفقہ فی الدین فرمایا

ہے، اور کسی نے علم احکام شرعیہ کہا اور کسی نے کہا کہ ایسے احکامات الٰہیہ کا علم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی بیان سے معلوم ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان سب کا حاصل وہی حدیث وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ (معارف القرآن ۱/۱/۳۳۱، سورۂ بقرہ پ۱)

لفظ حکمت قرآن کریم میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے، اس جگہ (اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ) بعض ائمۂ تفسیر نے حکمت سے مراد قرآن کریم، بعض نے قرآن وسنت، بعض نے حجت قطعیہ کو قرار دیا ہے، اور روح المعانی نے بحوالۂ بحر محیط حکمت کی یہ تفسیر کی ہے:

اِنَّهَا الْکَلَامُ الصَّوَابُ الوَاقِعُ مِنَ النَّفْسِ أَجْمَلَ مَوْقِعٍ.(روح)

ترجمہ: حکمت اس درست کلام کا نام ہے جو انسان کے دل میں اتر جائے۔

اس تفسیر میں تمام اقوال جمع ہو جاتے ہیں، اور صاحب روح البیان نے بھی تقریباً یہی مطلب بیان فرمایا ہے کہ "حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کے ذریعہ انسان مقتضیاتِ احوال کو معلوم کر کے اس کے مناسب کلام کرے، وقت اور موقع ایسا تلاش کرے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی جگہ سختی اختیار کرے، اور جہاں یہ سمجھے کہ صراحةً کہنے میں مخاطب کو شرمندگی ہوگی، وہاں اشارات سے کلام کرے، یا کوئی ایسا عنوان اختیار کرے کہ مخاطب کو نہ شرمندگی ہو اور نہ اس کے دل میں اپنے خیال پر جمنے کا تعصب پیدا ہو۔ (معارف القرآن ج ۵/۴۲۰، نحل: پ۱۴)

حکمت کے معنیٰ اور اس کی تعریف

یُوتِی الحِکمَةِ مَن یَّشَاء (پ۳، سورہ بقرہ)

لفظ حکمت قرآن کریم میں بار بار آیا ہے، اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، تفسیر بحر محیط میں اس جگہ تمام اقوال مفسرین کو جمع کیا ہے، وہ تقریباً تیس ہیں، مگر آخری میں فرمایا کہ در حقیقت یہ سب اقوال متقارب ہیں، ان میں کوئی اختلاف

نہیں صرف تعبیرات کا فرق ہے، کیونکہ لفظ حکمت احکام بالکسر کا مصدر ہے جس کا معنیٰ ہے کسی عمل یا قول کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا اس لئے بحر محیط میں آیت بقرہ اٰتٰہُ اللّٰہُ المُلکَ وَالحِکمَۃَ ،حضرت داوٗدؑ کے متعلق ہے اس کی تفسیر میں فرمایا: وَالحِکمَۃُ وَضعُ الاُمُورِ فِی مَحلِّھَا عَلی الصَّوابِ وَکَمَالُ ذٰلِکَ اِنَّمَا یَحصُلُ بِالنُبُوَّۃِ حکمت کے اصلی معنی ہر شیئ کو اس کے محل میں رکھنے کے ہیں اور اس کا کمال صرف نبوت سے ہوسکتا ہے اس لئے اس کی تفسیر یہاں نبوت سے کی گئی ہے۔امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ لفظ حکمت جب اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال کیا جائے تو معنیٰ تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تو موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل مراد ہوتا ہے، اسی مفہوم کی تعبیریں مختلف الفاظ میں کی گئی ہیں کسی جگہ اس سے مراد قرآن ہے، کسی جگہ حدیث، کسی جگہ علم صحیح، کہیں عمل صالح، کہیں قول صادق، کہیں عقل سلیم، کہیں فقہ فی الدین، کہیں اصابت رائے اور کہیں خشیت اللہ اور آخری معنیٰ تو خود حدیث میں بھی مذکور ہے رَأسُ الحِکمَۃِ خَشیَۃُ اللّٰہِ یعنی اصل حکمت خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے اور آیت یُعَلِّمھُمُ الکِتَابَ وَالحِکمَۃَ میں حکمت کی تفسیر صحابہ وتابعین سے حدیث وسنت منقول ہے اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ آیت زیر نظر ہے یُوتَ الحِکمَۃَ میں یہ سب چیزیں مراد ہے۔(بحر محیط ص۳۲۰،ج۲)اور ظاہر یہی قول ہے اور ارشاد قرآن وَمَن یُّوتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیراً کَثِیراً سے بھی اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے تو معنی اس کے یہ ہیں کہ جس شخص کو حکمت دے دی گئی اس کو خیر کثیر دے دی گئی۔واللہ اعلم (معارف القرآن ص۶۴۱،ج۱،سورہ بقرہ،پ۳)

حِل کی تعریف

حرم کے چاروں طرف میقات (یعنی حدودِ حرم سے) باہر اور مواقیت کے اندر

تک جو زمین ہے اس کو حل کہتے ہیں، کیوں کہ ان میں وہ چیزیں حلال ہیں جو حرم کے اندر حرام ہیں۔ حِلّی: زمین حل کا رہنے والا ہے۔(احکام حج)

حنین کی تعریف

حنین مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے دس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے۔ (معارف القرآن، توبہ ۳۴۴/۴)

حواری کی تعریف

لفظ ''حواری'' حور سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ لغت میں سفیدی کے ہیں، اصطلاح میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص ساتھیوں کو ان کے اخلاص اور صفائی قلب کی وجہ سے یا ان کی سفید پوشاک کی وجہ سے حواری کا لقب دیا گیا ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔ (معارف القرآن سورہ آل عمران پ ۳، ص ۲۷ ج ۲)

حیات انبیاء علیہم السلام کا مطلب اور حیات برزخی کے مختلف درجات

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ (سورہ بقرہ پ ۲)

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی رو سے ہر مرنے والے کو برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ قبر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مؤمن و کافر یا صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات ہیں، ایک درجہ تو سب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجے انبیاء و صالحین کے لئے مخصوص ہیں اور ان میں باہمی تفاضل ہے......اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیا کہا گیا، اور ان کو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی، مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مُردوں کی طرح ہیں، ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے، اور ان کی بیویاں

دوسرے سے نکاح کرسکتی ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ سلامت جسم کے علاوہ اس حیات برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں، مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، ان کی ازواج دوسرے کے نکاح میں نہیں آسکتیں، پس اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء، پھر اور معمولی مردے، البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء وصالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں۔

(معارف القرآن ج ا ص ۳۹۷ سورہ بقرہ پ ۲)

تمام انبیاء علیہم السلام خصوصاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گذرنے کے بعد بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں، ان کی یہ حیات برزخی عام لوگوں کی حیات برزخی سے بدرجہا زیادہ فائق وممتاز ہوتی ہے، جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

(معارف القرآن ص: ۱۷۸ ج ۷ سورہ احزاب پ ۲۲)

حیات طیبہ کی تعریف

جمہور مفسرین کے نزدیک یہاں حیاب طیّبہ سے مراد دنیا کی پاکیزہ اور بالطف زندگی ہے اور بعض ائمہ تفسیر نے اس سے آخرت کی زندگی مراد لی ہے اور جمہور کی تفسیر کے مطابق بھی اس سے یہ مراد نہیں کہ اس کو کبھی فقر وفاقہ اور بیماری پیش نہیں آئے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ مومن کو کبھی معاشی تنگی یا کوئی تکلیف بھی پیش آتی ہے تو وہ دو چیزیں اس کو پریشان نہیں ہونے دیتیں، ایک قناعت اور سادہ زندگی کی عادت جو تنگدستی میں بھی چل جاتی ہے دوسرے اس کا یہ عقیدہ کہ مجھے اس تنگی اور بیماری کے بدلے میں آخرت کی عظیم الشان دائمی نعمتیں ملنے والی ہیں، بخلاف کافر وفاجر کے کہ اگر اس کو تنگ دستی اور بیماری پیش آتی ہے تو اس کیلئے کوئی تسلی کا سامان نہیں ہوتا، عقل وہوش کھو بیٹھتا ہے بعض

اوقات خودکشی کی نوبت آجاتی ہے اور اگر اس کو فراخی عیش بھی نصیب ہو تو اس کو زیادتی کی حرص کسی وقت چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، وہ کروڑ پتی ہو جاتا ہے تو ارب پتی بننے کی فکر اس کے عیش کو خراب کرتی رہتی ہے، ابن عطیہؒ نے فرمایا کہ مومنین صالحین کو حق تعالیٰ دنیا میں بھی فرحت و انبساط اور پرلطف زندگی عطا فرماتے ہیں جو کسی بھی حال میں متغیر نہیں ہوتی، تندرستی اور فراخ دستی کے وقت تو ان کی زندگی کا پرلطف ہونا ظاہر ہے ہی خصوصاً اس بناء پر کہ بلاضرورت مال کو بڑھانے کی حرص ان میں نہیں ہوتی جو انسان کو ہر حال میں پریشان رکھتی ہے اور اگر تنگ دستی یا بیماری بھی پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر ان کا مکمل یقین ہر مشکل کے بعد آسانی، کلفت کے بعد راحت ملنے کی قوی امید ان کی زندگی کو بے لطف نہیں ہونے دیتی، جیسے کاشتکار کھیت بولے اور اس کی پرورش کے وقت اس کو کتنی ہی تکلیفیں پیش آجائیں سب کو اس لئے راحت محسوس کرتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کا بڑا صلہ اس کو ملنے والا ہے، تاجر اپنی تجارت میں، ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں کیسی کیسی محنت ومشقت بلکہ بعض اوقات ذلت بھی برداشت کرتا ہے مگر اس لئے خوش رہتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کو تجارت کا بڑا نفع یا ملازمت کی تنخواہ ملنے کا یقین ہوتا ہے، مومن کا بھی یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ مجھے ہر تکلیف پر اجر مل رہا ہے اور آخرت میں اس کا بدلہ دائمی عظیم الشان نعمتوں کی صورت میں ملے گا اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس لئے یہاں کے رنج وراحت اور سرد وگرم سب کو آسانی سے برداشت کر لیتا ہے اس کی زندگی ایسے حالات میں بھی مشوّش اور بے لطف نہیں ہوتی، یہی وہ حیات طیّبہ ہے جو مومن کو دنیا میں نقد ملتی ہے۔

(معارف القرآن ج ۵، ص ۳۹۸، ۳۹۹، سورہ نحل پ ۱۴)

خ

خالق اور صانع کی تعریف اور دونوں کا فرق

خلق وتخلیق کے اصلی معنیٰ کسی چیز کو ازسرِ نو بغیر کسی مادّہ سابقہ کے پیدا کرنا ہے، جو حق تعالیٰ جلّ شانہٗ کی مخصوص صفت ہے، اس معنیٰ کے اعتبار سے خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، کوئی دوسرا شخص فرشتہ ہو یا انسان کسی ادنیٰ چیز کا خالق نہیں ہوسکتا، لیکن کبھی کبھی یہ لفظِ خلق وتخلیق صنعت کے معنیٰ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے،

اور صنعت کی حقیقت اس سے زائد نہیں کہ اللہ جلّ شانہٗ نے جو مواد اور عناصر اس جہاں میں اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرمادئے ہیں ان کو جوڑ توڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ مرکب کرکے ایک نئی چیز بنادی جائے، یہ کام ہر انسان کرسکتا ہے اور اسی معنیٰ کے لحاظ سے کسی انسان کو بھی کسی خاص چیز کا خالق کہہ دیا جاتا ہے، خود قرآن کریم نے فرمایا **تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا** اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا **اِنِّیْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْئَةِ الطَّیْرِ** ان تمام مواقع میں لفظ خلق مجازی طور پر صنعت کے معنیٰ میں بولا گیا ہے۔ (معارف القرآن ج۶ ص۳۰۴، سورہ مؤمنون پ۱۸)

خراجی زمین کی تعریف

اگر کوئی ملک صلح کے ساتھ فتح ہوا تو اس کی زمینوں کے تمام معاملات ان شرائط صلح کے مطابق ہوں گے جن پر معاہدہ صلح ہوا ہے، اگر اس صلح نامہ میں یہ شرط ہے کہ یہ لوگ اپنے مذہب پر رہیں گے اور اراضی بدستور انہیں لوگوں کی ملکیت رہیں گی جن

کی ملکیت میں اب تک تھیں تو اس صورت میں اس کی زمینوں پر خراج لگا دیا جائے گا، اور یہ زمینیں ہمیشہ کے لیے خراجی ہو جائیں گی، کیونکہ ان کے مالک غیر مسلم ہیں، ان کی زمینوں کے لیے حکم خراج متعین ہے۔

اسی طرح اگر کوئی ملک جنگ کے ساتھ فتح ہوا مگر فتح کے بعد امام مسلمین نے اس کی زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم نہیں کیا بلکہ اپنے اختیار سے مالکان سابق کی ملکیت بدستور قائم رکھی تو یہ زمینیں بھی سب خراجی زمینیں ہوں گی جیسے شام، عراق، اور مصر کی زمینوں کے ساتھ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہی معاملہ فرمایا بجز خاص حصوں کے جو مسلمانوں کو دیئے گئے یا بیت المال کے لیے رکھے گئے۔

(جواہر الفقہ، عشر و خراج کے احکام ۳۳۶/۳)

خراج مؤظف و خراج مقاسمہ کی تعریف

خراج مقاسمہ کے معنی بٹائی کے ہیں کہ پیداوار کا کوئی حصہ نصف یا ثلث مقرر کر دیا جائے۔ اور خراج مؤظف کے معنی یہ ہیں کہ نقد رقم مقرر کر دی جائے۔

(عشر و خراج کے احکام جواہر الفقہ ۳۴۷/۳)

خسف اور مسخ کی تعریف

خسف کی معنیٰ زمین میں اُتر جانا اور مسخ کے معنیٰ صورتیں مسخ ہو کر بندر یا سُور وغیرہ جانوروں کی شکل میں تبدیل ہو جانا۔ (معارف القرآن ۲۲۵، ج ۴، سورہ انفال)

خشوع کی تعریف

خشوع کے لغوی معنی سکون کے ہیں، اصطلاح شرع میں خشوع یہ ہے کہ قلب میں بھی سکون ہو یعنی غیر اللہ کے خیال کو قلب میں بالقصد حاضر نہ کرے اور اعضاء بدن میں بھی سکون ہو کہ عبث اور فضول حرکتیں نہ کرے۔ (بیان القرآن) خصوصاً وہ

حرکتیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں منع فرمایا ہے اور فقہاء نے ان کو مکروہات نماز کے عنوان سے جمع کردیا ہے، تفسیر مظہری میں خشوع کی یہی تعریف حضرت عمرو بن دینار سے نقل کی ہے، اور دوسرے بزرگوں سے جو خشوع کی تعریف میں مختلف چیزیں نقل کی گئی ہیں وہ دراصل اسی سکون قلب وجوارح کی تفصیلات ہیں، مثلاً حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ نظر اور آواز کو پست رکھنے کا نام خشوع ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ دائیں بائیں التفات یعنی گوشۂ چشم سے دیکھنے سے بچنا خشوع ہے، حضرت عطاء نے فرمایا کہ بدن کے کسی حصہ سے کھیل نہ کرنا خشوع ہے۔

(معارف القرآن ۲۸۳/۶، سورہ مومنون)

خشوع وخضوع کی تعریف اور دونوں کا باہمی فرق

قرآن وسنت میں خشوع کی ترغیب مذکور ہے، اس سے مراد وہ قلبی سکون وانکساری ہے، جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں طاعت آسان ہوجاتی ہے، کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ باادب، متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہوتو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی باادب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔

بلکہ آثار خشوع کا قصداً اظہار کرنا بھی پسندیدہ نہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر جھکائے بیٹھا ہے، فرمایا: سر اٹھا، خشوع دل میں ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ کا ارشاد ہے کہ موٹا پہننے، موٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع نہیں، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریف ورذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے جو تم پر فرض کیا ہے اسے ادا کرنے میں اللہ کے لئے قلب کو فارغ کرلو۔

حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سنا کر کرتے تھے،

جب چلتے تو تیز چلتے، اور جب مارتے تو زور سے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے قصد واختیار سے خاشعین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور مذموم ہے، ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہوجائے تو معذور۔

(قرطبی)

فائدہ: خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم میں بھی بار بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنیٰ ہیں، لیکن خشوع کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور نگاہ کی پستی اور تذلل کے لئے بولا جاتا ہے، جب کہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو، قرآن کریم میں ہے: **خَشَعَتِ الأَصْوَاتُ** (آوازیں پست ہوگئیں) اور خضوع کا لفظ بدن کی تواضع اور انکساری کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرآن حکیم میں ہے:

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ. پس ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں۔

(معارف القرآن ج۱ص۲۲۰ سورہ بقرہ پ۲)

خَلَف کی تعریف

خَلْف یہ لفظ بسکون لام بُرے قائم مقام بُری اولاد کے لئے اور بفتح لام اچھے قائم مقام اور اچھی اولاد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (معارف القرآن۴۴، ج۶)

خلف، مصدر خلافت سے مشتق ماضی کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں قائم مقام اور خلیفہ ہوگئے، اور دوسرا لفظ خَلْفٌ مصدر ہے جو قائم مقام اور خلیفہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مفرد اور جمع دونوں کے لیے یکساں بولا جاتا ہے، لیکن خلف بسکون اللام اکثر برے خلیفہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اپنے بڑوں کے طرز کے خلاف برائیوں میں مبتلا ہو، اور خلف بفتح لام اس کے مقابل نیک اور قابل خلیفہ کو کہا جاتا ہے

جو اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلے، اور ان کے مقصد کی تکمیل کرے، اس لفظ کا اکثر استعمال اسی طرح ہے کہیں کہیں اس کے برخلاف بھی استعمال ہوا ہے۔

(معارف القرآن ۱۰۳/۴، سورہ اعراف پ۹)

خلق اور امر کی تعریف

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ، (سورہ اعراف پ۸)

خلق کے معنیٰ پیدا کرنا ہے، اور امر کے معنیٰ حکم کرنا ہیں، معنیٰ یہ ہیں کہ اسی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، اس کے سوا کوئی دوسرا نہ کسی ادنیٰ چیز کو پیدا کر سکتا ہے، اور نہ کسی کو کسی پر حکم کرنے کا حق ہے، (بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے حکم کا کوئی خاص شعبہ کسی کے سپرد کر دیا جائے، تو وہ بھی حقیقت کے اعتبار سے اللہ ہی کا حکم ہے) اس لئے مراد آیت کی یہ ہوئی کہ یہ ساری چیزیں پیدا کرنا بھی اسی کا کام تھا، اور پیدا ہونے کے بعد ان سے کام لینا بھی کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا کرشمہ ہے۔

صوفیاء کرام نے فرمایا کہ خلق اور امر دو عالم ہیں، خلق کا تعلق مادہ اور مادیات سے ہے، اور امر کا تعلق مجردات لطیفہ کے ساتھ ہے، آیت: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّیْ میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ روح کو امر رب سے فرمایا، خلق اور امر دونوں کا اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہونے کا مطلب اس صورت میں یہ ہے کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان جتنی چیزیں ہیں یہ تو سب مادی ہیں، ان کی پیدائش کو خلق کہا گیا، اور مافوق السمٰوات اور جو مادّہ اور مادّیت سے بَری چیزیں ہیں ان کی پیدائش کو لفظ امر سے تعبیر کیا گیا۔ (تفسیر مظہری)

(معارف القرآن ج۳/۵۷۵، اعراف: پ۸)

خلیفہ کی تعریف

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلَائِفَ فِی الْاَرْضِ (فاطر پ۲۲)

خلائف خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں نائب اور قائم مقام، مراد یہ ہے کہ ہم نے انسانوں کو یکے بعد دیگرے زمین و مکان وغیرہ کا مالک بنایا ہے، ایک جاتا ہے تو دوسرے کو اس کی جگہ مل جاتی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لیے بڑی عبرت ہے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خطاب امت محمدیہ کو ہو کہ ہم نے پچھلی قوموں کے بعد ان کے خلیفہ کی حیثیت سے تم کو مالک و متصرف بتایا ہے۔ لہٰذا تمہارا فرض ہے کہ اپنے سے پہلے لوگوں کے حالات سے عبرت حاصل کرو، عمر کے قیمتی لمحات کو غفلت میں نہ گذارو۔ (معارف القرآن سورۂ فاطر ۷/۳۵۴)

خلائف خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنیٰ ہیں کسی کا قائم مقام اور گدی نشین، معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تم کو تم سے پہلی قوموں کی جگہ آباد کیا ہے، کوئی مکان، زمین جس کو آج تم اپنی ملکیت کہتے ہو اور سمجھتے ہو ایسا نہیں کہ جو کل تمہیں جیسے دوسرے انسانوں کی ملکیت میں نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہٹا کر تمہیں ان کی جگہ بٹھایا ہے۔

(معارف القرآن سورہ انعام پ۸، ص۵۱۱ ج۳)

خواب کی تعریف اور اس کے اقسام

تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ حقیقت خواب کی یہ ہے کہ نفسِ انسان جس وقت نیند یا بے ہوشی کے سبب ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہو جاتا ہے، تو اس کو اس کی قوت خیالیہ کی راہ سے کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں، اسی کا نام خواب ہے، پھر اس کی تین قسمیں ہیں جن میں سے دو بالکل باطل ہیں، جن کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں ہوتی، اور ایک اپنی ذات کے اعتبار سے صحیح

وصادق ہے، مگر اس صحیح قسم میں بھی کچھ عوارض شامل ہوکر اس کو فاسد و ناقابل اعتبار کر دیتے ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خواب میں جو انسان مختلف صورتیں اور واقعات دیکھتا ہے، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں جو صورتیں انسان دیکھتا رہتا ہے وہی خواب میں متشکل ہوکر نظر آجاتی ہیں، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان کچھ صورتیں اور واقعات اس کے ذہن میں ڈالتا ہے، کبھی خوش کرنے والے اور کبھی ڈرانے والے، یہ دونوں قسمیں باطل ہیں، جن کی نہ کوئی حقیقت واصلیت ہے، نہ اس کی کوئی واقعی تعبیر ہوسکتی ہے، ان میں پہلی قسم کو حدیث النفس اور دوسری کو تسویل شیطانی کہا جاتا ہے۔

تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا الہام ہے جو اپنے بندہ کو متوجہ کرنے یا خوش خبری دینے کے لئے کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے بعض چیزیں اس کے قلب و دماغ میں ڈال دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کا خواب ایک کلام ہے جس میں وہ اپنے رب سے شرف گفتگو حاصل کرتا ہے، یہ حدیث طبرانی نے بسند صحیح روایت کی ہے۔ (مظہری)

اس کی تحقیق صوفیائے کرام کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ عالم میں جتنی چیزیں وجود میں آنے والی ہیں، اس کے وجود سے پہلے ہر چیز کی ایک خاص شکل عالم مثال میں ہوتی ہے، اور اس عالم مثال میں جس طرح جواہر اور حقائق ثابتہ کی صورتیں اور شکلیں ہوتی ہیں، اسی طرح معانی اور اعراض کی بھی خاص شکلیں ہوتی ہیں، خواب میں جب نفس انسانی ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہوتا ہے تو بعض اوقات اس کا تعلق عالم مثال سے ہوجاتا ہے، وہاں جو کائنات کی شکلیں ہیں، وہ اس

کو نظر آ جاتی ہیں، پھر یہ صورتیں عالم غیب سے دکھائی جاتی ہیں، بعض اوقات ان میں بھی کچھ عوارض ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ اصل حقیقت کے ساتھ تخیلات باطلہ شامل ہو جاتے ہیں، اس لئے اہل تعبیر کو بھی اس کی تعبیر سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات وہ تمام عوارض سے پاک صاف رہتی ہیں تو وہ اصل حقیقت ہوتی ہیں، مگر ان میں بھی بعض خواب محتاج تعبیر ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں حقیقت واضح نہیں ہوتی، ایسی صورت میں بھی اگر تعبیر غلط ہو جائے تو واقعہ مختلف ہو جاتا ہے، اس لئے صرف وہ خواب صحیح طور پر الہام من اللہ اور حقیقت ثابتہ ہوگی جو اللہ کی طرف سے ہو اور اس میں کچھ عوارض بھی شامل نہ ہوئے ہوں، اور تعبیر بھی صحیح دی گئی ہو۔

انبیاء علیہم السلام کے سب خواب ایسے ہی ہوتے ہیں، اسی لئے ان کے خواب بھی وحی کا درجہ رکھتے ہیں، عام مسلمانوں کے خواب میں ہر طرح کے احتمال رہتے ہیں، اس لئے وہ کسی کے لئے حجت اور دلیل نہیں ہوتے۔

(معارف القرآن ج ۵/ص ۱۹، یوسف پ ۱۲)

خوف وخشیت کی تعریف اور دونوں کا فرق

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ، (رعد پ ۱۳) یعنی یہ لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

یہاں لفظ خوف کی بجائے خشیت کا لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کا خوف اس طرح کا نہیں جیسے درندہ، جانور، یا موذی انسان سے طبعاً خوف ہوا کرتا ہے، بلکہ ایسا خوف ہے جیسا اولاد کو ماں باپ کا، شاگرد کو استاد کا خوف عادۃً ہوتا ہے، کہ اس کا منشأ کسی ایذاء رسانی کا خوف نہیں ہوتا بلکہ عظمت ومحبت کی وجہ سے خوف اس کا ہوتا ہے، کہ کہیں ہمارا کوئی قول وفعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند اور مکروہ نہ ہو جائے، اسی لئے مقام مدح میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کے

خوف کا ذکر ہے عموماً وہاں یہی لفظ خشیت کا استعمال ہوا ہے، کیونکہ خشیت اسی خوف کو کہا جاتا ہے جو عظمت و محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے اگلے جملہ میں جہاں حساب کی سختی کا خوف بیان کیا گیا ہے وہاں خشیت کا لفظ نہیں بلکہ خوف ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (معارف القرآن ص ۱۹۱، ج ۵، سورہ رعد پ ۱۳)

خیبر کی تعریف

خیبر در حقیقت ایک صوبہ کا نام ہے جس میں بہت سی بستیاں اور قلعے اور باغات شامل ہیں۔ (مظہری) (معارف القرآن ج ۸، ص ۸۱، سورہ الفتح، پ ۲۶)

خیر کی تعریف

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْد. (سورہ العادیٰت پ ۳۰)

خیر کے لفظی معنیٰ ہر بھلائی کے ہیں، عرب میں مال کو بھی لفظ خیر سے تعبیر کرتے ہیں، گویا مال بھلائی ہی بھلائی ہے، اور فائدہ ہی فائدہ ہے، حالانکہ در حقیقت بعض مال انسان کو ہزاروں مصیبتوں میں بھی مبتلا کر دیتے ہیں، آخرت میں تو ہر مال حرام کا یہی انجام ہے، کبھی کبھی دنیا میں بھی مال انسان کے لئے وبال بن جاتا ہے، مگر عرب کے محاورہ کے مطابق اس آیت میں مال کو لفظ خیر سے تعبیر کر دیا ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں فرمایا:

اِنْ تَرَكَ خَيْرَا یہاں بھی خیر سے مراد مال ہے۔ (معارف القرآن ص: ۸۰۴ ج ۸)

اِنْ تَرَكَ خَيْرَا لفظ "خیر" کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں جیسے قرآن میں ہے وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْد۔ اس جگہ باتفاق مفسرین خیر سے مراد مال ہے۔

(معارف القرآن ۱/۴۳۸، سورہ بقرہ)

خیر و منکر کی تعریف

وَلۡتَكُنۡ مِّنكُمۡ أُمَّةٌ يَدۡعُونَ إِلَى ٱلۡخَيۡرِ وَيَأۡمُرُونَ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ ٱلۡمُنكَرِ (سورہ ال عمران پ۴)

یعنی تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کرے اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے۔

''وَلۡتَكُنۡ مِّنكُمۡ أُمَّةٌ'' میں اشارہ ہے کہ اس جماعت کا وجود ضروری ہے، اگر کوئی حکومت یہ فریضہ انجام نہ دے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ایسی جماعت قائم کریں، کیونکہ ان کی حیات ملی اسی وقت محفوظ رہے گی جب تک یہ جماعت باقی ہے، پھر اس جماعت کے بعض اہم اوصاف اور امتیازات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''یدعون الی الخیر'' یعنی اس جماعت کا پہلا امتیاز خصوصی یہ ہوگا کہ وہ خیر کی طرف دعوت دیا کرے گی، گویا دعوت الی الخیر اس کا مقصد اعلیٰ ہوگا۔

خیر سے مراد کیا ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ الخیر ھو اتباع القرآن وسنتی، یعنی خیر سے مراد قرآن اور میری سنت کا اتباع ہے۔ (ابن کثیر)

خیر، معروف، منکر کی تعریف

''خیر'' کی اس سے زیادہ جامع اور مانع تعریف نہیں ہوسکتی، پورا دین شریعت اس میں آ گیا، پھر یدعون کو صیغہ مضارع سے لاکر بتلایا کہ اس جماعت کا وظیفہ ہی دعوت الی الخیر ہوگا یعنی دعوت الی الخیر کی مسلسل اور لگاتار کوشش ان کا فریضہ ہوگا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ اس کی ضرورت خاص

مواقع پر ہوگی، جب وہ منکرات دیکھے جائیں لیکن "یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ" کہہ کر بتلادیا کہ اس جماعت کا کام دعوت الی الخیر ہوگا، اگرچہ اس وقت منکرات موجود نہ ہوں، یا کسی فرض کی ادائیگی کا وقت نہ ہو، مثلاً آفتاب نکلنے کے بعد زوال تک نماز کا وقت نہیں ہے، لیکن وہ جماعت اس وقت بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرے گی، کہ وقت نماز آنے کے بعد نماز ادا کرنا ضروری ہے، یا روزہ کا وقت نہیں آیا ابھی رمضان کا مہینہ دور ہے لیکن وہ جماعت اپنے فرض سے غافل نہیں رہے گی، بلکہ وہ پہلے سے لوگوں کو بتلاتی رہے گی کہ جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزہ رکھنا فرض ہوگا، غرضیکہ اس جماعت کا فریضہ دعوت الی الخیر ہوگا۔

دعوت کی تعریف اور دعوت الی الخیر کے دو درجے

پھر اس دعوت الی الخیر کے بھی دو درجے ہیں، پہلا یہ کہ غیر مسلموں کو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دینا ہے، مسلمانوں کا ہر فرد عموماً اور یہ جماعت خصوصاً دنیا کی تمام قوموں کو خیر یعنی اسلام کی دعوت دے زبان سے بھی اور عمل سے بھی، چنانچہ مسلمانوں کو جس آیت میں قتال و جہاد کا حکم دیا وہاں سچے مومنین کی اس طرح تعریف کی::

"اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ" یعنی سچے مسلمان وہ ہیں کہ جب ہم ان کو زمین کی تمکین وقدرت یعنی حکومت دیتے ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی زمین میں نظام اطاعت قائم کرتے ہیں جس کا ایک مظہر نماز ہے اور اپنا مالیاتی نظام زکوٰۃ کے اصولوں پر قائم کرتے ہیں، نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مقصد حیات بناتے ہیں، اگر آج امت مسلمہ اپنا مقصد دیگر اقوام کو خیر کی طرف دعوت دینا بنالیں تو وہ سب بیماریاں ختم ہوجائیں گی جو دوسری قوموں کی نقالی سے ہمارے اندر پھیلی ہیں، کیونکہ

جب کوئی قوم اس عظیم مقصد (دعوت الی الخیر) پر مجتمع ہوجائے اور یہ سمجھ لے کہ ہمیں علمی اور عملی حیثیت سے اقوام عالم پر غالب آنا ہے اور اقوام کی تربیت وتہذیب ہمارے ذمہ ہے تو اس کی نااتفاقیاں بھی یکسر ختم ہوجائیں گی، اور پوری قوم ایک عظیم مقصد کے حصول کے لیے لگ جائے گی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی کامیابیوں کا راز اسی میں مضمر تھا، حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا ہم خاصۃ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (ابن جریر) یعنی یہ جماعت مخصوص صحابہ کرام کی جماعت ہے، کیونکہ ان نفوس قدسیہ کا ہر فرد خود کو دعوت الی الخیر کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔

دعوت الی الخیر کا دوسرا درجہ خود مسلمانوں کو دعوت خیر دینا ہے کہ تمام مسلمان علی العموم اور جماعت خاصہ علی الخصوص مسلمانوں کے درمیان تبلیغ کرے اور فریضہ دعوت الی الخیر انجام دے، پھر اس میں بھی ایک تو دعوت الی الخیر عام ہوگی، یعنی تمام مسلمانوں کو ضروری احکام واسلامی اخلاق سے واقف کیا جائے دوسری دعوت الی الخیر خاص ہوگی یعنی امت مسلمہ میں علوم قرآن وسنت کے ماہرین پیدا کرنا، اس طرف ایک دوسری آیت میں رہنمائی کی گئی ہے۔

’’فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ كُلِّ فِرۡقَةٍ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوۡا فِى الدِّيۡنِ وَلِيُنۡذِرُوۡا قَوۡمَهُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ لَعَلَّهُمۡ يَحۡذَرُوۡنَ ‘‘ آگے اس جماعت داعیہ کا دوسرا وصف اور امتیاز خصوصی یہ بتلایا ’’يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ‘‘ یعنی وہ لوگ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔

معروف کی تعریف

معروف میں وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں داخل ہیں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے

اور ہر نبی نے ہر زمانے میں اس کی ترویج کی کوشش کی، اور چونکہ یہ امور خیر جانے پہچانے ہوئے ہیں، اس لیے معروف کہلاتے ہیں۔

منکر کی تعریف

اسی طرح منکر میں تمام وہ برائیاں اور مفاسد داخل ہیں جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم و معروف ہے، اس مقام پر واجبات اور معاصی کے بجائے معروف و منکر کا عنوان اختیار کرنے میں شاید یہ حکمت بھی ہو کہ روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو امت میں مشہور و معروف ہیں، اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں، اجتہادی مسائل جن میں اصول شرعیہ کے ماتحت رائیں ہوسکتی ہیں، ان میں یہ روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا چاہیے، افسوس ہے کہ عام طور پر اس حکیمانہ تعلیم سے غفلت برتی جاتی ہے اور اجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر مسلمانوں کی جماعت کو ٹکرایا جاتا ہے، اور اس کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل متفق علیہ معاصی اور گناہوں سے روکنے کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی ہے۔

آیت کے اختتام پر اس جماعت کے انجام اور عاقبت محمودہ کو ان لفظوں میں فرمایا "وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" یعنی درحقیقت یہ لوگ کامیاب ہیں، فلاح و سعادتِ دارین انہیں کا حصہ ہے۔

اس جماعت کا سب سے پہلا مصداق جماعت صحابہ ہے، جو دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عظیم مقصد کو لے کر اٹھی اور قلیل عرصہ میں ساری دنیا پر چھا گئی، روم و ایران کی عظیم سلطنتیں روند ڈالیں، اور دنیا کو اخلاق و پاکیزگی کا درس دیا، نیکی اور تقویٰ کی شمعیں روشن کیں۔

(معارف القرآن ص:۱۳۹ تا ۱۴۲ اپ:۴، آل عمران)

دابّہ کی تعریف

لفظ دوابّ دابّۃ کی جمع ہے اصل لغت کے اعتبار سے ہر زمین پر چلنے والے کو دابہ کہا جاتا ہے مگر عرف ومحاورہ میں صرف چوپایہ جانوروں کو دابّۃ کہتے ہیں۔
(معارف القرآن ج ۴،ص ۲۰۷،سورہ انفال پ ۹)

دابّۃ الارض کی تعریف

مسند احمد میں حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو(۱) آفتاب کا جانبِ مغرب سے طلوع ہونا (۲) دُخان (۳) دابّہ (۴) خروج یاجوج ماجوج (۵) نزول عیسیٰ علیہ السلام (۶) دجّال (۷) تین خسوف ،ایک مغرب میں دوسرا مشرق میں تیسرا جزیرۃ العرب میں ہوگا۔ (۸) ایک آگ جوقعرِ عدن سے نکلے گی اور سب لوگوں کو ہنکا کر میدان حشر کی طرف لے آئے گی جس مقام پرلوگ رات گزارنے کے لئے ٹھیریں گے یہ آگ بھی ٹھہر جائے گی، پھر اُن کو لے چلے گی (رواہ مسلم واہل السنن،وقال الترمذی حدیث حسن صحیح)

اس حدیث سے قرب قیامت میں زمین سے ایک ایسے جانور کا نکلنا ثابت ہوا جولوگوں سے باتیں کرے گا اور لفظ دابّہ کی تنوین میں اس جانور کے عجیب الخلقت ہونے کا اشارہ بھی پایا گیا اور یہ بھی کہ یہ جانور عام جانوروں کی طرح توالدوتناسل کے طریق پر پیدا نہیں ہوگا بلکہ اچانک زمین سے نکلے گا اور یہ بات بھی اسی حدیث

سے سمجھ میں آتی ہے کہ دابّۃ الارض کا خروج بالکل آخری علامات میں سے ہوگا جس کے بعد بہت جلد قیامت آجائے گی۔

ابن کثیر نے بحوالہ ابوداؤد طیالسی حضرت طلحہ بن عمر سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے کہ یہ دابّۃ الارض مکہ مکرمہ میں کوہِ صفا سے نکلے گا اور اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا مسجد حرام میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان پہنچ جائے گا لوگ اس کو دیکھ کر بھاگنے لگیں گے ایک جماعت رہ جائے گی، یہ دابّہ ان کے چہروں کو ستاروں کی طرح روشن کردے گا، اس کے بعد وہ زمین کی طرف نکلے گا، ہر کافر کے چہرے پر کفر کا نشان لگادے گا، کوئی اس کی پکڑ سے بھاگ نہ سکے گا، یہ ہر مومن و کافر کو پہچانے گا (ابن کثیر)

اور مسلم بن حجاج نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث سنی تھی جس کو میں کبھی بھولتا نہیں وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کی آخری علامات میں سب سے پہلے آفتاب کا طلوع مغرب کی طرف سے ہوگا اور آفتاب بلند ہونے کے بعد دابّۃ الارض نکلے گا ان دونوں علامتوں میں سے جو بھی پہلے ہوجائے اس کے فوراً بعد قیامت آجائے گی۔

(معارف القرآن ص ۶۰۵، ج ۶، سورہ نمل، پ ۲۰)

دارالسلام کی تعریف

لفظ دار کے معنیٰ گھر، اور سلام کے معنیٰ تمام آفتوں مصیبتوں اور محنتوں سے سلامتی کے ہیں، اس لئے دارالسلام اس گھر کو کہا جاسکتا ہے جس میں کسی تکلیف و مشقت اور رنج وغم اور آفت و مصیبت کا گذر نہ ہو، اور وہ ظاہر ہے کہ جنت ہی ہوسکتی ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سلام اللہ جل شانہ کا نام ہے، اور دار السلام کے معنیٰ ہیں اللہ کا گھر، اور ظاہر ہے کہ اللہ کا گھر امن و سلامتی کی جگہ ہوتی ہے،

اس لئے حاصل معنیٰ پھر بھی یہی ہوگئے کہ وہ گھر جس میں ہر طرح کا امن وسکون اور سلامتی واطمینان ہو، جنت کو دارالسلام فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ جنت ہی صرف وہ جگہ ہے جہاں انسان کو ہر قسم کی تکلیف، پریشانی، اور اذیت اور ہر خلاف طبع چیز سے مکمل اور دائمی سلامتی حاصل ہوتی ہے، جو دنیا میں نہ کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو کبھی حاصل ہوئی اور نہ بڑے سے بڑے نبی ورسول کو، کیونکہ دنیائے فانی کا یہ عالم ایسی مکمل اور دائمی راحت کا مقام ہی نہیں۔ (معارف القرآن ج۳/ ۴۴۸، انعام: پ۸)

داعی، مبشّر، نذیر، سراج منیر کی تعریف

داعی الی اللہ سے مراد یہ ہے کہ آپ اُمت کو اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید اور اطاعت کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔

اور مبشر کے معنیٰ بشارت دینے والا، مراد یہ ہے کہ آپ اپنی اُمت کے نیک باشرع لوگوں کو جنت کی خوشخبری سنانے والے ہیں۔

اور نذیر کے معنیٰ ڈرانے والا، مراد یہ ہے کہ آپ امت کے لوگوں کو درصورت خلاف ورزی ونافرمانی کے عذاب سے ڈرانے والے بھی ہیں۔

سراج کے معنیٰ چراغ اور منیر کے معنیٰ روشن کرنے والا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچویں صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ آپ روشن کرنے والے چراغ ہیں اور بعض حضرات نے سراج منیر سے مراد قرآن لیا ہے، مگر نسقِ کلام سے قریب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے۔ (معارف القرآن ص ۱۷۷، ج ۷، احزاب)

دعا کی تعریف

"اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً" (سورہ اعراف، پ۸)

لفظ دعا عربی زبان میں کسی کو حاجت روائی کے لیے پکارنے کے معنی میں بھی

آتا ہے، اور مطلق یاد کرنے کے معنی میں بھی، اور یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، آیت میں ارشاد ہے: ''اُدْعُوْا رَبَّکُمْ'' یعنی پکارو اپنے رب کو اپنی حاجات کے لیے یا یاد کرو اور عبادت کرو اپنے رب کی۔

پہلی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اپنی حاجات صرف اللہ تعالیٰ سے مانگو اور دوسری صورت میں یہ کہ ذکر و عبادت صرف اسی کی کرو، یہ دونوں تفسیریں سلف صالحین ائمہ تفسیر سے منقول بھی ہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا ''تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً'' تضرع کے معنی عجز و انکسار اور اظہار تذلل کے ہیں اور خفیہ کے معنی پوشیدہ، چھپا ہوا، جیسا کہ اردو زبان میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں بولا جاتا ہے، ان دونوں لفظوں میں دعا و ذکر کے لیے دو اہم آداب کا بیان ہے۔ اول یہ کہ قبولیتِ دعا کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز و انکسار اور تذلل کا اظہار کر کے دعا کرے، اس کے الفاظ بھی عجز و انکسار کے مناسب ہوں، لب ولہجہ بھی تواضع و انکسار کا ہو، ہیئت دعا مانگنے کی بھی ایسی ہی ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل عوام جس انداز سے دعا مانگتے ہیں اول تو اس کو دعا مانگنا ہی نہیں کہا جا سکتا بلکہ پڑھنا کہنا چاہیے، کیونکہ اکثر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہم جو کلمات زبان سے بول رہے ہیں ان کا مطلب کیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اگر کسی شخص کو اپنے کلمات کے معنی بھی معلوم ہوں اور سمجھ کر ہی کہہ رہا ہو، تو اگر اس کے ساتھ عنوان بلب ولہجہ اور ہیئت ظاہری تواضع و انکسار کی نہ ہو، تو یہ دعا نرا ایک مطالبہ رہ جاتا ہے جس کا کسی بندے کو کوئی حق نہیں۔

(معارف القرآن ۳/۶۷-۵۷، سورۂ اعراف آیت نمبر: ۵۶)

پکارنا یا بلانا دعاء کا ترجمہ ہے، اور دعا کا لفظ قرآن میں دو معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے، ایک اللہ کا ذکر، اس کی حمد و ثنا، تسبیح و تمجید کے ساتھ، دوسرے حاجات و

مشکلات کے وقت اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت طلب کرنا اور مصائب و آفات سے نجات اور مشکلات کی آسانی کی درخواست کرنا، اس آیت میں **فَادْعُوْهُ بِهَا** کا لفظ دونوں معنی کو شامل ہے، تو معنی آیت کے یہ ہوئے کہ حمد وثنا اور تسبیح کے لائق بھی صرف اسی کی ذات پاک ہے اور مشکلات ومصائب سے نجات اور حاجت روائی بھی صرف اسی کے قبضہ میں ہے، اس لیے حمد وثنا کرو، تو اسی کی کرو اور حاجت روائی مشکل کشائی کے لیے پکارو، تو اسی کو پکارو۔

(معارف القرآن ۱۳۰/۴، سورہ اعراف پ ۹)

دعویٰ کی تعریف

دعویٰ کے مشہور معنیٰ ہیں جو کوئی مدعی اپنے حریف کے مقابلہ میں کیا کرتا ہے۔

(معارف القرآن سورہ یونس پ ۱۱، ص ۵۱۱ ج ۴)

دنیا اور دناءۃ کی تعریف

لفظ ادنیٰ دُنُوّ بمعنیٰ قرب سے بھی مشتق کہا جا سکتا ہے، اس صورت میں ادنیٰ کے معنی اقرب کے ہو جائیں گے، اسی کا مونث دنیا ہے جس کے معنیٰ قریب کے ہیں، آخرت کے مقابلے میں یہ جہاں انسان سے زیادہ قریب ہے اس لئے اس کو ادنیٰ اور دنیا کہا جاتا ہے، اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ دناءۃ بمعنیٰ ذلت سے مشتق ہو تو اس کے معنیٰ ذلیل وحقیر کے ہو جائیں گے، دنیا اور اس کے سب سامان بمقابلہ آخرت کے حقیر وذلیل ہیں اس لئے اس کو ادنیٰ اور دنیا کہا گیا۔

(معارف القرآن سورہ اعراف، پ ۹، ص ۱۰۳، ج ۴)

دین وشریعت اور مذہب کی تعریف

عربی زبان میں لفظ دین کے چند معنی ہیں جس میں ایک معنی ہیں طریقہ اور

روش، قرآن کی اصطلاح میں لفظ دین ان اصول واحکام کے لیے بولا جاتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء میں مشترک ہیں، اور لفظ ''شریعت'' یا ''منہاج'' یا بعد کی اصطلاحات میں لفظ ''مذہب'' فروعی احکام کے لیے بولے جاتے ہیں جو مختلف زمانوں اور مختلف امتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا۔ (سورۂ زخرف)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین جاری فرمایا جس کی وصیت تم سے پہلے نوح علیہ السلام کو اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو کی گئی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے جامع کمالات اور تمام نقائص سے پاک ہونے اور اس کے سوا کسی کا لائقِ عبادت نہ ہونے پر دل سے ایمان اور زبان سے اقرار، روزِ قیامت اور اس میں حساب کتاب اور جزاء وسزا اور جنت و دوزخ پر دل سے ایمان لانا اور زبان سے اقرار کرنا، اس کے بھیجے ہوئے ہر نبی و رسول اور ان کے لائے ہوئے احکام پر اسی طرح ایمان لانا۔

اور لفظ ''اسلام'' کے اصلی معنی ہیں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا اور اس کے تابع فرمان ہونا، اس معنی کے اعتبار سے ہر نبی ورسول کے زمانہ میں جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کے لائے ہوئے احکام میں ان کی فرمانبرداری کی وہ سب مسلمان اور مسلم کہلانے کے مستحق تھے، اور ان کا دین دین اسلام تھا، اسی معنی کے لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (سورۂ یونس:۷۲)۔

اور اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو اور اپنی امت کو امت مسلمہ فرمایا: ''رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ''۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوارییں نے اسی معنی کے اعتبار سے کہا تھا:
''وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُونَ''۔(آل عمران:۵۲)

اور بعض اوقات یہ لفظ خصوصیت سے اس دین وشریعت کے لیے بولا جاتا ہے جو سب سے آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ اور جس نے پچھلی تمام شرائع کو منسوخ کر دیا اور جو قیامت تک باقی رہے گا، اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ صرف دین محمدی اور امت محمدیہ کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے، جبرئیل علیہ السلام کی ایک حدیث جو تمام کتبِ حدیث میں مشہور ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی یہی خاص تفسیر بیان فرمائی ہے، آیت مذکورہ کے لفظ ''الاسلام'' میں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے، پہلے معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین صرف دین اسلام ہے یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنانا اور ہر زمانہ میں جو رسول آئے اور وہ جو کچھ احکام لائے اس پر ایمان لانا اور اس کی تعمیل کرنا اس میں دین محمدی کی اگر چہ تخصیص نہیں لیکن عام قاعدہ کے ماتحت حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد ان پر اور ان کے لائے ہوئے تمام احکام پر ایمان وعمل بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں دین مقبول وہ تھا جو نوح علیہ السلام لائے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں وہ جو ابراہیم علیہ السلام لے کر آئے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا اسلام وہ تھا جو الواحِ توراۃ اور موسوی تعلیمات کی صورت میں آیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا اسلام وہ جو انجیل اور عیسوی ارشادات کے رنگ میں نازل ہوا، اور آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا اسلام وہ ہوگا جو قرآن وسنت کے بتلائے ہوئے نقشہ پر مرتب ہوا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہر نبی کے زمانہ میں ان کا لایا ہوا دین ہی دین اسلام اور عند اللہ مقبول تھا، جو بعد میں یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتا چلا آیا، آخر میں خاتم الانبیاء کا دین

دین اسلام کہلایا جو قیامت تک باقی رہے گا۔ اور اگر اسلام کے دوسرے معنی لیے جائیں یعنی وہ شریعت جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تو آیت کا مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف وہی اسلام مقبول ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہے، پچھلے ادیان کو بھی اگر چہ ان کے اوقات میں اسلام کہا جاتا تھا، مگر اب وہ منسوخ ہو چکے ہیں، اور دونوں صورتوں میں نتیجۂ کلام ایک ہی ہے کہ ہر پیغمبر کے زمانہ میں اللہ کے نزدیک مقبول دین وہ اسلام ہے جو اس پیغمبر کی وحی اور تعلیمات کے مطابق ہو، اس کے سوا دوسرا کوئی دین مقبول نہیں، خواہ وہ پچھلی منسوخ شدہ شریعت ہی ہو، اگلے زمانہ کے لیے وہ اسلام کہلانے کی مستحق نہیں، شریعت ابراہیم علیہ السلام ان کے زمانہ میں اسلام تھی، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس شریعت کے جو احکام منسوخ ہو گئے وہ اب اسلام نہیں رہے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں شریعت موسویہ کا اگر کوئی حکم منسوخ ہوا ہے تو وہ اب اسلام نہیں، ٹھیک اسی طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شرائع سابقہ کے جو احکام منسوخ ہو گئے، وہ اب اسلام نہیں رہے اس لیے جو امت قرآن کی مخاطب ہے اس کے لیے اسلام کے معنی عام لیے جائیں یا خاص دونوں کا حاصل یہی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف دین اسلام کہلانے کا مستحق وہ ہے جو قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہو اور وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے اس کے سوا کوئی دین مقبول اور ذریعۂ نجات نہیں۔ یہ مضمون قرآن مجید کی بے شمار آیات میں مختلف عنوانات سے آیا ہے۔ ایک آیت کے الفاظ میں اس طرح وارد ہے: ''وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ '' (یعنی جو شخص اسلام کے سوا کوئی دین اختیار کرے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے) اس کے تابع جو عمل کیا جائے گا وہ ضائع ہوگا۔ (معارف القرآن ص:۳، ص:۱۲۲، سورۂ آل عمران)

ذ

ذر کے معنیٰ

وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِباً وَّلَهُواً (سورہ انعام پ ۷)

لفظ ''ذر'' وَذْ ر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز سے ناراض ہوکر اس کو چھوڑ دینا، معنی آیت کے یہ ہیں کہ آپ ان لوگوں کو چھوڑ دیجیے جنہوں نے اپنے دین کو لہوولعب یعنی مشغلہ اور کھیل بنا رکھا ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جو دین حق یعنی اسلام ان کے لیے بھیجا گیا ہے اسکو لہوولعب بنا رکھا ہے، اس کا استہزاء و تمسخر کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ انہوں نے اصلی دین کو چھوڑ کر اپنا دین و مذہب ہی لہوولعب کو بنا لیا ہے، دونوں معنی کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔

(معارف القرآن سورہ انعام ۳/۳۴۷)

ذراع کی تعریف

ذراع : عرب میں دو قسم کے ذراع مستعمل تھے، ایک ذراع کرباس (کپڑے ناپنے کا گز) دوسرا ذراع مساحت (زمین وغیرہ ناپنے کا گز)۔

ذراع مساحت حسب تصریح قاضی خان وغیرہ سات مشت (مٹھی) ہیں، جن میں ہر ایک مٹھی کے ساتھ انگوٹھا کھڑا ہو (کذافی البحر الرائق ص:۱۸، بحث المیاہ) اور یہ مٹھی جس پر انگوٹھا کھڑا ہو، آج کل کی پیمائش کے حساب سے چھ انچ ہوتی ہے، کیونکہ اس طرح کی دو مٹھی کا فٹ قرار دیا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ذراع مساحت ساڑھے تین فٹ یا بیالیس انچ کا ہوتا ہے، جو انگریزی گز سے چھ انچ زیادہ ہے، لیکن

فقہاء کے کلام میں عموماً جس جگہ ذراع کا لفظ بولا گیا ہے ذراع مساحت مراد ہوتا ہے، اور میل مواضع میں فقہاء کا اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض نے اس میں ذراع کرباس مراد لیا ہے۔ بعض نے ذراع مساحت جیسا کہ ماء (پانی) کثیر کی بحث میں اور دہ دردہ کے تعین میں قاضی خان نے ذراع مساحت کو اختیار کیا ہے، لیکن جمہور فقہاء صاحب ہدایہ اور عامہ متون وشروح نے اس جگہ بھی ذراع کرباس ہی کو صحیح قرار دیا ہے، اور ذراع کرباس بھی دو قسم کا مشہور ہے، متقدمین میں ۳۲/ انگشت کا ذراع معروف ہے، اور متاخرین میں ۲۴/ انگشت سے مراد یہ ہے کہ ۴/ انگلیاں ملا کر رکھی جاویں، اور انگوٹھا ان کے ساتھ شامل نہ کیا جاوے، پھر ۴/ ان کے برابر اور پھر اسی طرح ۴، یہاں تک کہ ۳۲ یا ۲۴ ہو جاویں، اور چونکہ ایک مشت (مٹھی) بھی ۴، انگشت کی ہوتی ہے، اس لیے متقدمین کا ذراع ۸ مشت (مٹھی) اور متاخرین کا ۶ مشت کا ہوگا، عامہ کتب مذہب متون وشروح اور فتاوی میں متاخرین کا ذراع مستعمل ہے، اسی پر سب حسابات شرعیہ قائم کئے گئے ہیں، یعنی ۶ مشت یا ۲۴ /انگشت کا ایک ذراع۔

(جواہر الفقہ ۳/۴۲۰)

ذکر کی تعریف

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (پ۲، سورہ بقرہ)

ذکر کے اصلی معنی یاد کرنے کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لیے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمانِ قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح

میں مشغول ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں (جی) نہ لگے وہ بھی فائدے سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمان سے کسی نے ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان کو تو اپنی طاعت میں لگالیا۔ (قرطبی)

(معارف القرآن، بقرہ پ:۲، ۱/۴۰۷)

ذکر اور اہل الذکر کی تعریف

لفظ ذکر چند معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، ان میں سے ایک معنی علم کے بھی ہیں، اسی مناسبت سے قرآن کریم میں تورات کو بھی ذکر فرمایا ہے، **وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ** اور قرآن کریم کو بھی ذکر کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ اس کے بعد والی آیت میں **انزلنا الیک الذکر**، میں قرآن مراد ہے، اس لیے **اھل الذکر** کے لفظی معنی اہل علم کے ہوئے، اور یہاں اہل علم سے کون لوگ مراد ہیں اس میں ظاہر یہ ہے کہ علمائے اہل کتاب یہود و نصاریٰ مراد ہیں، یہ قول ابن عباس، حسن، السدی وغیرہ کا ہے، اور بعض حضرات نے اس جگہ بھی ذکر سے قرآن مراد لے کر اہل الذکر کی تفسیر اہل قرآن سے کی ہے، اس میں زیادہ واضح بات رمانی، زجاج اور ازہری کی ہے، وہ کہتے ہیں **المراد باھل الذکر علماء احبار الامم السالفة من كان فالذكر بمعنى الحفظ كانه قيل اسألوا المطلعين على اخبار الأمم يعلموكم بذلك**۔ اس تحقیق کی بنا پر اس میں اہل کتاب بھی داخل ہیں، اور اہل قرآن بھی۔

(معارف القرآن ۵/۳۳۳، سورہ نحل پ۱۴)

ذکر اسم ذات یعنی اللہ اللہ کا تکرار بھی ماموربہ ذکر وعبادت ہے

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا. (سورہ مزمل پ۲۹)

اس آیت میں ذکر اللہ کے حکم کو لفظ اسم کے ساتھ مقید کر کے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ فرمایا ہے وَاذْكُرْ رَبَّكَ نہیں فرمایا، اس میں اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ اسم رب یعنی اللہ اللہ کا تکرار بھی مطلوب و ماموربہ ہے۔ (مظہری) بعض علماء نے جو صرف اسم ذات اللہ اللہ کے تکرار کو بدعت کہہ دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس کو بدعت کہنا صحیح نہیں۔ (معارف القرآن: ج۸ سورہ مزمل پ۲۹)

ذلیل اور ذلول کی تعریف

لفظ "اَذِلَّة" حسب تصریح قاموس ذلیل یا ذلول دونوں کی جمع ہو سکتی ہے، ذلیل کے معنیٰ عربی زبان میں وہی ہیں جو اردو وغیرہ میں مراد ہوتے ہیں۔

اور ذلول کے معنیٰ ہیں نرم اور سہل الانقیاد یعنی جو آسانی سے قابو میں آجائے، جمہور مفسرین کے نزدیک اس جگہ یہی معنیٰ مراد ہیں، یعنی یہ لوگ مسلمانوں کے سامنے نرم ہوں گے، اگر کسی معاملہ میں اختلاف بھی ہو تو آسانی سے قابو میں آجائیں گے، جھگڑا چھوڑ دیں گے، اگرچہ وہ اپنے جھگڑوں میں حق بجانب بھی ہوں۔

(معارف القرآن ج۳/ص۱۷۳، مائدہ پ۶)

ر

راسخین فی العلم کی تعریف

راسخون فی العلم سے کون سے لوگ مراد ہیں اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں راجح قول یہ ہے کہ ان سے مراد اہل السنہ والجماعت ہیں جو قرآن وسنت کی اسی تعبیر وتشریح کو صحیح سمجھتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم، سلف صالحین اور اجماع امت سے منقول ہو، اور قرآنی تعلیمات کا محور اور مرکز محکمات کو مانتے ہیں، اور متشابہات کے جو معانی ان کی فہم وادراک سے باہر ہیں اپنی کوتاہ نظری اور قصور علمی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو خدا کے سپرد کرتے ہیں، وہ اپنے کمال علمی اور قوت ایمانی پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے استقامت اور مزید فضل وعنایت کے طلبگار رہتے ہیں، ان کی طبیعتیں فتنہ پسند نہیں ہوتیں کہ متشابہات ہی کے پیچھے لگے رہیں، وہ محکمات اور متشابہات سب کو حق سمجھتے ہیں۔ (معارف القرآن سورہ آل عمران پ۳، ص۲۲ ج۲ بحوالۂ مظہری)

رب اور تربیت کی تعریف

لفظ رب کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں، اور تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ آگے بڑھایا جائے، یہاں تک کہ وہ حد کمال کو پہنچ جائے۔ یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لیے مخصوص ہے، کسی مخلوق کو بدون اضافت کے رب کہنا جائز نہیں کیونکہ ہر مخلوق خود محتاج تربیت ہے وہ کسی دوسرے کی کیا تربیت کرسکتا ہے۔

(معارف القرآن، سورہ فاتحہ پ۱، ۱/۷۰)

ربّانی اور رِبّیُّون کی تعریف

ربّیون! بکسر را اور تشدید باء مکسورۃ وضم یا، ربؒ کی طرف منسوب ہے، جیسے ربانی معنی ہیں، رب والے، اس میں صرف را مفتوح کے بجائے مکسور خلاف قیاس استعمال ہوا ہے۔ (روح)

ربیون: اللہ والے سے مراد یہاں کون لوگ ہیں؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ اس سے مراد علماء وفقہاء ہیں۔

(روح المعانی، معارف القرآن آل عمران ۲/۲۰۰)

ربوٰ کی تعریف اور سود و رِبوٰ میں فرق

قرآن حکیم میں جس چیز کو بلفظ ربا حرام قرار دیا ہے، اس کا ترجمہ اردو زبان کی تنگ دامانی کے باعث عام طور پر لفظ سود سے کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ربا اور سود دونوں عربی اور اردو میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، لیکن حقیقت یہ نہیں بلکہ ربا ایک عام اور وسیع مفہوم رکھتا ہے، مروجہ سود بھی اسی کی ایک قسم یا فرد کی حیثیت میں ہے۔

مروجہ سود ایک معین مقدار روپیہ متعین میعاد کے لیے ادھار دے کر معین شرح کے ساتھ نفع یا زیادتی لینے کا نام ہے، اور بلا شبہ یہ بھی ربا کی تعریف میں داخل ہے مگر ربا اس میں منحصر نہیں اس کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے، اس میں بہت سے وہ معاملات بیع وشراء بھی داخل ہیں جن میں ادھار کا لین دین قطعاً نہیں۔

زمانہ جاہلیت میں بھی عموماً ربا صرف اسی کو کہتے اور سمجھتے تھے جس کو آج سود کہا جاتا ہے، یعنی ادھار کی میعاد پر معین شرح کے ساتھ زیادتی یا نفع لینا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا کے معنی کی وسعت بیان فرما کر بہت سی ایسی صورتوں کو بھی ربا قرار دیا جن میں ادھار کا معاملہ نہیں۔ (مسئلہ سود ص:۱۳۰)

ربا کے لغوی اور اصطلاحی معنی

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ربا کے معنی لغت کے اعتبار سے زیادتی، بڑھوتری، بلندی کے آتے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں ایسی زیادتی کو ربا کہتے ہیں جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل کی جائے، **الربا فی اللغة الرباوة والمراد فی الآیة کل زیادة لا یقابلها عوض.** (احکام القرآن ابن عربی)

اس میں وہ زیادتی بھی داخل ہے جو روپیہ کو ادھار دینے پر حاصل کی جائے، کیونکہ مال کے معاوضہ میں تو رأس المال پورا مل جاتا ہے جو زیادتی بنام سود یا انٹرسٹ لی جاتی ہے وہ بے معاوضہ ہے، اور بیع وشراء کی وہ صورتیں بھی اس میں داخل ہیں جن میں کوئی زیادتی بلا معاوضہ حاصل کی جائے، مگر جاہلیت عرب کے زمانہ میں لفظ ربا صرف پہلی قسم کے لیے بولا جاتا تھا دوسری اقسام کو وہ ربا میں داخل نہ سمجھتے تھے۔

اس ربا کی مختلف صورتیں مختلف خطوں میں رائج تھیں، عرب میں اس کا اکثر رواج اس طرح تھا کہ ایک معین رقم معین مدت کے لیے معین مقدار سود پر دے دی جاتی تھی، قرضخواہ نے اگر میعاد مقررہ پر واپس کر دی تو مقررہ سود لے کر معاملہ ختم ہوگیا، اور اگر اس وقت واپس نہ کر سکا تو آئندہ کے لیے مزید سود کا معاملہ کیا جاتا تھا، بہر حال ربا کی حقیقت جو نزول قرآن سے پہلے بھی سمجھی جاتی تھی یہ تھی کہ قرض دے کر اس پر نفع لیا جائے، ربا کی یہ تعریف ایک حدیث میں بھی ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔

کل قرض جَرَّ منفعة فهو ربوا۔

یعنی جو قرض کچھ نفع کمائے وہ ربوا ہے۔

یہ حدیث علامہ سیوطیؒ نے جامع صغیر میں نقل کی اور فیض القدیر شرح جامع صغیر

میں اگر چہ اس کی سند پر جرح کی ہے، اسناد کو ضعیف بتلایا ہے لیکن اس کی دوسری شرح ''سراج المنیر'' میں عزیزی نے اس کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:

قال الشیخ حدیث حسن لغیرہ ، یعنی یہ حدیث حسن لغیرہ ہے، کیونکہ دوسری روایات وآثار سے اس کی تائید ہوئی ہے، بہر حال یہ روایت محدثین کے نزدیک صالح للعمل ہے، اس لیے اس کو استدلال میں پیش کیا جاسکتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ربوا کا یہ مفہوم کہ قرض دے کر کچھ نفع لیا جائے پہلے سے معروف ومشہور اور تمام عرب میں جانا پہچانا ہوا تھا، یہ حدیث بھی نہ ہوتی تو صرف لغتِ عرب اس کے بتلانے کے لیے کافی تھا جس کے حوالے عنقریب آپ دیکھیں گے اور ربوا کا لین دین عرب کے معاملات میں عام تھا۔ اوائلِ اسلام میں بھی یہ معاملات اسی طرح چلتے رہے، تقریباً ہجرت مدینہ کے آٹھویں سال فتح مکہ کے موقع پر آیات ربوا نازل ہوئیں جن میں ربوا کو حرام قرار دیا گیا۔

آیات قرآن کو سنتے ہی ربوا کے متعارف معنی قرآن (یعنی) ادھار پر نفع لینا یہ تو اسی وقت سب نے سمجھ لیا اور اس کو قطعاً حرام سمجھ کر فوراً ترک کر دیا۔

لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرض منصبی کے مطابق ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے ربوا کے جو معنی بیان فرمائے، ان میں اور ایک قسم کا اضافہ تھا جس کو پہلے سے عرب میں ربوا کے اندر داخل نہ سمجھا جاتا تھا۔

رِبٰو کی دوسری قسم

ربا کی دوسری قسم یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل، یداً بیدٍ، فمن زاد واستزاد فقد اربیٰ الآخذ والمعطی فیہ سواءٌ. (بخاری عن ابی سعید)

سونا سونے کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے اور گندم گندم کے بدلے، اور جو، جو کے بدلے اور کھجور کھجور کے بدلے، اور نمک نمک کے بدلے میں، اگر لیا اور دیا جائے تو ان کا لین دین برابر برابر دست بدست ہونا چاہیئے، اس میں کمی بیشی (یا ادھار) ربوا کے حکم میں ہے، جس کے گناہ میں لینے والا اور دینے والا برابر ہیں۔

یہ حدیث نہایت صحیح اور قوی اسانید کے ساتھ تمام کتب حدیث میں بعنوانات مختلفہ منقول ومشہور ہے، اس حدیث سے ایک نئ قسم کا ربوا کے حکم میں داخل ہونا معلوم ہوا کہ چھ چیزیں جن کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے اگر ان چیزوں کا باہمی تبادلہ اور بیع کی جائے تو اس میں کمی بیشی کرنا بھی ربوا ہے، اور ادھار کرنا بھی ربوا ہے، خواہ اس ادھار میں مقدار کی کوئی زیادتی نہ ہو، بلکہ برابر سرابر لیا دیا جائے، چونکہ ربوا کا مشہور اور متعارف مفہوم قرض دے کر اس پر نفع لینا تھا، وہ سب صحابہ کرام نے پہلے ہی سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، مگر ربوا کی یہ قسم جو حدیث میں بیان کی گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے امام اور فقیہ صحابی کو بھی شروع میں جب تک حضرت ابوسعید خدریؓ کی اس روایت کا علم نہ تھا جو اوپر نقل کی گئی ہے، تو اس قسم ربوا کے حرام ہونے کے قائل نہ تھے، (کما رواہ مسلم) پھر جب حضرت ابوسعید نے یہ روایت ابن عباسؓ کو سنائی تو انہوں نے اپنے سابقہ فتویٰ سے رجوع کیا اور اپنی غلطی پر استغفار فرمایا۔ (نیل الاوطار بروایت حاکم، مسئلہ سود ص: ۱۳ تا ۱۶)

ربوا کی تعریف وتقسیم

امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک ادھار کا ربا دوسرے نقد بیع میں زیادہ لینے کا ربا، پہلی قسم وہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور ومعروف تھی، اور اہل جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی، کہ

فلاں فلاں چیزوں کی بیع وشراء میں کمی زیادتی ربا میں داخل ہے۔

اور احکام القرآن جصاص میں ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں ایک بیع وشراء کے اندر دوسری بغیر بیع وشراء کے، اور زمانہ جاہلیت کا ربوا یہی دوسری قسم کا تھا، اور اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ قرض جس میں بحساب میعاد کوئی نفع لیا جائے، اور یہی مضمون ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے اور قرض ادھار پر نفع لینے کے ربا کا حرام ہونا قرآن، سنت اور اجماع امت سے ثابت کیا ہے۔

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ قرآن میں جو ربا مذکور ہے اس سے جلی اور واضح طور پر وہ ربا مراد ہے جو قرض ادھار پر لیا دیا جاتا تھا، اور اسی کو زمانۂ جاہلیت میں ربا کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپ کی سنت سے دوسری قسم کے ربا کا علم ہوا، جو خاص خاص اقسام بیع وشراء میں کمی زیادتی یا ادھار کرنے کا نام ہے اور اس ربا کے حرام ہونے پر بھی احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آئی ہیں، مگر اس قسم کے ربا کی تفصیلات پوری واضح نہ ہونے کے سبب اس میں بعض صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اور فقہاء کے اختلافات ہوئے۔ (معانی الآثار ص:۲/۲۳۲)

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا ہے کہ ربا ایک حقیقی ہے اور ایک وہ جو بحکم ربا ہے، حقیقی ربا قرض ادھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور بحکم ربا وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کو رِبا کہا گیا ہے، اور ایک حدیث میں جو آیا ہے "لا ربا الا فی النسیۃ" (رواہ البخاری) یعنی ربا صرف ادھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصلی ربا جس کو عام طور پر ربا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ ادھار پر نفع لینے کا نام ہے، اس کے سوا جتنی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب حکماً رِبوا میں داخل ہیں۔

(معارف القرآن ۱/۶۶۶ سورۂ بقرہ پ۳)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے ربا کی بڑی جامع و مانع تعریف بیان فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

الربوا هو القرض على أن يؤدي إليه أكثر وأفضل مما اخذ۔

(حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۱۰۶)

''ربا وہ قرض ہے جو اس شرط پر ہو کہ قرض دار قرض خواہ کو جتنا لیا ہے اس سے زیادہ اس سے اچھا واپس کردے''۔

خلاصۂ کلام

ربا شرعی اصطلاحی قرض اور تجارت دونوں میں پایا جاتا ہے، ربوا شرعی کو تجارت کی صرف چند شکلوں کے ساتھ خاص کرنا اسلام پر افتراء ہے۔

اسلام کی نظر میں ''مہاجنی اور تجارتی سود'' دونوں حرام ہیں، صرف مہاجنی سود کو حرام قرار دینا اور تجارتی سود کو جائز قرار دینا شریعت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

ہر وہ چیز جو ذمہ پر آجائے، اس میں زیادتی مشروط یا معروف طریقہ پر لینا سود ہے خواہ وہ بیع کی صورت میں ہو یا قرض کی یا سلم کی شکل میں ہو۔

انشورنش اور بینکنگ میں شرعی ربوا پایا جاتا ہے۔

زیادتی کی شرط کا لفظوں میں بیان کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ جو شرط معروف ہو وہ بھی مشروط کے حکم میں ہے۔

شریعت میں ''حقیقت'' کا اعتبار ہوتا ہے ''تسمیہ'' (نام رکھ لینے) کا نہیں، شریعت نے جن عقود و معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اور ان میں حرام و حلال کا فیصلہ فرمادیا ہے، ان میں طرفین کی رضامندی سے کچھ فرق نہیں پڑتا، شریعت کے حکم کو پیش نظر رکھا جائے گا، طرفین کی رضامندی اس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔

(جواہر الفقہ ۴/ ۵۱۳، رسالہ بیمہ اور اس کے احکام)

رباط کی تعریف

اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جنگ کی تیاری کے ساتھ وہاں قیام کرنے کو رباط اور مرابطہ کہا جاتا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک کسی جنگ کا خطرہ سامنے نہیں، سرحد مامون و محفوظ ہے، محض حفظ ما تقدم کے طور پر اس کی نگرانی کرنا ہے، ایسی حالت میں تو یہ بھی جائز ہے کہ آدمی وہاں اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے بسنے لگے اور زمین کی کاشت وغیرہ سے اپنا معاش پیدا کرتا رہے، اس حالت میں اگر اس کی اصل نیت حفاظتِ سرحد کی ہے رہنا بسنا اور کسبِ معاش اس کے تابع ہے تو اس شخص کو بھی رباط فی سبیل اللہ کا ثواب ملے گا خواہ کبھی جنگ نہ کرنا پڑے، لیکن جس کی اصل نیت حفاظتِ سرحد نہ ہو بلکہ اپنا گذارہ ہی مقصد ہو خواہ اتفاقی طور پر سرحد کی حفاظت کی بھی نوبت آجائے یہ شخص مرابط فی سبیل اللہ نہیں ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سرحد پر دشمن کے حملہ کا خطرہ ہے ایسی حالت میں عورتوں بچوں کو وہاں رکھنا درست نہیں، صرف وہ لوگ رہیں جو دشمن کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔

(قرطبی، (معارف القرآن ۲۷۵/۲، سورہ آل عمران پ۴)

رجس کی تعریف

لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ۔ (سورہ احزاب، پ۲۲)

لفظ رجس قرآن کریم میں متعدد معانی کے لیے استعمال ہوا ہے، ایک جگہ ''رجس'' بتوں کے معنی میں آیا ہے، وَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ، اور کبھی لفظ رجس مطلق گناہ کے معنی میں، کبھی عذاب کے معنی میں، کبھی نجاست اور گندگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو شرعاً یا طبعاً قابل نفرت سمجھی جاتی ہے وہ رجس ہے۔ اس آیت میں یہی عام معنی مراد ہیں۔

(معارف القرآن ۱۳۹/۷ سورہ احزاب، پ۲۲)

رِجس عربی زبان میں ایسی گندی چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان کی طبیعت کو گھن اور نفرت پیدا ہو، یہ چاروں چیزیں (شراب، جوا، بت، جوئے کے تیر) ایسی ہیں کہ اگر انسان ذرا بھی عقل سلیم اور طبع سلیم رکھتا ہو خود بخود ہی ان چیزوں سے اس کو گھن اور نفرت ہوگی۔ (معارف القرآن سورہ مائدہ پ۳،ص۲۲۲ ج ۷)

رسول اور نبی کی تعریف اور ان کا باہمی فرق

مِن رَّسُولٍ وَلاَنَبِیٍّ ،ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اور نبی دو الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں ایک نہیں، ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ اس میں اقوال مختلف ہیں، مشہور اور واضح یہ ہے کہ نبی تو اس شخص کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب نبوت قوم کی اصلاح کے لئے عطا ہوا ہو، اور اس کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آتی ہو، خواہ اس کو کوئی مستقل کتاب اور شریعت دی جائے یا کسی پہلے نبی ہی کی کتاب اور شریعت کی تبلیغ کے لئے مامور ہو، پہلے کی مثال حضرت موسیٰ وعیسیٰ اور خاتم الانبیاء علیھم السلام کی ہے، اور دوسرے کی مثال حضرت ہارون علیہ السلام کی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات اور انہی کی شریعت کی تبلیغ وتعلیم کے لئے مامور تھے، اور رسول وہ ہے جس کو مستقل شریعت اور کتاب ملی ہو، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر رسول کا نبی ہونا ضروری ہے، مگر ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں، یہ تقسیم انسانوں کے لئے ہے، فرشتہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لے کر آتا ہے، اس کو رسول کہنا منافی نہیں۔

(معارف القرآن ج ۶ص: ۲۷۷، حج: پ ۱۷)

رشوت کی تعریف

رشوت کی تعریف شرعی یہ ہے کہ جس کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو اس کا معاوضہ لیا جائے، مثلاً جو کام کسی شخص کے فرائض میں داخل ہے اور اس کا پورا کرنا

اس کے ذمہ لازم ہو اس پر کسی فریق سے معاوضہ لینا جیسے حکومت کے افسر اور کلرک سرکاری ملازمت کی رُو سے اپنے فرائض ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں، وہ صاحب معاملہ سے کچھ لیں تو یہ رشوت ہے، یا لڑکی کے ماں باپ اس کی شادی کرنے کے ذمہ دار ہیں کسی سے اس کا معاوضہ نہیں لے سکتے، وہ جس کو رشتہ دیں اس سے کچھ معاوضہ لیں تو وہ رشوت ہے یا صوم وصلوٰۃ اور حج اور تلاوت قرآن عبادات ہیں جو مسلمان کے ذمہ ہیں، ان پر کسی سے کوئی معاوضہ لیا جائے تو وہ رشوت ہے، تعلیم قرآن اور امامت اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (علی فتوی المتاخرین)

پھر جو شخص رشوت لے کر کسی کا کام حق کے مطابق کرتا ہے وہ رشوت لینے کا گنہگار ہے اور یہ مال اس کے لیے سُحت اور حرام ہے اور اگر رشوت کی وجہ سے حق کے خلاف کام کیا تو یہ دوسرا شدید جرم حق تلفی اور حکم خداوندی کو بدل دینے کا اس کے علاوہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے بچائے۔ (معارف القرآن ۱۵۲/۳، سورۂ مائدہ پ ۶)

جس سفارش پر کوئی معاوضہ لیا جائے وہ رشوت ہے، حدیث میں اس کو سُحت و حرام فرمایا ہے، اس میں ہر طرح کی رشوت داخل ہے، خواہ وہ مالی ہو یا یہ کہ اس کا کام کرنے کے عوض اپنا کوئی کام اس سے لیا جائے۔

(معارف القرآن سورہ نساء، ص ۵۵۰ ج ۲)

رشوت کی جامع تعریف جو تمام اقسام رشوت پر حاوی ہے یہ ہے کہ کسی غیر متقوم چیز کا عوض لینا۔ (مجالس حکیم الامت ص: ۱۰۷)

ابن عطیہؒ نے فرمایا کہ جس کام کا پورا کرنا کسی شخص کے ذمے واجب ہو وہ اللہ کا عہد اس کے ذمے ہے، اس کو پورا کرنے پر کسی سے معاوضہ لینا اور بغیر لئے نہ کرنا اللہ کا عہد توڑنا ہے اسی طرح جس کام کا نہ کرنا کسی کے ذمے واجب ہے کسی سے معاوضہ لے کر اس کا کر دینا یہ بھی اللہ کا عہد توڑنا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رشوت کی مروجہ قسمیں سب حرام ہیں، جیسے کوئی سرکاری ملازم کسی کام کی تنخواہ حکومت سے پاتا

ہے تو اس نے اللہ سے عہد کر لیا ہے کہ تنخواہ لے کر مفوضہ خدمت پوری کروں گا، اب اگر وہ اس کے کرنے پر کسی سے معاوضہ مانگے اور بغیر معاوضہ اس کو ٹلائے تو یہ عہد اللہ کو توڑ رہا ہے اسی طرح جس کام کا اس کو محکمہ کی طرف سے اختیار نہیں اس کو رشوت لے کر کر دینا بھی اللہ سے عہد شکنی ہے۔ (بحر محیط)

ابن عطیہؒ کے اس کلام میں رشوت کی جامع و مانع تعریف بھی آ گئی جو تفسیر بحر محیط کے الفاظ میں یہ ہے **اَخذ الاموال علی فعل ما یجب علی الاخذ فعله او فعل مایجب علیه ترکه** یعنی جس کام کا کرنا اس کے ذمے واجب ہے اس کے چھوڑنے پر معاوضہ لینا یا جس کام کو چھوڑنا اس کے ذمے لازم ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے۔ (تفسیر بحر محیط ص ۵۳۳، ج ۵)

(معارف القرآن سورہ نحل، ص ۳۸۵، ۳۸۴ ج ۵، پ ۱۴))

رضاعت کی تعریف

وَاَخَواتُکُم مِن الرضَاعَةِ (سورہ نساء، پ ۴)

یعنی رضاعت کے رشتے سے جو بہنیں ہیں ان سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔

تفصیل اس کی یوں ہے کہ جب کسی لڑکی یا لڑکے نے ایام رضاع میں کسی عورت کا دودھ پی لیا وہ عورت ان کی رضاعی والدہ بن گئی، اور اس عورت کا شوہر اس کا باپ بن گیا، اور اس عورت کی نسبی اولاد اس کی بہن بھائی بن گئے، اور اس عورت کی بہنیں ان کی خالائیں بن گئیں، اور اس عورت کا جیٹھ، دیوران بچوں کے رضاعی چچا بن گئے، اور اس عورت کے شوہر کی بہنیں ان بچوں کی پھوپھیاں بن گئیں، اور باہم ان سب میں حرمت رضاعت ثابت ہو گئیں، نسب کے رشتے سے جو نکاح آپس میں حرام ہیں رضاع کے رشتے سے بھی حرام ہو جاتا ہے، حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے

یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة (بخاری)

البتہ اتنی بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ حرمت رضاعت اسی زمانہ میں دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے جو بچپن میں دودھ پینے کا زمانہ ہوتا ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے **انما الرضاعة من المجاعة** یعنی رضاعت سے جو حرمت ثابت ہوگی وہ اسی زمانہ کے دودھ پینے سے ہوں گی جس زمانہ میں دودھ پینے سے ہی بچے کا نشو ونما ہوتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

اور یہ مدت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بچہ کی پیدائش سے لے کر ڈھائی سال تک ہے اور دیگر فقہاء کے نزدیک جن میں امام ابوحنیفہؒ کے مخصوص شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ بھی ہیں صرف دوسال کی مدت تک رضاعت ثابت ہوسکتی ہے، اور اسی پر امام محمدؒ کا فتویٰ بھی ہے، اگر کسی لڑکے لڑکی نے اس عمر کے بعد کسی عورت کا دودھ پیا تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

(معارف القرآن ج ۲، ص ۳۵۹ سورہ نساء، پ ۴)

رَفَث کی تعریف

''رَفَث'' ایک لفظ جامع ہے جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی کھلی گفتگو بھی داخل ہے، محرم کو حالتِ احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں، تعریض وکنایہ کا مضائقہ نہیں۔

(معارف القرآن ج ۱ ص ۴۸۴ سورہ بقرہ پ ۲)

رقبۃ اور رقاب کی تعریف

رقاب رقبۃ کی جمع ہے، اصل میں گردن کو رقبہ کہتے ہیں عرف میں اس شخص کو رقبہ کہہ دیا جاتا ہے جس کی گردن کسی دوسرے کی غلامی میں مقید ہو۔

(معارف القرآن سورہ توبہ پ ۱۰، ص ۴۰۵ ج ۴)

رکون کے معنی

دوسری آیت میں انسان کو خرابی اور بربادی سے بچانے کے لیے ایک اور اہم ہدایت نامہ دیا گیا ہے، **وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ**، یعنی ظالموں کی طرف ادنی میلان بھی نہ رکھو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ساتھ تمہیں بھی جہنم کی آگ لگ جائے۔ لاترکنوا، مصدر رکون سے بنا ہے جس کے معنی کسی طرف خفیف سے میلان اور جھکاؤ اور اس پر اعتماد و رضا کے ہیں، اس لیے آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ظلم و جور میں خود مبتلا ہونے کو تو دین و دنیا کی تباہی سبھی جانتے ہیں مگر ظالموں کی طرف ادنیٰ سا جھکاؤ اور میلان اُن سے راضی ہونا، ان پر اعتماد کرنا بھی انسان کو اسی بربادی کے کنارے لگا دیتا ہے۔

اس جھکاؤ اور میلان سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق صحابہ و تابعین کے چند اقوال منقول ہیں، جن میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں، سب اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو، اور ان کا کہنا نہ مانو، ابن جریج نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو، ابو العالیہؒ نے فرمایا کہ ان کے اعمال و افعال کو پسند نہ کرو، (قرطبی) سدیؒ نے فرمایا کہ ظالموں سے مداہنت نہ کرو، یعنی ان کے برے اعمال پر سکوت یا رضا کا اظہار نہ کرو، عکرمہؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو، قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ شکل و صورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ ظلم و جور کی ممانعت اور حرمت کے لیے اس آیت میں وہ انتہائی شدت ہے جو زیادہ تصور میں لائی جاسکتی ہے، کیونکہ ظالموں کے ساتھ

دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنیٰ درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنے دنیوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لیے جائے۔ (مظہری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کفر اور اہل معصیت اور اہل بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے، اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی صلاح وفساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے، اسی لیے حضرت حسن بصریؒ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے دین کو دو حرفِ لا کے اندر جمع کر دیا ہے ایک پہلی آیت میں لا تطغوا اور دوسرا دوسری آیت میں لا ترکنوا پہلے لفظ میں حدودِ شرعیہ سے نکلنے کی اور دوسرے لفظ میں برے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔ (معارف القرآن ۴/۶۷۲، سورۂ ہود پ۲)

رمل ورمی کی تعریف

طواف کے پہلے تین پھیروں میں اکڑ کر شانہ ہلاتے ہوئے قریب قریب قدم رکھ کر ذرا تیزی سے چلنا۔

رمی کی تعریف: جمرات پر کنکریاں پھینکنا۔ (احکام حج ص:۱۳۰)

روح کی تعریف

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي (سورہ حِجر)

روح کوئی جسم ہے یا کوئی جوہر مجرّد، اس میں علماء وحکماء کا اختلاف قدیم زمانے سے چلا آتا ہے، شیخ عبد الرؤف مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں

حکماء کے اقوال ایک ہزار تک پہنچے ہیں، مگر سب قیاسات اور تخمینے ہی ہے، کسی کو یقینی نہیں کہا جا سکتا، امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور عموماً صوفیہ اور فلاسفہ کا قول یہ ہے کہ وہ جسم نہیں بلکہ جوہر مجرّد ہے، امام رازیؒ نے اس کے بارہ دلائل پیش کئے ہیں۔

مگر جمہور علماءِ اُمت روح کو ایک جسم لطیف قرار دیتے ہیں، نفخ کے معنیٰ پھونک مارنے کے ہیں اگر بقول جمہور روح کو جسم لطیف قرار دیا جائے تو اس کو پھونکنا ظاہر ہے، اور جوہر مجرّد مان لیا جائے تو پھونکنے کے معنیٰ اس کا بدن سے تعلق پیدا کر دینا ہوگا (بیان القرآن)

یہاں اس طویل الذیل بحث کو چھوڑ کر ایک خاص تحقیق پر اکتفاء کیا جاتا ہے جو تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تحریر فرمائی ہے۔

روح علوی اور سِفلی کی تعریف

حضرت قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ روح کی دو قسم ہیں (۱) علوی (۲) سفلی، روح علوی مادّہ سے مجرد اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جس کی حقیقت کا ادراک مشکل ہے، اہل کشف کو اس کا اصل مقام عرش کے اوپر دکھائی دیتا ہے، کیونکہ وہ عرش سے زیادہ لطیف ہے اور روح علوی بنظر کشفی اوپر نیچے پانچ درجات میں محسوس کی جاتی ہے، وہ پانچ یہ ہے، قلب، روح، سِرّ، خفی، اخفی اور یہ سب عالمِ امر کے لطائف میں سے ہیں، جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا ہے:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ.

اور روح سفلی وہ بخارِ لطیف ہے جو بدن انسانی کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی، ہوا سے پیدا ہوتا ہے، اور اسی روح سفلی کو نفس کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس روح سفلی کو جسے نفس کہا جاتا ہے ارواحِ علویہ مذکورہ کا آئینہ بنا دیا ہے، جس طرح آئینہ جب آفتاب کے مقابل کیا جائے تو آفتاب کے

بہت بعد ہونے کے باوجود اس میں آفتاب کا عکس آجاتا ہے اور روشنی کی وجہ سے وہ بھی آفتاب کی طرح چمک اٹھتا ہے اور آفتاب کی حرارت بھی اس میں آجاتی ہے، جو کپڑے کو جلا سکتی ہے، اسی طرح ارواح علویہ اگرچہ اپنے تجرد کی وجہ سے بہت اعلیٰ وارفع اور بہت مسافتِ بعیدہ پر ہے مگر ان کا عکس اس روح سفلی کے آئینہ میں آکر ارواحِ علویہ کی کیفیات وآثار اس میں منتقل کردیتا ہے، اور یہی آثار جو نفوس میں پیدا ہوجاتے ہیں ہر ہر فرد کے لئے ارواح جزئیہ کہلاتے ہیں۔

پھر یہ روح سفلی جس کو نفس کہتے ہیں اپنی ان کیفیات وآثار کے ساتھ جن کو ارواحِ علویہ سے حاصل کیا ہے، اس کا تعلق بدنِ انسانی میں سب سے پہلے مضغۂ قلبیہ سے ہوتا ہے، اور اس تعلق ہی کا نام حیات اور زندگی ہے، روحِ سفلی کے تعلق سے سب سے پہلے انسان کے قلب میں حیات اور وہ ادراکات پیدا ہوتے ہیں، جن کو نفس نے ارواحِ علویہ سے حاصل کیا ہے، یہ روحِ سفلی پورے بدن میں پھیلی ہوئی باریک رگوں میں سرایت کرتی ہے، جن کو شرائین کہا جاتا ہے، اور اس طرح وہ تمام بدنِ انسانی کے ہر حصہ میں پہنچ جاتی ہے،

روحِ سفلی کے بدن انسانی میں سرایت کرنے ہی کو نفخِ روح سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ کسی چیز میں پھونک بھرنے سے بہت مشابہ ہے۔

(معارف القرآن ص ۲۹۸، ج ۵ پ ۱۴، سورہ حجر)

روح حقیقی اور روح حیوانی کی تعریف

ثُمَّ اَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (پ ۱۸، سوہ مومنون)

یہاں خلقا آخر کی تفسیر حضرت ابن عباس، مجاہد، شعبی، عکرمہ، ضحاک، ابوالعالیہ وغیرہ نے نفخ روح سے فرمائی ہے، تفسیر مظہری میں ہے کہ غالباً مراد اس روح سے

روحِ حیوانی ہے کہ وہ بھی مادّی اور ایک جسم لطیف ہے، جو جسم حیوانی کے ہر ہر جزء میں سمایا ہوا ہوتا ہے، جس کو اطباء اور فلاسفہ روح کہتے ہیں، اُس کی تخلیق بھی تمام اعضائے انسانی کی تخلیق کے بعد ہوتی ہے، اس لئے اس لفظ ثُمَّ سے تعبیر فرمایا ہے۔

اور روح حقیقی جس کا تعلق عالمِ ارواح سے ہے وہیں سے لاکر اس روح حیوانی کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ حق تعالیٰ اپنی قدرت سے پیدا فرمادیتے ہیں۔

جس کی حقیقت کا پہچاننا انسان کے بس کا نہیں اس روح حقیقی کی تخلیق تو تمام انسانوں کی تخلیق سے بہت پہلے ہے، انھی ارواح کو حق تعالیٰ نے ازل میں جمع کرکے اَلَسْتُ بِرَبِّکُم فرمایا اور سب نے ''بلیٰ'' کے لفظ سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا، ہاں اس کا تعلق جسم انسانی کے ساتھ تخلیق اعضائے انسانی کے بعد ہوتا ہے، اس جگہ نفخِ روح سے اگر یہ مراد لی جائے کہ روح حیوانی کے ساتھ روح حقیقی کا تعلق اس وقت قائم فرمایا گیا تو یہ بھی ممکن ہے۔ اور درحقیقت حیاتِ انسان اسی روح حقیقی سے متعلق ہے، جب اس کا تعلق روح حیوانی کے ساتھ ہوجاتا ہے تو انسان زندہ کہلاتا ہے، جب منقطع ہوجاتا ہے تو انسان مردہ کہلاتا ہے، وہ روحِ حیوانی بھی اپنا عمل چھوڑ دیتی ہے۔ (معارف القرآن ۳۰۴، ج ۶، سورہ مومنون)

لفظ ''روح'' لغات ومحاورات میں نیز قرآن کریم میں متعدد معنیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے، معروف ومشہور معنیٰ تو وہی ہیں جو عام طور پر اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں، یعنی جان جس سے حیات اور زندگی قائم ہے، قرآن کریم میں یہ لفظ جبرئیل امین کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی کئی آیات میں استعمال ہوا ہے، اور خود قرآن کریم اور وحی کو بھی روح کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، أَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا.

(معارف القرآن ج ۵/ ۵۲۵، بنی اسرائیل: پ ۱۵)

ایک قول یہ بھی ہے کہ "روح" نفخ (پھونک) کے معنیٰ میں ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کے گریبان میں اللہ کے حکم سے پھونک دیا تھا، اوراسی سے حمل قرار پا گیا، چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بطور معجزہ کے صرف نفخ سے پیدا ہو گئے تھے، اس لئے آپ کو روح کہا گیا۔ (معارف القرآن ج ۲/ ۶۱۷، نساء: پ ۶)

روح کی دوسری تعریف

یَومَ یَقومُ الرُّوحُ وَالمَلٰئِکَۃُ صَفّاً (سورہ نبا، پ ۳۰)

روح سے مراد بعض ائمہ تفسیر کے نزدیک جبرئیل امین ہیں ان کا ذکر عام ملائکہ سے پہلے ان کی عظمتِ شان کے اظہار کیلئے ہے، اور بعض روایات مرفوعہ میں ہے کہ روح اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم الشان لشکر ہے جو فرشتے نہیں، ان کے سر اور ہاتھ پاؤں ہیں، اس تفسیر پر گویا دو صفیں ہوں گی، ایک صف روح کی دوسری فرشتوں کی۔

(معارف القرآن ج ۸، ۶۵۹، سورہ نبا، پ ۳۰)

روح القدس کی تعریف

قرآن وحدیث میں جابجا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو روح القدس کہا گیا ہے، جیسے قرآن کی اس آیت میں وَاَیَّدنَاہُ بِرُوحِ القُدُسِ نیز قُل نَزَّلَہٗ رُوحُ القُدُس اور حدیث میں حضرت حسّان بن ثابت کا یہ شعر

وجبریل رسول اللہ فینا روح القدس لیس لہ کفاء

(معارف القرآن ج ۱، ۲۵۸، سورہ بقرہ، پ ۱)

رہبانیت اور تبتّل کی تعریف اور اس کے درجات

وَتَبَتَّل اِلَیہِ تَبتِیلاً (سورہ مزمل، پ ۲۹)

یعنی آپ تمام مخلوقات سے قطع نظر کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور

اس کی عبادت میں لگ جائیں، اس کے عام مفہوم میں اللہ کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک نہ کرنا بلکہ خالص اللہ کے لئے عبادت کرنا بھی داخل ہے، اور یہ بھی کہ اپنے تمام اعمال وافعال اور حرکات وسکنات میں نظر اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر رہے کسی مخلوق کو نفع وضرر کا مالک یا حاجت روا اور مشکل کشا نہ سمجھیں، حضرت ابن زید نے فرمایا کہ تبتّل کے معنیٰ یہ ہے کہ تمام دنیا وما فیہا کو چھوڑے اور صرف اس چیز کی طرف متوجہ رہے جو اللہ کے پاس ہے۔ (مظہری)

لیکن جس تبتّل اور مخلوق سے قطع تعلق کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے وہ اس ترکِ تعلقات اور ترکِ دنیا سے بالکل مختلف ہے جس کو قرآن میں رہبانیت کہا ہے اور اس کی مذمت کی طرف اشارہ کیا ہے **ورھبانیۃ ابتدعوھا** اور جس کے متعلق حدیث میں ہے **لا رھبانیۃ فی الاسلام**۔

کیونکہ رہبانیت اصطلاحِ شرع میں ترکِ دنیا اور ترکِ تعلقات کا نام ہے جس میں تمام لذائذ اور حلال طیّب اشیاء کو بہ نیتِ عبادت چھوڑ دیا جائے یعنی یہ اعتقاد ہو کہ ان حلال چیزوں کے چھوڑے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں ہوسکتی یا عملاً ترک تعلقات اس طرح کرے کہ لوگوں کے حقوق واجبہ کی رعایت نہ کرے، ان میں خلل آئے، اور یہاں جس تبتّل اور ترک تعلق کا حکم ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق پر کسی دوسری مخلوق کا تعلق غالب نہ آجائے خواہ اعتقاداً یا عملاً اور ایسا ترک تعلق دنیوی تمام معاملات ازدواج ونکاح اور تعلقات رشتہ داری وغیرہ کے منافی نہیں بلکہ ان سب کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے جیسا کہ تمام انبیاء علیھم السلام کی سنت خصوصاً سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی اور شمائل اس پر شاہد ہیں، یہاں جس مفہوم کو لفظ تبتل سے تعبیر کیا گیا ہے اسی کا دوسرا عنوان سلفِ صالحین کی زبان میں اخلاص ہے۔ (مظہری) (معارف القرآن سورہ مزمل، ص ۵۹۴، ج ۸)

رہبانیت کے تین درجات

لفظ رہبانیت کا عام اطلاق ترک لذّات وترکِ مباحات کے لئے ہوتا ہے، اس کے چند درجے ہیں ایک یہ کہ کسی مباح وحلال چیز کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار دے، یہ تو دین کی تحریف وتغییر ہے، اس معنیٰ کے اعتبار سے رہبانیت قطعاً حرام ہے، اور آیت قرآن (یَاۤاَیُّھَاالَّذِینَ اٰمَنُوا لَاتُحَرِّمُوا طَیِّبَاتِ مَاۤاَحَلَّ اللّٰہُ لَکُم)اور اس کی امثال میں اسی کی ممانعت وحرمت کا بیان ہے، اس آیت کا عنوان لَاتُحَرِّمُوا خود یہ بتلا رہا ہے کہ اس کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار دے رہا ہے جو احکام الٰہیہ میں تبدیل وتحریف کے مرادف ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ مباح کے کرنے کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار نہیں دیتا، مگر کسی دنیاوی یا دینی ضرورت کی وجہ سے اس کو چھوڑنے کی پابندی کرتا ہے، دنیوی ضرورت جیسے کسی بیماری کے خطرہ سے کسی مباح چیز سے پرہیز کرے، اور دینی ضرورت یہ کہ یہ محسوس کرے کہ میں نے اس مباح کو اختیار کیا تو انجام کار میں کسی گناہ میں مبتلا ہوجاؤں گا، جیسے جھوٹ، غیبت وغیرہ سے بچنے کے لئے کوئی آدمی لوگوں سے اختلاط ہی چھوڑ دے، یا کسی نفسانی رذیلہ کے علاج کے لئے چند روز بعض مباحات کو ترک کردے اور اس ترک کی پابندی بطور علاج ودوا کے اس وقت تک کرے جب تک یہ رذیلہ دور نہ ہوجائے، جیسے صوفیائے کرام مبتدی کو کم کھانے، کم سونے، کم اختلاط کی تاکید کرتے ہیں تو یہ ایک مجاہدہ ہوتا ہے نفس کو اعتدال پر لانے کا، جب نفس پر قابو ہوجاتا ہے، کہ ناجائز تک پہنچنے کا خطرہ نہ رہے تو یہ پرہیز چھوڑ دیا جاتا ہے یہ درحقیقت رہبانیت نہیں، تقویٰ ہے جو مطلوب عن الدین اور اسلاف کرام صحابہ وتابعین اور ائمہ دین سے ثابت ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ کسی مباح کو حرام تو قرار نہیں دیتا مگر اس کا استعمال جس طرح سنت سے ثابت ہے اس طرح کے استعمال کو چھوڑنا بھی ثواب اور افضل جان کر اس سے پرہیز کرتا ہے یہ ایک قسم کا غلو ہے، جس سے احادیث کثیرہ میں رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، اور جس حدیث میں **لا رھبانیة فی الاسلام** آیا ہے، ''یعنی اسلام میں رہبانیت نہیں'' اس سے مراد ایسا ہی ترک مباحات ہے کہ ان کے ترک کو افضل و ثواب سمجھے، بنی اسرائیل میں جو رہبانیت اول شروع ہوئی وہ اگر حفاظتِ دین کی ضرورت سے تھی تو دوسری قسم یعنی تقویٰ میں داخل ہے، لیکن اہلِ کتاب میں غلو فی الدین کی آفت بہت تھی، وہ اس غلو میں پہلے درجہ میں تحریم حلال تک پہنچے تو حرام کے مرتکب ہوئے اور تیسرا درجہ تک رہے تو بھی ایک مذموم فعل کے مجرم بنے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(معارف القرآن سورہ حدید، ص۳۲۹، پ۲۷، ج۸)

ز

زُبُر کی تعریف

''زُبُر'' زبور کی جمع ہے، لغت میں ہر لکھی ہوئی چیز کو کہتے ہیں اور اس خاص کتاب کا نام بھی زبور ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

(معارف القرآن سورہ قمر، ص ۲۳۷ ج ۸)

زَقّوم کی تعریف

زَقوم نام کا ایک درخت جزیرۂ عرب کے علاقہ تہامہ میں پایا جاتا ہے اور علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ یہ دوسرے بنجر صحراؤں میں بھی ہوتا ہے، بعض حضرات نے فرمایا ہے یہ وہی درخت ہے جسے اُردو میں ''تھوہڑ'' کہتے ہیں، اسی کے قریب قریب ایک اور درخت ہندوستان میں ''ناگ پھن'' کے نام سے معروف ہے، بعض حضرات نے اس کو زَقّوم قرار دیا ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے، اب حضرات مفسرین کی رائے اس میں مختلف ہے کہ جہنمیوں کو جو درخت کھلایا جائے گا وہ یہی دنیا کا زَقّوم ہے یا کوئی اور درخت ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہی دنیا کا زَقّوم مراد ہے اور بعض نے کہا کہ دوزخ کا زَقّوم بالکل الگ چیز ہے، دنیا کے زَقّوم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(معارف القرآن ص ۴۴۱، ج ۷، سورہ صٰفّت)

زکوٰۃ کی تعریف

لفظ زکوٰۃ کے معنی لغت میں پاک کرنے کے ہیں، اصطلاح میں شرح مال کا

ایک خاص حصہ کچھ شرائط کے ساتھ صدقہ کرنے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں عام طور پر یہ لفظ اسی اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اور اس پر جو شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے مکہ میں زکوٰۃ فرض نہ ہوئی تھی، ہجرت مدینہ کے بعد فرض ہوئی اس کا جواب ابن کثیر وغیرہ مفسرین کی طرف سے یہ ہے کہ زکوۃ کی فرضیت مکہ ہی میں ہو چکی تھی، سورہ مزمل جو بالاتفاق مکی ہے اس میں بھی أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ کے ساتھ آتُوا الزَّكٰوةَ کا ذکر موجود ہے مگر سرکاری طور پر اس کے وصول کرنے کا عام انتظام اور نصابات وغیرہ کی تفصیلات مدینہ طیبہ جانے کے بعد جاری ہوئیں، جن لوگوں نے زکوۃ کو مدنی احکام میں شمار کیا ہے ان کا یہی منشاء ہے، اور جن حضرات نے فرضیت زکوۃ کو مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد کا حکم قرار دیا ہے انہوں نے اس جگہ زکوۃ کا مضمون عام لغوی معنی میں اپنے نفس کو پاک کرنا قرار دیا ہے، خلاصہ تفسیر میں بھی یہی لیا گیا ہے، اس معنی کا قرینہ اس آیت میں یہ بھی ہے کہ عام طور پر قرآن کریم میں جہاں زکوۃ فرض کا ذکر آیا ہے تو اس کو إيتاء الزكوة، يوتون الزكوة اور آتوا الزكوة کے عنوان سے بیان کیا گیا، یہاں عنوان بدل کر لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ فرمایا اس کا قرینہ ہے کہ یہاں زکوۃ کے وہ اصطلاحی معنی مراد نہیں اس کے علاوہ فاعلون کا بے تکلف تعلق فعل سے ہوتا ہے اور زکوۃ اصطلاحی فعل نہیں بلکہ ایک حصہ مال ہے اس حصہ مال کے لیے فاعلون کہنا بغیر تاویل کے نہیں ہو سکتا۔ اگر آیت میں زکوۃ کے معنی اصطلاحی زکوۃ سے تزکیہ نفس ہے یعنی اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا تو وہ بھی فرض ہی ہے، کیونکہ شرک، ریا، تکبر، حسد، بغض، حرص، بخل جن سے نفس کو پاک کرنا تزکیہ کہلاتا ہے یہ سب چیزیں حرام اور گناہ کبیرہ ہیں، نفس کو ان سے پاک کرنا فرض ہے۔

(معارف القرآن ۶/۲۹۷، سورۂ مؤمنون پ ۱۸)

زکوٰۃ کی لغوی واصطلاحی تعریف

زکوٰۃ کے معنی ہیں طہارت اور پاکی اور یہ لفظ ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پاکی کے لیے بولا جاتا ہے۔ (معارف ۱/۳۳۱، بقرہ)

آتوا الزکوۃ: لفظ زکوٰۃ کے معنی لغت میں دو آتے ہیں پاک کرنا، اور بڑھنا۔ اصطلاح شریعت میں مال کے اس حصہ کو زکاۃ کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں سے نکالا جائے اور اس کے مطابق صرف کیا جائے۔

(معارف القرآن ۱/۱۵۵، سورۂ بقرہ پ ۱)

لفظ ''یزکیھم'' زکوٰۃ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں طہارت اور پاکی، اور یہ لفظ ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پاکی کے لیے بولا جاتا ہے۔ (سورہ بقرہ ۱/۳۳۱)

لفظ زکوٰۃ کے معنیٰ لغت میں پاک کرنے کے ہیں، اصطلاح شرع میں مال کا ایک خاص حصہ کچھ شرائط کے ساتھ صدقہ کرنے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں عام طور پر یہ لفظ اسی اصطلاحی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

(معارف القرآن ۲۹۷، ج ۶، سورہ مؤمنون)

زکوٰۃ کے لغوی معنی بڑھنے اور پاک ہونے کے ہیں، قرآن وسنت کی اصطلاح میں زکوٰۃ اس حصہ مال کو کہا جاتا ہے جو فی سبیل اللہ بطور فریضہ مالیہ کے نکالا جائے، اس کو زکوۃ کہنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حسب تصریح قرآن وحدیث زکوٰۃ نکالنا، مال میں برکت اور زیادتی کا سبب ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ زکوٰۃ نکالنے سے انسان کو باطنی پاکی حاصل ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن وسنت کی اصطلاح میں زکوۃ اس حصہ مال کو کہا جاتا ہے جس کا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا انسان پر فرض کیا گیا ہے، کتب فقہ میں بھی زکوٰۃ اسی معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (جواہر الفقہ جدید، احکام زکوٰۃ ۳/۲۱۷)

زَلّۃ اور اِزْ لال (لغزش) کے معنیٰ

’’زَلّۃ‘‘ کے معنیٰ عربی لغت میں لغزش کے ہیں، ازلال کے معنیٰ کسی کو لغزش دینا، معنیٰ یہ ہیں کہ شیطان نے آدم وحوا کو لغزش دیدی، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس کا اظہار کررہے ہیں کہ حضرت آدم وحوّا کی یہ خلاف ورزی اس طرح کی نہ تھی جو عام گنہگاروں کی طرف سے ہوا کرتی ہے، بلکہ شیطانی تلبیس سے کسی دھوکہ فریب میں مبتلا ہوکر ایسے اقدام کی نوبت آگئی کہ جس درخت کو ممنوع قرار دیا تھا اس کا پھل وغیرہ کھا بیٹھے۔ (معارف القرآن ج ا ص ۱۹۲ سورہ بقرہ پ ۲)

زلزلۃ الساعۃ کی تعریف

قیامت قائم ہونے اور لوگوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد یا اس سے پہلے، بعض نے فرمایا کہ یہ قیامت سے پہلے اسی دنیا میں ہوگا اور قیامت کی آخری علامت میں شمار ہوگا، جس کا ذکر قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں آیا ہے، اِذَا زُلْـزِلَـتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا O وَحُـمِـلَـتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِـدَةً O اِذَا رُجَّـتِ الْاَرْضُ رَجًّا. وغیرہا، اور بعض حضرات نے حدیث مذکور جس میں آدم علیہ السلام کو خطاب کرنے کا ذکر ہے اس سے استدلال کرتے ہوئے یہ قرار دیا ہے کہ زلزلہ حشر ونشر اور دوبارہ زندہ ہونے کے بعد ہوگا، اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں کوئی منافات نہیں، قیامت سے پہلے زلزلہ ہونا بھی آیات قرآن اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور حشر ونشر کے بعد ہونا اس حدیث مذکور سے ثابت ہے۔ واللہ اعلم

اس زلزلہ قیامت کی جو کیفیت آگے آیت میں ذکر کی گئی ہے کہ تمام حمل والی عورتوں کے حمل ساقط ہوجائیں گے، اور دودھ پلانے والی عورتیں اپنے دودھ پیتے

بچے کو بھول جائیں گی، اگر یہ زلزلہ اسی دنیا میں قبل القیامۃ ہے تو ایسا واقعہ پیش آنے میں کوئی اشکال نہیں اور اگر حشر ونشر قیامت کے بعد ہے تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ جو عورت اس دنیا میں حالت حمل میں مری ہے قیامت کے روز اسی حالت میں اس کا حشر ہوگا، اور جو دودھ پلانے کے زمانے میں مرگئی ہے وہ اسی طرح بچے کے ساتھ اٹھائی جائے گی کماذکرہ القرطبی۔ (معارف القرآن ج۶/ ۲۳۷، حج: پ۱۷)

زمزم کی تعریف

مسجد حرام میں بیت اللہ کے قریب ایک کنواں ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے چشمہ کی صورت میں اپنے نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام اوران کی والدہ کے لیے جاری فرمایا تھا، اور ہزاروں سال سے اب تک جاری ہے۔ (احکام حج ص:۱۳۰)

زُہد کی تعریف

زاہدین، زاہد کی جمع ہے، جو زہد سے مشتق ہے، زہد کے لفظی معنیٰ بے رغبتی، بے توجہی کے آتے ہیں، محاورات میں دنیا کی مال ودولت سے بے رغبتی اور اعراض کو کہا جاتا ہے۔

(معارف القرآن ج۵/ ۲۸، سورہ یوسف، پ۱۳)

زینت کی تعریف

جس سے بدن کی کوئی خاص تقویت بھی نہیں، محض تفریح خواہش ہے، ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے کسی ناجائز چیز کے جائز ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(جواہر الفقہ ۷/ ۳۵، اعضاء انسان کی پیوند کاری)

(س)

ساعۃ کی تعریف

لفظ ساعۃ عربی لغت میں تھوڑے سے زمانہ کے لیے بولا جاتا ہے جس کی کوئی خاص تحدید لغت کے اعتبار سے نہیں ہے، اور اہل نجوم کی اصطلاح میں رات اور دن کے چوبیس حصوں میں سے ایک حصہ کا نام ساعۃ ہے، جس کو اردو میں گھنٹہ کہا جاتا ہے، اور قرآن کی اصطلاح میں یہ لفظ اس دن کے لیے بولا جاتا ہے جو ساری مخلوقات کی موت کا دن ہوگا اور اس دن کے لیے بھی جس میں ساری مخلوقات دوبارہ زندہ ہوکر رب العالمین کے دربار میں حاضر ہوں گی، اَیَّان کے معنی کب اور مُرسٰھَا کے معنی ٹھہرنے اور قائم ہونے کے ہیں۔ (معارف القرآن ۴/۱۴۰، سورہ اعراف پ ۹)

سائحین کی تعریف

السائِحُون: کے معنی جمہور مفسرین کے نزدیک صائمون یعنی روزہ داروں کے ہیں، اصل میں یہ لفظ سیاحت سے ماخوذ ہے، اسلام سے پہلے دین نصرانیت میں سیاحت ایک عبادت سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنے گھر بار کو چھوڑ کر عبادت کے لیے نکل کھڑا ہو، اسلام میں اس کو رہبانیت قرار دیا گیا اور اس سے منع کیا گیا، اس کے قائم مقام روزہ کی عبادت مقرر کی گئی، کیونکہ سیاحت کا مقصد ترک دنیا تھا، روزہ ایسی چیز ہے کہ اپنے گھر میں رہتے ہوئے ایک معین وقت میں دنیا کی تمام خواہشات کو ترک کردینا ہوتا ہے، اور اسی بنا پر تمام خواہشات کو ترک کردینا ہوتا ہے، اور اسی بنا پر بعض روایات میں جہاد کو بھی سیاحت قرار دیا گیا ہے، ابن ماجہ، حاکم، بیہقی نے بسند

صحیح روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "**سیاحة امتی الجهاد فی سبیل الله**" یعنی اس امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں سائحین کا لفظ آیا ہے اس سے مراد صائمین ہیں، حضرت عکرمہؒ نے سائحین کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ طالب علم ہیں جو طلب علم کے لیے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نکلتے ہیں۔

(مظہری، معارف القرآن توبہ پ ۱۱، ۴۶۹/۲)

سائل اور محروم کی تعریف

سائل سے مراد وہ غریب حاجت مند ہے جو اپنی حاجت لوگوں کے سامنے ظاہر کردیتا ہے اور لوگ اس کی مدد کردیتے ہیں، اور محروم سے مراد وہ شخص ہے کہ فقیر ومفلس اور حاجت مند ہونے کے باوجود شرافت نفس کے سبب اپنی حاجت کسی پر ظاہر نہیں کرتا، اس لئے لوگوں کی امداد سے محروم رہتا ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ ص ۱۶۱ سورہ ذاریات پ ۲۶)

وَاَمَّا السَّائِلَ فَلاَ تَنْهَرْ، (سورہ والضحیٰ پ ۳۰)

تنهر نهر سے مشتق ہے جس کے معنیٰ زجر اور جھڑکنے کے ہیں، اور سائل کے معنیٰ سوال کرنے والا، اس میں وہ بھی داخل ہے جو کسی مال کا سوال کرے اور وہ بھی جو علمی تحقیق کا سوال کرے، دونوں کو جھڑکنے اور ڈانٹنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمایا گیا، بہتر یہ ہے کہ سائل کو دے کر رخصت کرے، اور نہیں دے سکتا تو نرمی سے عذر کردے، اسی طرح کسی علمی مسئلہ کا سوال کرنے والے کے جواب میں بھی سختی اور بدخوئی ممنوع ہے، نرمی اور شفقت سے جواب دینا چاہئے، بجز اس کے کہ سائل کسی طرح مانے ہی نہیں تو بضرورت زجر بھی جائز ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ ص ۷۶۷ سورہ والضحیٰ پ ۳۰)

سبا کی تعریف

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ سبا یمن کے بادشاہوں اور اس ملک کے باشندوں کا لقب ہے، تبابعہ جو اس ملک کے مقتدا و پیشواء تھے وہ بھی اسی قوم سبا میں سے تھے اور ملکۂ بلقیس جن کا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ سورہ نمل میں گذر چکا ہے، وہ بھی اسی قوم میں سے تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے رزق کے دروازے کھول دئے تھے۔

امام احمد حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ سبا جس کا قرآن میں ذکر ہے یہ کسی مرد یا عورت کا نام ہے یا زمین کے کسی حصہ کا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ایک مرد کا نام ہے جس کی اولاد میں دس لڑکے ہوئے جن میں سے چھ یمن میں آباد رہے اور چار شام میں چلے گئے۔

ابن کثیر کی تحقیق بحوالۂ علماء نسب یہ ہے کہ یہ دس لڑکے سبا کے صلبی اور بلا واسطہ بیٹے نہیں تھے بلکہ سبا کی دوسری تیسری یا چوتھی نسل میں یہ لوگ ہوئے ہیں پھر ان کے قبیلے شام و یمن میں پھیلے اور انہی کے ناموں سے موسوم ہوئے، اور سبا کا اصل نام عبد شمس تھا۔

(معارف القرآن ۲۸۰، ج ۷، سورہ سبا پ ۲۲)

سبیل اور سُبل کی تعریف

''سُبل'' سبیل کی جمع ہے اس کے معنی بھی راستہ کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کا اصلی راستہ تو ایک ہی ہے لیکن دنیا میں لوگوں نے اپنے اپنے خیالات سے مختلف راستے بنا رکھے ہیں، تم ان راستوں میں

سے کسی راستہ پر نہ چلو، کیونکہ یہ راستے حقیقت میں خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے نہیں ہیں، اس لیے جو ان راستوں پر چلے گا وہ اللہ کے راستہ سے دور جا پڑے گا۔

(معارف القرآن ۳/۹۱، سورہ انعام پ:۸)

سترِ عورت کی تعریف

مرد و عورت کا وہ حصۂ بدن جس کو عربی میں عورت اور اُردو و فارسی میں ستر کہتے ہیں جس کا سب سے چھپانا شرعی، طبعی اور عقلی طور پر فرض ہے، اور ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض جس پر عمل ضروری ہے وہ سترِ عورت یعنی اعضائے مستورہ کا چھپانا ہے، یہ فریضہ تو ابتداءِ آفرینش سے فرض ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں فرض رہا ہے۔ (معارف القرآن ۲۱۱، ج ۷، سورہ احزاب)

مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنوں تک، اور عورت کا ستر سارا بدن، صرف چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں اور قدم مستثنیٰ ہیں۔

روایات حدیث میں یہ سب تفصیل مذکور ہے، مرد کے لئے ناف سے نیچے کا بدن، یا گھٹنے کھلے ہوں تو ایسا لباس خود بھی گناہ ہے، اور نماز بھی اس میں ادا نہیں ہوتی، اسی طرح عورت کا سر گردن یا بازو، یا پنڈلی کھلی ہو تو ایسے لباس میں رہنا خود بھی ناجائز ہے، اور نماز بھی ادا نہیں ہوتی، ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس مکان میں عورت ننگے سر ہو وہاں نیکی کے فرشتے نہیں آتے۔

عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں اور قدم جو ستر سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے، اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ نماز میں اس کے اعضاء کھلے ہوں تو نماز میں کوئی خلل نہیں آئے گا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غیر محرموں کے سامنے بھی وہ بغیر شرعی عذر کے چہرہ کھول پھرا کرے۔

(معارف القرآن ج ۳/۵۴۴، اعراف: پ۸)

سجدہ کی لغوی تعریف

وَاِذَا قُرِئَ عَلَیھِمُ القُراٰنُ لَایَسجُدُونَ (سورہ انشقاق، پ۳۰)

یعنی جب ان کے سامنے واضح ہدایات سے بھرا ہوا قرآن پڑھا جاتا ہے تو اس وقت بھی اللہ کی طرف نہیں جھکتے۔

سجدہ اور سجود کے معنیٰ لغت میں جھکنے کے ہیں، اور اطاعت شعاری اور فرمانبرداری سے کنایہ کیا جاتا ہے، ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ سجدہ سے مراد سجدہ اصطلاحی نہیں بلکہ اللہ کے سامنے اطاعت کے ساتھ جھکنا جس کو خشوع وخضوع کہتے ہیں، وہ مراد ہے اور وجہ اس کی کھلی ہوئی ہے کہ اس آیت میں حکم سجدہ کسی خاص آیت کے متعلق نہیں بلکہ پورے قرآن کے متعلق ہے، اگر اس سے سجدہ اصطلاحی مراد لیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ پورے قرآن کی ہر آیت پر سجدہ لازم ہو جو باجماع امت سے مراد نہیں ہوسکتا۔

(معارف القرآن ص۷۰۷، سورہ انشقاق، ج۸، پ۳۰)

سجدہ عبادت وسجدہ تعظیمی کا فرق

وَاِذ قُلنَا لِلمَلٰئِکَةِ اسجُدُوا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوا اِلَّا اِبلِیسَ اَبیٰ وَاستَکبَرَ وَکَانَ مِنَ الکَافِرِینَ (سورہ بقرہ، پ۱)

اس آیت میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ آدمؑ کو سجدہ کریں اور سورہ یوسف میں حضرت یوسفؑ کے والدین اور بھائیوں کا مصر پہنچنے کے بعد یوسفؑ کو سجدہ کرنا مذکور ہے، وَخَرُّوالَهُ سُجَّدًا یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سجدہ عبادت کیلئے نہیں ہوسکتا کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک وکفر ہے جس میں یہ احتمال ہی نہیں کسی وقت کسی شریعت میں جائز ہوسکے، اس کے سوا کوئی احتمال نہیں کہ قدیم انبیاء کے زمانے میں سجدہ کا وہی

درجہ ہوں گا جو ہمارے زمانے میں سلام مصافحہ معانقہ اور دست بوسی اور تعظیم کے لئے کھڑے ہوجانے کا ہے، امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں یہی فرمایا ہے کہ انبیاء سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور تہیہ کیلئے سجدہ مباح تھا، شریعت محمدیہ میں منسوخ ہوگیا اور بڑوں کی تعظیم کیلئے صرف سلام مصافحہ کی اجازت دی گئی، رکوع وسجدہ اور بہیت نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دے دیا گیا، توضیح اس کی یہ ہے کہ اصل کفر وشرک اور غیر اللہ کی عبادت تو اصول ایمان کے خلاف ہے وہ کبھی کسی شریعت میں جائز نہیں ہوسکتے لیکن کچھ افعال واعمال ایسے ہیں جو اپنی ذات میں شرک وکفر نہیں مگر لوگوں کی جہالت اور غفلت سے وہ افعال ذریعہ شرک وکفر کا بن سکتے ہیں، ایسے افعال کو انبیاء سابقین کی شریعتوں میں مطلقاً منع نہیں کیا گیا بلکہ ان کو ذریعۂ شرک بنانے سے روکا گیا، جیسے جانداروں کی تصویر بنانا اور استعمال کرنا اپنی ذات میں کفر وشرک نہیں، اس لئے پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں مشہور ہے: يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِن مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ یعنی جنات ان کیلئے بڑی محرابیں اور تصویریں بنایا کرتے تھے اسی طرح سجدۂ تعظیمی پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، لیکن آخر لوگوں کی جہالت سے یہی چیزیں شرک وبت پرستی کا ذریعہ بن گئیں، اور اسی راہ سے انبیاء علیہ السلام کے دین اور شریعت میں تحریف ہوگئی اور پھر دوسرے انبیاء اور دوسری شریعتوں نے آکر اس کو مٹایا شریعت محمدیہ کیونکہ دائمی اور عبدی شریعت ہے اس لئے اس کو مسخ وتحریف سے بچانے کیلئے ہر ایسے سوراخ کو بند کردیا گیا جہاں سے شرک وبت پرستی آسکتی تھی اسی سلسلہ میں وہ تمام چیزیں اس شریعت میں حرام قرار دی گئیں جو کسی زمانے میں شرک وبت پرستی کا ذریعہ بنی تھیں، تصویر سازی اور اس کے استعمال کو اس وجہ سے حرام کیا گیا سجدۂ تعظیمی اس وجہ سے حرام ہوا ایسے اوقات میں نماز پڑھنے کو حرام کردیا گیا جن میں مشرکین وکفار اپنے معبودوں کی عبادت کیا کرتے تھے کہ یہ ظاہری مطابقت کسی وقت

شرک کا ذریعہ نہ بن جائے، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آقاؤں کو یہ حکم دیا کہ اپنے غلام کو عبد یعنی اپنا بندہ کہہ کر نہ پکاریں اور غلاموں کو یہ حکم دیا کہ وہ آقاؤں کو اپنا رب نہ کہیں حالانکہ لفظ معنی کے اعتبار سے بندے کے معنی غلام کے اور رب کے معنیٰ پالنے والے اور تربیت کرنے والے کے ہیں ایسے الفاظ کا استعمال ممنوع نہ ہونا چاہئے تھا مگر اس لئے کہ یہ الفاظ موہم شرک ہیں، کسی وقت جہالت سے یہی الفاظ آقاؤں کی پرستش کا دروازہ نہ کھول دیں اس لئے ان الفاظ کے استعمال کو روک دیا گیا خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ اور یوسف علیہ السلامؑ کو ان کے والدین اور بھائیوں کا سجدہ جو قرآن میں مذکور ہے یہ سجدۂ تعظیمی تھا جو ان کی شریعت میں سلام، مصافحہ اور دست بوسی کا درجہ رکھتا تھا اور جائز تھا، شریعت محمدیہ کو کفر وشرک کے شائبہ سے بھی پاک رکھنا تھا اسلئے اس شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بقصد تعظیم بھی سجدہ یا رکوع کرنا جائز نہیں رکھا گیا۔

(معارف القرآن ج ۲، ص ۱۸۸، پ ۱، سورہ بقرہ)

سجدۂ عبادت تو ہر پیغمبر کی شریعت میں غیر اللہ کے لئے حرام تھا لیکن سجدۂ تعظیم انبیاء سابقین کی شریعتوں میں جائز تھا، جو شریعت اسلام میں ذریعۂ شرک ہونے کی بناء پر ممنوع ہوگیا ہے، جیسا کہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے کسی غیر اللہ کیلئے سجدہ حلال نہیں۔

(معارف القرآن ج ۵، ص ۱۳۳، سورہ یوسف، پ ۱۳)

سِجّین اور عِلّیین کی تعریف

سِجّین بکسر سین وتشدید جیم بروزن سِکّین سجن سے مشتق ہے جس کے معنیٰ تنگ جگہ میں قید کرنے کے ہے، قاموس میں ہے کہ سجین کے معنیٰ دائمی قید کے ہیں اور احادیث وآثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجین ایک مقام خاص کا نام ہے، اور کفار فجار کی ارواح کا مقام یہی ہے اور اسی مقام میں ان کے اعمال نامے رہتے ہیں، جس کا

مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے اعمال نامے اس جگہ میں محفوظ کردیئے جاتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ کوئی ایسی کتاب جامع ہو جس میں تمام دنیا کے کفار فجار کے اعمال لکھ دیئے جاتے ہوں۔

یہ مقام کس جگہ ہے اس کے متعلق حضرت براء ابن عازبؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سجین ساتویں زمین کے نچلے طبقے میں ہے اور علیین ساتویں آسمان میں زیرِ عرش ہے۔

(اخرجہ البغوی بسندہ واخرجہ احمد وغیرہ از مظہری)

بعض روایات حدیث میں یہ بھی ہے کہ سجین کفار و فجار کی ارواح کا مستقر ہے اور علیین مؤمنین متقین کی ارواح کی جگہ ہے۔

سجین اور علیین کی تفسیر میں جو روایات اوپر مذکور ہوئیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواحِ کفار سجّین میں رہتی ہیں جو ساتویں زمین میں ہے، اور ارواح مؤمنین علیین میں رہتی ہیں جو ساتویں آسمان پر زیر عرش ہے۔

(معارف القرآن ۶۹۵، ج ۸، سورہ التطفیف)

سُحت اور حرام کی تعریف

لفظ ''سُحت'' کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسے بمعنی حرام مشہور ہے، دوسرے معنی اس کے مکروہ و ناپسندیدہ کے بھی آتے ہیں، جیسا ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **کسب الحجام سحت**، یعنی پچھنے لگانے والے کی کمائی سحت ہے، یہاں جمہور فقہاء نے اس کے معنی ناپسندیدہ اور مکروہ کے لیے ہیں، اور امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اور ابن اثیر نے نہایہ میں لفظ سحت کے یہ مختلف معانی محاورات عرب اور احادیث نبویہ سے ثابت کئے ہیں۔

(معارف القرآن ۲۱/۶ ۷، سورہ روم پ ۲۱)

سحت اور رشوت کی تعریف

سُحت کے لفظی معنی کسی چیز کو جڑ بنیاد سے کھود کر برباد کرنے کے ہیں، اسی معنی میں قرآن کریم نے فرمایا ہے فَیُسْحِتَکُمْ بِعَذَابٍ یعنی اگر تم اپنی حرکت سے باز نہ آؤ گے تو اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے تمہارا استیصال کردے گا، یعنی تمہاری جڑ بنیاد ختم کردی جائے گی، قرآن مجید میں اس جگہ لفظ سحت سے مراد رشوت ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ابراہیم نخعی، حسن بصریؒ، مجاہدؒ، قتادہؒ، ضحاکؒ وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس کی تفسیر رشوت سے کی ہے۔

رشوت کو سحت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف لینے دینے والوں کو برباد کرتی ہے بلکہ پورے ملک وملت کی جڑ بنیاد اور امن عامہ کو تباہ کرنے والی ہے، جس ملک یا جس محکمہ میں رشوت چل جائے وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور قانون ملک ہی وہ چیز ہے جس سے ملک وملت کا امن برقرار رکھا جاتا ہے اور وہ معطل ہوگیا تو نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے نہ آبرو نہ مال، اس لیے شریعت اسلام میں اس کو سحت فرما کر اشد حرام قرار دیا ہے، اور اس کے دروازہ کو بند کرنے کے لیے امراء و حکام کو جو ہدیئے اور تحفے پیش کئے جاتے ہیں ان کو بھی صحیح حدیث میں رشوت قرار دے کر حرام کردیا گیا ہے۔(جصاص)

اور ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رشوت لینے والے اور دینے والے پر لعنت کرتے ہیں اور اس شخص پر بھی جو ان دونوں کے درمیان دلال اور واسطہ بنے۔ (جصاص، معارف القرآن ۵۱۵، ج ۳، سورہ مائدہ، پ ۶)

سحر کی تعریف

سِحر بالکسر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو۔(قاموس)،

خواہ وہ سبب معنوی ہو، جیسے خاص خاص کلمات کا اثر، یا غیر محسوس چیزوں کا ہو، جیسے جنات وشیاطین کا اثر، مسمریزم میں قوت خیالیہ کا اثر، یا محسوسات کا ہو مگر وہ محسوسات مخفی ہوں، جیسے مقناطیس کی کشش لوہے کے لئے، جب کہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو، یا دواؤں کا اثر جب کہ دوائیں مخفی ہوں، یا نجوم وسیارات کا اثر۔

اسی لئے جادو کی اقسام بہت ہیں، مگر عرف میں عموماً جادو ان چیزوں کو کہا جاتا ہے، جن میں جنات وشیاطین کے عمل کا دخل ہو، یا قوت خیالیہ مسمریزم کا، یا کچھ الفاظ وکلمات کا، کیونکہ یہ بات عقلاً بھی ثابت ہے اور تجربہ سے بھی، اور قدیم وجدید فلاسفہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حروف وکلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثیرات ہوتی ہیں، کسی خاص حرف یا کلمہ کو کسی خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تاثیرات کا مشاہدہ ہوتا ہے، یا ایسی تاثیرات کو کسی انسانی بالوں یا ناخنوں وغیرہ اعضاء، یا اس کے استعمالی کپڑوں کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں شامل کرکے پیدا کی جاتی ہیں، جن کو عرفِ عام میں ٹونہ ٹوٹکا کہا جاتا ہے، اور جادو میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

اور اصطلاح قرآن وسنت میں سحر ہر ایسے امر عجیب کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کرکے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو،، پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفر وشرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدح کی گئی ہو، یا کواکب ونجوم کی عبادت اختیار کی گئی ہو، جس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔

کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کرکے اس کا خون استعمال کرنا، یا جنابت ونجاست کی حالت میں رہنا، طہارت سے اجتناب کرنا، وغیرہ۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد، ان اقوال وافعال سے حاصل

کی جاتی ہے، جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں، مثلاً تقویٰ، طہارت، اور پاکیزگی، بدبو اور نجاست سے اجتناب، ذکر اللہ اور اعمال خیر۔

اسی طرح شیاطین کی امداد ایسے اقوال وافعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیطان کو پسند ہیں، اسی لئے سحر صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہیں، پاکی اور اللہ کے نام سے دور رہیں، خبیث کاموں کے عادی ہوں، عورتیں بھی ایام حیض میں یہ کام کرتی ہیں تو مؤثر ہوتا ہے، باقی شعبدے اور ٹوٹکے، یا ہاتھ کی چالاکی کے کام مسمریزم وغیرہ کو مجازاً سحر کہہ دیا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

سحر کے اقسام

امام راغب اصفہانیؒ مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ سحر کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو محض نظر بندی اور تخییل ہوتی ہے، جس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں، جیسے بعض شعبدہ باز اپنے ہاتھ کی چالاکی سے ایسے کام کر لیتے ہیں کہ عام لوگوں کی نظر یں تو اس کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں، یا قوت خیالیہ مسمریزم وغیرہ کے ذریعہ کسی کے دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے کہ وہ ایک چیز کو آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، مگر اس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں ہوتی، کبھی یہ کام شیاطین کے اثر سے بھی ہوسکتا ہے، کہ مسحور کی آنکھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے جس سے وہ ایک غیر واقعی چیز کو حقیقت سمجھنے لگے، قرآن مجید میں فرعونی ساحروں کے جس سحر کا ذکر ہے،، وہ پہلی قسم کا تھا، جیسا کہ ارشاد ہے: سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ. (۷:۱۱۶)

ترجمہ: انھوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا۔ اور ارشاد ہے:

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعىٰ. (۲۰:۶۶)

ترجمہ: ان کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ آنے لگا کہ یہ

رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں۔

اس میں ''یُخَیَّلُ'' کے لفظ سے یہ بتلا دیا گیا کہ کہ رسیاں اور لاٹھیاں جو ساحروں نے ڈالی تھیں، نہ درحقیقت سانپ بنی، اور نہ انھوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت متخیلہ متاثر ہو کر ان کو دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی۔

دوسری قسم اس طرح کی تخییل اور نظر بندی ہے، جو بعض اوقات شیاطین کے اثر سے ہوتی ہے، جو قرآن کریم کے اس ارشاد سے معلوم ہوئی:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِيْنُ ، تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيْمٍ.

(۲۶:۲۲۱،۲۲۲)

ترجمہ: میں تمھیں بتلاتا ہوں کہ کن لوگوں پر شیطان اترتے ہیں، ہر بہتان باندھنے والے گنہگار پر اترتے ہیں، نیز دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ.(۲:۱۰۲)

ترجمہ: یعنی شیاطین نے کفر اختیار کیا، لوگوں کو جادو سکھانے لگے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ سحر کے ذریعہ ایک شئی کی حقیقت ہی بدل جائے، جیسے کسی انسان یا جاندار کو پتھر یا کوئی جانور بنا دیں۔

امام راغب اصفہانی، ابوبکر جصاصؒ وغیرہ حضرات نے اس سے انکار کیا ہے کہ سحر کے ذریعہ کسی چیز کی حقیقت بدل جائے، بلکہ سحر کا اثر صرف تخییل اور نظر بندی ہی تک ہوسکتا ہے، معتزلہ کا بھی یہی قول ہے، مگر جمہور علماء کی تحقیق یہ ہے کہ انقلاب اعیان میں نہ کوئی عقلی امتناع ہے، نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم پتھر بن جائے، یا ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف منقلب ہو جائے۔

اور فلاسفہ کا جو یہ قول مشہور ہے کہ انقلاب حقائق ممکن نہیں، ان کی مراد حقائق سے محال، ممکن، واجب کی حقیقتیں ہیں کہ ان میں انقلاب عقلاً ممکن نہیں کہ کوئی محال

ممکن بن جائے، یا کوئی ممکن محال بن جائے۔

اور قرآن عزیز میں فرعونی ساحروں کے سحر کو جو تخییل قرار دیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سحر تخییل ہی ہو، اس سے زائد کچھ نہ ہو، اور بعض حضرات نے سحر کے ذریعہ انقلاب حقیقت کے جواز پر حضرت کعب احبارؒ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے، جو مؤطا امام مالک میں بروایت قعقاع بن حکیم منقول ہے:

لَو لا کَلِماتٌ أَقُولُهُنَّ لَجَعَلَتنِیَ الیَهُودُ حِمَاراً.

ترجمہ: اگر یہ چند کلمات نہ ہوتے تو جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی مجھے گدھا بنا دیتے۔

گدھا بنا دینے کا لفظ مجازی طور پر بے وقوف بنانے کے معنیٰ میں ہوسکتا ہے، مگر بلا ضرورت حقیقت کو چھوڑ کر مجاز مراد لینا صحیح نہیں، اس لئے حقیقی اور ظاہری مفہوم اس کا یہی ہے کہ اگر میں یہ کلمات روزانہ پابندی سے نہ پڑھتا تو یہودی جادوگر مجھے گدھا بنا دیتے۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں، اول یہ کہ سحر کے ذریعہ انسان کو گدھا بنا دینے کا امکان ہے، دوسرے یہ کہ جو کلمات وہ پڑھا کرتے تھے ان کی تاثیر یہ ہے کہ جادو اثر نہیں کرتا، حضرت کعب احبارؒ سے جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کلمات کیا تھے؟ تو آپ نے یہ کلمات بتائے:

اَعُوذُبِوَجهِ اللّٰهِ العَظِیمِ الَّذِی لَیسَ شَیْءٌ أعظَمَ مِنهُ، وَبِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِی لَایُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَافَاجِرٌ، وَبِأسمَاءِ اللّٰهِ الحُسنیٰ کُلِّهَا، مَاعَلِمتُ مِنهَا وَمَالَم أعلَم، مِن شَرِّ مَا خَلَقَ وَبَرَأَوَذَرأَ.

(اخرجہ فی الموطا، باب التعوذ عند النوم)

ترجمہ: میں اللہ عظیم کی پناہ پکڑتا ہوں جس سے بڑا کوئی نہیں، اور پناہ پکڑتا

ہوں اللہ کے کلمات تامات کی، جن سے کوئی نیک و بد انسان آگے نہیں نکل سکتا، اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے تمام اسمائے حسنیٰ کی جن کو میں جانتا ہوں اور جن کو میں نہیں جانتا ہوں، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، اور وجود دیا اور پھیلایا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سحر کی یہ تینوں قسمیں ممکن الوقوع ہیں۔

(معارف القرآن ج۱/ص۲۷۵، بقرہ: پ۱)

سحر اور معجزہ کا فرق

جس طرح انبیاء علیہم السلام کے معجزات یا اولیاء کے کرامات سے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں جو عادتاً نہیں ہو سکتے، اس لئے ان کو خرق عادت کہا جاتا ہے، بظاہر سحر اور جادو سے بھی ایسے ہی آثار مشاہدے میں آتے ہیں، اس لئے بعض جاہلوں کو ان دونوں میں التباس ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ جادوگروں کی تعظیم و تکریم کرنے لگتے ہیں، اس لئے دونوں کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔

سو یہ فرق ایک تو اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے، اور ایک ظاہری آثار کے اعتبار سے، حقیقت کا فرق تو یہ ہے کہ سحر اور جادو سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں دائرۂ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں، فرق صرف اسباب کے ثبوت وخفا کا ہے، جہاں اسباب ظاہر ہوتے ہیں، وہ آثار ان اسباب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، اور کوئی تعجب کی چیز نہیں سمجھی جاتی، لیکن جہاں اسباب مخفی ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے، اور عوام اسباب کے نہ جاننے کی وجہ سے اس کو خرق عادت سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ درحقیقت تمام عادی امور کی طرح کسی جن، شیطان کے اثر سے ہوتی ہے، ایک خط مشرق بعید سے آج کا لکھا ہوا اچانک سامنے آکر گر گیا، تو دیکھنے والا اس کو خرق عادت کہیں گے، حالانکہ جنات وشیاطین کو ایسے اعمال وافعال کی قوت دی گئی

ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہوتو پھر خرق عادت نہیں رہتا، خلاصہ یہ ہے کہ سحر سے ظاہر ہونے والے تمام آثار اسباب طبعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مغالطہ خرق عادت کا ہوجاتا ہے۔

بخلاف معجزہ کے کہ وہ بلاواسطہ فعل حق تعالیٰ کا ہوتا ہے، اس میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ کو حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہوجائے، مگر ٹھنڈک بھی اتنی نہ ہو جس سے تکلیف پہونچے، بلکہ جس سے سلامتی حاصل ہو، اس حکم الٰہی سے آگ ٹھنڈی ہوگئی۔

آج بھی بعض لوگ بدن پر کچھ دوائیں استعمال کرکے آگ کے اندر چلے جاتے ہیں وہ معجزہ نہیں، بلکہ دواؤں کا اثر ہے، دوائیں مخفی ہونے سے لوگوں کو دھوکہ خرق عادت کا ہوجاتا ہے، یہ بات کہ معجزہ براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآن عزیز کی تصریح سے ثابت ہے:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى. (۷:۱۷)

ترجمہ: کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی، درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی۔

مراد یہ ہے کہ ایک مٹھی خاک اور کنکر کی سارے مجمع کی آنکھوں تک پہونچ جانا، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کا کوئی دخل نہیں یہ خالص حق تعالیٰ کا فعل ہے، یہ معجزہ غزوۂ بدر میں پیش آیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی خاک اور سنگریزوں کی کفار کے لشکر پر پھینکی، (جو سب کی آنکھوں میں پڑگئی)۔

معجزہ اور سحر کی حقیقتوں کا یہ فرق کہ معجزہ بلاواسطہ اسباب طبعیہ کے براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، اور جادو اسباب طبعیہ مخفیہ کا اثر ہوتا ہے، حقیقت سمجھنے کے لئے تو کافی وافی ہے، مگر یہاں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ عوام الناس فرق کو کیسے پہچانیں؟ کیونکہ ظاہری صورت دونوں کی ایک سی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے

کہ عوام کے پہچاننے کے لئے بھی حق تعالیٰ نے کئی فرق ظاہر کردیئے ہیں۔

اول یہ کہ معجزہ یا کرامت ایسے اثرات سے ظاہر ہوتی ہے جن کے تقویٰ، طہارت وپاکیزگی، اخلاق اعمال کا سب مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے برعکس جادو کا اثر صرف ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو گندے ناپاک، اللہ کے نام سے اوراس کی عبادت سے دور رہتے ہیں، یہ چیز ہر انسان آنکھوں سے دیکھ کر معجزہ اور سحر میں فرق پہچان سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ عادۃ اللہ یہ بھی جاری ہے کہ جو شخص معجزہ اور نبوت کا دعویٰ کر کے کوئی جادو کرنا چاہے اس کا جادو نہیں چلتا، ہاں نبوت کے دعوے کے بغیر کرے تو چل جاتا ہے۔ (معارف القرآن ج ۱/ ۲۷۸، بقرہ: پ ۱)

سراج و منیر کی تعریف

سراج کے معنی چراغ اور منیر کے معنی روشن کرنے والا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچویں صفت اس میں یہ بیان کی گئی کہ آپ روشن کرنے والے چراغ ہیں اور بعض حضرات نے سراج منیر سے مراد قرآن لیا ہے، مگر نسق کلام سے قریب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے۔

بیہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ آپ کی صفت داعی الی اللہ تو ظاہر اور زبان کے اعتبار سے ہے اور سراج منیر آپ کی صفت آپ کے قلب مبارک کے اعتبار سے ہے کہ جس طرح سارا عالم آفتاب سے روشنی حاصل کرتا ہے اسی طرح تمام مومنین کے قلوب آپ کے نور قلب سے منور ہوتے ہیں، اسی لیے صحابہ کرام جنھوں نے اس عالم میں آپ کی صحبت پائی وہ ساری امت سے افضل واعلیٰ قرار پائے کیونکہ ان کے قلوب نے قلب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ عیاناً فیض اور نور حاصل کیا، باقی امت کو یہ نور صحابہ کرام کے واسطے سے واسطہ در واسطہ ہو کر پہنچا۔ (معارف القرآن ۷/ ۱۷۷، سورہ احزاب پ: ۲۲)

سراج، ضیاء، نور کی تعریف

هُوَالَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْراً (سورہ یونس پ۱۱)

سورۂ نوح میں ہے ''وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْراً وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا، سورۂ فرقان میں فرمایا، وَجَعَلَ فِیْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا۔

سراج کے معنی چراغ کے ہیں اور چونکہ چراغ ذاتی ہوتا ہے کسی دوسری چیز سے حاصل کردہ نہیں ہوتا اس لیے بعض حضرات نے کہا ہے کہ ضیاء کسی چیز کی ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نور اس کو جو دوسرے سے مستفاد (یعنی) حاصل کردہ ہو، مگر یہ بظاہر یونانی فلسفہ سے متاثر ہوکر کہا گیا ہے، ورنہ لغت میں اس کی کوئی حقیقت نہیں، اور قرآن کریم نے بھی اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا، زجاج نے لفظ ضیاء کو ضوء کی جمع قرار دیا ہے، اس کی رو سے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ روشنی کے سات مشہور رنگ اور قسمیں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں آفتاب ان تمام اقسام کا جامع ہے جو بارش کے بعد قوس وقزح میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (معارف القرآن ص:۵۰۵ ج۴ سورہ یونس پ۱۱)

سرقہ (چوری اور ڈاکہ) کی تعریف

قاموس میں ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا مال کسی محفوظ جگہ سے بغیر اس کی اجازت کے چھپ کر لے لے، اس کو سرقہ کہتے ہیں، یہی اس کی شرعی تعریف ہے، اور اس تعریف کی رُو سے سرقہ ثابت ہونے کے لیے چند چیزیں ضروری ہوئیں۔

اول یہ کہ وہ مال کسی فرد یا جماعت کی ذاتی ملکیت ہو، چرانے والے کی اس میں نہ ملکیت ہو نہ ملکیت کا شبہ ہو اور نہ ایسی چیزیں ہوں جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں جیسے رفاہ عام کے ادارے اور ان کی اشیاء، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی چیز لے لی، جس میں اس کی ملکیت یا ملکیت کا شبہ ہے، یا جس میں عوام

کے حقوق مساوی ہیں، تو حد سرقہ اس پر جاری نہ کی جائے گی، حاکم اپنی صوابدید کے موافق تعزیری سزا جاری کر سکتا ہے۔

دوسری چیز تعریف سرقہ میں مال محفوظ ہونا ہے، یعنی مقفل مکان کے ذریعہ یا کسی نگراں چوکیدار کے ذریعہ محفوظ ہونا، جو مال کسی محفوظ جگہ میں نہ ہو اس کو کوئی شخص اٹھالے تو وہ بھی حد سرقہ کا مستوجب نہیں ہوگا اور مال کے محفوظ ہونے میں شبہ بھی ہو جائے تو بھی حد ساقط ہو جائے گی، گناہ اور تعزیری سزا کا معاملہ جدا ہے۔

تیسری شرط بلا اجازت ہونا ہے، جس مال کے لینے یا اٹھا کر استعمال کرنے کی کسی کو اجازت دے رکھی ہو، وہ اس کو بالکل لے جائے تو حد سرقہ عائد نہیں ہوگی اور اجازت کا شبہ بھی پیدا ہو جائے تو حد ساقط ہو جائے گی۔

چوتھی شرط چھپا کر لینا ہے کیونکہ دوسرے کا مال علانیہ لوٹا جائے تو وہ سرقہ نہیں بلکہ ڈاکہ ہے، جس کی سزا پہلے بیان ہو چکی ہے، غرض خفیہ نہ ہو تو حد سرقہ اس پر جاری نہ ہوگی۔

ان تمام شرائط کی تفصیل سننے سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہمارے عرف میں جس کو چوری کہا جاتا ہے وہ ایک عام اور وسیع مفہوم ہے، اس کے تمام افراد پر حد سرقہ یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا شرعاً عائد نہیں ہے، بلکہ چوری کی صرف اس صورت پر یہ حد شرعی جاری ہوگی جس میں یہ تمام شرائط موجود ہوں۔ (معارف القرآن ۱۳۰/۳، سورہ یوسف پ ۶)

سریہ اور غزوہ کی تعریف

ہجرت کے بعد جہاد و غزوات کا جو سلسلہ شروع ہوا جن میں سے بعض میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے اور بعض میں خاص صحابہ کی سرکردگی میں لشکر روانہ ہوئے، مورخین کی اصطلاح میں پہلی قسم کے جہاد کو غزوہ اور دوسری قسم کو سریہ کہتے ہیں، غزوات کی مجموعی تعداد تئیس ۲۳ ہے جن میں سے نو میں جنگ کی نوبت آئی باقی میں نہیں، اور سرایا تینتالیس ۴۳ ہیں۔ (سیرت خاتم الانبیاء، ص ۸۰)

سفر کی لغوی و شرعی تعریف

لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رخصتِ سفر کے لئے کافی نہیں، بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے کیونکہ لفظ **علی سفر** کا مفہوم یہ ہے کہ وہ سفر پر سوار ہو جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس پانچ میل چلے جانا مراد نہیں، مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ کے تعامل سے امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین منزل یعنی وہ مسافت جس کو زیادہ سفر کرنے والا بآسانی تین روز میں طئے کر سکے، قرار دی ہے اور بعد کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے ۴۸ میل لکھے ہیں (جو آج کل ۷۸ کلومیٹر ہوتا ہے)۔

(معارف القرآن سورہ بقرہ، پ۲، ص۴۴۳ ج۱)

سفیر اور قاصد کی تعریف

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ (سورہ عبس، پ۳۰)

سَفَرہ بفتحتین سافر کی جمع بھی ہو سکتی ہے جس کے معنیٰ کاتب کے ہیں، اس صورت میں اس سے مراد فرشتے، کرام کاتبین یا انبیا علیھم السلام اور ان کی وحی کو لکھنے والے حضرات ہوں گے، حضرت ابن عباس اور مجاہد سے یہی تفسیر منقول ہے۔

اور لفظ ''سفرہ'' سفیر بمعنیٰ ''قاصد'' کی جمع بھی ہو سکتی ہے، اس صورت میں اس سے مراد رسل، ملائکہ اور انبیاء علیھم السلام اور وحی کی کتابت کرنے والے حضراتِ صحابہ ہوں گے، اور علمائے امت بھی اس میں داخل ہے کیونکہ وہ بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان سفیر اور قاصد ہیں۔ (مظہری)

(معارف القرآن سورہ عبس، پ۳۰، ص۶۷۵ ج۸)

سکرۃ الموت کی تعریف

سکرۃ الموت کی معنیٰ موت کی شدّت اور غشی جو موت کے وقت پیش آتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حالت پیش آئی تو آپ پانی میں ہاتھ ڈال کر چہرۂ مبارک پر ملتے اور فرماتے تھے لاالہ الااللہ اِنّ للموت سکرات یعنی کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے فرمایا کہ موت کی بڑی شدتیں ہوتی ہیں۔ (معارف القرآن ۱۴۳، ج ۸، سورہ قٓ)

سلام کی تعریف

لفظ سلام مصدر بمعنیٰ السلامت ہے، جیسے ملام بمعنیٰ ملامت مستعمل ہوتا ہے، اور مراد اس سے نقائص و عیوب اور آفتوں سے سالم رہنا ہے اور السلام علیک کے معنیٰ یہ ہے کہ نقائص اور آفات سے سلامتی آپ کے ساتھ رہے، اور عربی زبان کے قاعدے سے یہاں حرف علیٰ کا موقع نہیں مگر چونکہ لفظ سلام معنیٰ ثناء کو متضمن ہے اس لئے حرف علیٰ کے ساتھ علیک یا علیکم کہا جاتا ہے۔

اور بعض حضرات نے یہاں لفظ سلام سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات لی ہے کیونکہ سلام اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے تو مراد السّلام علیک کی یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت و رعایت پر متولّی اور کفیل ہے۔ (معارف القرآن ۲۲۲، ج ۷، سورہ احزاب، پ ۲۲)

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ سلام اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، اور ''السّلام علیکم'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ ''اللہ رقیبٌ علیکم'' یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے۔ (معارف القرآن سورہ نساء پ ۲، ص ۵۰۱ ج ۲)

سلامِ مقاطعہ کی تعریف

سَلَامٌ عَلَيْکَ، یہاں لفظ سلام دو معنیٰ کے لئے ہوسکتا ہے اول یہ کہ یہ سلام مقاطعہ ہو یعنی کسی سے قطع تعلق کرنے کا شریفانہ اور مہذب طریقہ یہ ہے کہ بات کا

جواب دینے کے بجائے لفظ سلام کہہ کر علاحدہ ہوجائے جیسا کہ قرآن کریم نے اپنے مقبول وصالح بندوں کی صفت میں بیان فرمایا ہے کہ **وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا** یعنی جب جاہل لوگ اُن سے جاہلانہ خطاب کرتے ہیں تو یہ اُن سے دوبدو ہونے کے بجائے لفظ سلام کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ باوجود مخالفت کے میں تمہیں کوئی گزند اور تکلیف نہ پہنچاؤں گا۔

اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہاں سلام عرفی سلام ہی کے معنیٰ میں ہو۔

(معارف القرآن ص ۳۵، ج ۶، سوہ مریم، پ ۱۶)

سلطان کی تعریف

هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ (سورہ الحاقّہ، پ ۲۹)

سلطان کے لفظی معنیٰ غلبہ وتسلّط کے ہیں، اسی لئے حکومت کو سلطنت اور حاکم کو سلطان کہا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو مجھے دوسرے لوگوں پر بڑائی اور غلبہ حاصل تھا، میں سب میں بڑا مانا جاتا تھا، آج (یعنی قیامت کے دن) وہ بڑائی اور غلبہ کچھ کام نہ آیا۔

اور سلطان بمعنیٰ حجت بھی لیا جاسکتا ہے تو معنیٰ یہ ہونگے کہ افسوس آج میرے ہاتھ میں کوئی حجت وسند نہیں جس کے ذریعہ عذاب سے نجات حاصل ہوسکے۔

(معارف القرآن ۵۴۶، ج ۸، سورہ الحاقّہ)

سِلم کی تعریف

اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً، (سورہ بقرہ پ ۲) سِلم بالکسر والفتح دو معنیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک صلح دوسرے اسلام، اس جگہ جمہور صحابہ وتابعین رحمہم اللہ کے نزدیک اسلام مراد ہے۔ (معارف القرآن سورہ بقرہ پ ۲، ص ۴۹۹ ج ۱)

سماء اور آسمان کی تعریف

قرآن کریم اور لغت کی تصریحات کے مطابق لفظ سماء فضائے آسمانی کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور خود جرم آسمان کے لئے بھی، تو ایسی صورت میں جن آیات میں کواکب اور سیّارات کیلئے فی السّماء کا لفظ استعمال ہوا ہے ان کے مفہوم میں دونوں احتمال موجود ہیں کہ یہ کواکب اور ستارے جرم آسمان کے اندر ہوں یا فضائے آسمانی میں آسمانوں کے نیچے ہوں، اور دو احتمالوں کے ہوتے ہوئے کوئی قطعی فیصلہ قرآن کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن نے ستاروں اور سیّاروں کو آسمان کے اندر قرار دیا ہے یا ان سے باہر فضائے آسمانی میں بلکہ الفاظِ قرآن کے اعتبار سے دونوں صورتیں ممکن ہیں، کائنات کی تحقیقات اور تجربے اور مشاہدے سے جو صورت بھی ثابت ہوجائے قرآن کی کوئی تصریح اس کے منافی نہیں ہے۔ (معارف القرآن ص ۴۷۷، ج ۶، سوہ فرقان، پ ۱۹)

سنّت مؤکّدہ کی تعریف

سنّت موکّدہ کے لیے جو عام ضابطہ فقہاء کا ہے کہ جس کام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً مداومت فرمائی ہو اور بلا مجبوری نہ چھوڑا ہو وہ سنت مؤکدہ ہے، بجز اس کے کہ کسی دلیل شرعی سے یہ ثابت ہوجائے کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھا عام امت کے لیے نہیں تھا۔

اس ضابطہ کا تقاضا بظاہر یہی ہے کہ نماز تہجد بھی سب کے لیے سنت مؤکدہ قرار پائے نہ کہ صرف نفل، کیونکہ اس نماز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مداومت سنت متواترہ سے ثابت ہے، اور خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں، اس لیے عام امت کے لیے بھی سنت مؤکدہ ہونا چاہئے۔ تفسیر مظہری میں اسی کو مختار اور راجح قرار دیا ہے۔

(معارف القرآن، بنی اسرائیل ۵/۵۰۵)

شاہد کی تعریف

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا (سورہ یوسف، پ۱۲)

''شاہد'' کا لفظ جب عام فقہی معاملات اور مقدمات میں بولا جاتا ہے تو اس سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو زیر نزع معاملہ کے متعلق اپنا چشم دید کوئی واقعہ بیان کرے، اس آیت میں جس کو شاہد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اس میں کوئی واقعہ یا اس کے متعلق اپنا کوئی مشاہدہ بیان نہیں کیا، بلکہ فیصلہ کرنے کی ایک صورت کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کو اصطلاحی طور پر شاہد نہیں کہا جا سکتا۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ اصطلاحات سب بعد کے علماء وفقہاء نے افہام وتفہیم کے لئے اختیار کرلی ہیں، قرآن حکیم کی نہ یہ اصطلاحیں ہیں نہ وہ ان کا پابند ہے، قرآن کریم نے یہاں اس شخص کو شاہد اس معنی کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ جس طرح شاہد کے بیان سے معاملہ کا تصفیہ آسان ہوجاتا ہے، اور کسی ایک فریق کا حق پر ہونا ثابت ہوجاتا ہے اس بچہ کے بیان سے بھی یہی فائدہ حاصل ہوگیا کہ اصل تو اس کی معجزانہ گویائی ہی حضرت یوسف کی برأت کے لئے شاہد تھی، اور پھر اس نے جو علامات بتلائیں ان کا حاصل بھی انجام کار یوسف علیہ السلام کی ہی برأت کا ثبوت ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگیا کہ اس نے یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی دی، حالانکہ اس نے یوسف علیہ السلام کو سچا نہیں کہا، بلکہ دونوں احتمالوں کا ذکر کردیا تھا۔

(معارف القرآن ص۴۴، ج۵، سوہ یوسف، پ۱۲)

شجرہ رضوان کی تعریف

اِذ یُبَایِعُونَکَ تَحتَ الشَجَرۃِ (سورہ فتح، پ۲۶)

شجرہ جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے ایک ببول کا درخت تھا اور مشہور یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد کچھ لوگ وہاں چل کر جاتے اور اس درخت کے نیچے نمازیں پڑھتے تھے، حضرت فاروق اعظمؓ کو خطرہ ہوا کہ کہیں آئندہ آنے والے جہلاء اسی درخت کی پرستش نہ شروع کردیں جیسے پچھلی امتوں میں اس طرح کے واقعات ہوئے ہیں اس لیے اس درخت کو کٹوادیا مگر صحیحین میں ہے کہ حضرت طارق بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حج کیلئے گیا تو راستے میں میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جو ایک مقام پر جمع تھے اور نماز پڑھ رہے تھے میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کون سی مسجد ہے انہوں نے کہا کہ یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے رسول اللہ ﷺ نے بیعت رضوان لی تھی، میں اس کے بعد حضرت سعید بن مسیّبؒ کے پاس حاضر ہوا اور اس واقعہ کی خبر ان کو دی انہوں نے فرمایا کہ میرے والد ان لوگوں میں سے تھے جو اس بیعت رضوان میں شریک ہوئے انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ ہم جب اگلے سال مکہ مکرمہ حاضر ہوئے ہم نے اس درخت کو تلاش کیا ہمیں بھول ہوگئی اس کا پتہ نہیں لگا پھر سعید بن مسیّبؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ جو خود اس بیعت میں شریک تھے ان کو تو پتہ نہیں لگا تمہیں وہ معلوم ہوگیا عجیب بات ہے کیا تم ان سے زیادہ واقف ہو (روح المعانی) اس سے معلوم ہوا کہ بعد میں لوگوں نے محض اپنے تخمینہ و اندازہ سے کسی درخت کو متعین کرلیا اور اس کے نیچے حاضر ہونا اور نمازیں پڑھنا شروع کردیا، فاروق اعظمؓ کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ یہ وہ درخت نہیں پھر خطرہ ابتلائے شرک کا لاحق ہوگیا اس لئے اس کو قطع کرادیا ہو کیا بعید ہے۔

(معارف القرآن ص ۸۱، ج ۸، سورہ فتح پ ۲۶)

شَر کی تعریف

علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ لفظ شر دو چیزوں کے لئے عام اور شامل ہے ایک آلام و آفات جن سے براہِ راست انسان کو رنج و تکلیف پہنچتی ہے دوسرے وہ چیزیں جو آلام و آفات کے موجبات واسباب ہیں، اس دوسری قسم میں کفر وشرک اور تمام معاصی بھی لفظ شر کے مفہوم میں داخل ہیں، قرآن وحدیث میں جن چیزوں سے پناہ کا ذکر آیا ہے وہ ان دونوں قسموں میں سے کسی ایک میں داخل ہوتی ہیں کہ یا تو وہ خود آفت یا مصیبت ہوتی ہیں، یا اس کے لئے سبب موجب ہوتی ہیں، نماز کے آخر میں جو دعاء استعاذہ مسنون ہے اس میں چار چیزیں مسنون ہے، عذاب قبر، عذاب نار، فتنۃ المحیا والممات، ان میں پہلی دو چیزیں خود مصیبت وعذاب ہیں اور آخری دو چیزیں مصیبت وعذاب کے اسباب ہیں۔ (معارف القرآن ص ۸۴۸، ج ۸، سورہ علق پ ۳۰)

شرحِ صدر کی تعریف

شرح کے لفظی معنیٰ کھولنے پھیلانے اور وسیع کرنے کے ہیں، شرح صدر کے معنیٰ وسعت قلب کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ قلب میں اس کی استعداد موجود ہو کہ وہ تکوینی آیات الٰہیہ آسمان وزمین اور خود اپنی پیدائش وغیرہ میں غور کر کے عبرت وفوائد حاصل کرے، اسی طرح جو آیات الٰہیہ بصورت کتاب واحکام نازل کی جاتی ہیں ان میں غور کر کے استفادہ کر سکے، اس کے بالمقابل دل تنگی اور قساوتِ قلب ہے قرآن کریم کی ایک آیت **یَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا** اور اس جگہ اگلی آیت میں **لِلۡقَاسِیَةِ قُلُوۡبُهُمۡ** اسی شرح صدر کے بالمقابل آیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیت **اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰهُ صَدۡرَهٗ** تلاوت فرمائی تو ہم نے آپ سے شرح صدر کا مطلب

پوچھا آپ نے فرمایا کہ جب نورِ ایمان انسان کے قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس کا قلب وسیع ہوجاتا ہے (جس سے احکام الٰہیہ کا سمجھنا اور عمل کرنا اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے) ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس شرح صدر کی علامت کیا ہے تو آپ نے فرمایا:

اَلْاِنَابَةُ اِلیٰ دار الخلود و التجافی عن دار الغرور و التأهب للموت قبل نزوله . (رواہ الحاکم فی المستدرک والبیہقی فی شعب الایمان (روح المعانی)

ہمیشہ رہنے والے گھر کی طرف راغب اور مائل ہونا اور دھوکہ کے گھر یعنی دنیا کی لذائذ اور زینت سے دور رہنا اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری کرنا۔

(معارف القرآن ص ۵۵۱، ج ۷، سورہ زمر)

اَلَم نَشرَح لَکَ صَدرَکَ (پ ۳۰، سورہ الانشراح)

شرح کے لفظی معنیٰ کھولنے کے ہیں، اور سینے کو کھول دینا اس کو علوم و معارف اور اخلاق حسنہ کیلئے وسیع کردینے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے، **فَمَن یُّرِدِاللّٰهُ اَن یَّهدِیَهُ یَشرَح صَدرهُ لِلاِسلَامِ** رسول اللہ ﷺ کے سینہ مبارک کو حق تعالیٰ نے علوم و معارف اور اخلاق کریمہ کیلئے ایسا وسیع بنادیا تھا کہ آپ کے علم و حکمت کو بڑے بڑے عقلاء بھی نہ پاسکے اور اسی شرح صدر کا نتیجہ تھا کہ آپ کو مخلوق کی طرف توجہ کرنا حق تعالیٰ کی طرف توجہ میں مخل نہ ہوتا تھا اور بعض احادیث صحیحہ میں یہ آیا ہے کہ فرشتوں نے بحکم الٰہی آپ کا سینہ مبارک ظاہری طور پر بھی چاک کرکے صاف کیا بعض حضرات مفسرین نے شرح صدر سے اس جگہ وہی شقِّ صدر کا معجزہ مراد لیا ہے کما فی ابن کثیر وغیرہ واللہ اعلم

(معارف القرآن، ج ۸، ص ۷۷۰ سورہ الانشراح، پ ۳۰)

شرک کی تعریف اور اس کے اقسام

''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ''(سورہ نساء پ۵)

اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں جو عقائد ہیں اس طرح کا کوئی عقیدہ کسی مخلوق کے لیے رکھنا یہ شرک ہے اس کی کچھ تفصیلات یہ ہیں:

علم میں شریک ٹھہرانا

یعنی کسی بزرگ یا پیر کے ساتھ یہ اعتقاد رکھنا کہ ہمارے سب حال کی اس کو ہر وقت خبر ہے، نجومی، پنڈت سے غیب کی خبریں دریافت کرنا یا کسی بزرگ کے کلام میں خلل دیکھ کر اس کو یقینی سمجھنا یا کسی کو دور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہوگئی یا کسی کے نام کا روزہ رکھنا۔

اشراک فی التصرف

یعنی کسی کو نفع یا نقصان کا مختار سمجھنا، کسی سے مرادیں مانگنا، روزی اور اولاد مانگنا۔

عبادت میں شریک ٹھہرانا

کسی کو سجدہ کرنا، کسی کے نام کا جانور چھوڑنا، چڑھاوا چڑھانا کسی کے نام کی منت ماننا، کسی کی قبر یا مکان کا طواف کرنا، خدا کے حکم کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے قول یا رسم کو ترجیح دینا، کسی کے روبرو رکوع کی طرح جھکنا، کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، دنیا کے کاروبار کو ستاروں کی تاثیر سے سمجھنا اور کسی مہینہ کو منحوس سمجھنا وغیرہ۔

(معارف القرآن ۴۳۰/۲، سورۂ نساء پ۵)

شرک اکبر کی تعریف

شرک کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کو عبادت یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا ہے، قرآن کریم نے مشرکین کے اس قول کو جو وہ جہنم میں پہنچ کر کہیں گے، نقل کیا ہے:

''تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ، اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ''۔

یعنی قسم خدا کی ہم کھلی گمراہی میں تھے، جب کہ ہم نے تم کو اللہ رب العالمین کے برابر قرار دے دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ مشرکین کا بھی یہ عقیدہ تو نہ تھا کہ ہمارے گھڑے ہوئے پتھر اس جہاں کے خالق اور مالک ہیں بلکہ انہوں نے دوسری غلط فہمیوں کی بنا پر ان کو عبادت میں یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دے رکھا تھا، یہی وہ شرک تھا جس نے ان کو جہنم میں پہنچا دیا۔ (فتح الملہم)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات خالق، رازق، قادر مطلق، عالم الغیب والشہادۃ وغیرہ میں کسی مخلوق کو اللہ کے برابر سمجھنا شرک ہے۔

(معارف القرآن ۵۵۱/۲، سورۂ نساء پ۵)

مخلوق کے لیے کس علم غیب کا قائل ہونا شرک ہے؟

''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ'' (آل عمران پ۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ امور غیب پر بذریعۂ وحی اطلاع ہر شخص کو نہیں دیتے البتہ اپنے انبیاء کا انتخاب کر کے ان کو دیتے ہیں۔

اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر تو انبیاء بھی علم غیب کے شریک اور عالم الغیب ہو گئے کیونکہ وہ علم غیب جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، کسی مخلوق کو اس

میں شریک قرار دینا شرک ہے، وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک یہ کہ وہ علم ذاتی ہو، کسی دوسرے کا دیا ہوا نہ ہو، دوسرے تمام کائنات ماضی و مستقبل کا علم محیط ہو، جس سے کسی ذرّے کا علم بھی مخفی نہ ہو، حق تعالیٰ خود بذریعہ وحی اپنے انبیاء کو جو امور غیبیہ بتلاتے ہیں وہ حقیقۃً علم غیب نہیں ہے بلکہ غیب کی خبریں ہیں جو انبیاء کو دی گئی ہیں جن کو خود قرآن نے کئی جگہ انباء الغیب سے تعبیر فرمایا:

''مِنْ اَنۡبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡکَ''۔

(معارف القرآن آل عمران پ۴، ۲/ ۱۴۹)

شرک اصغر کی تعریف

سورہ کہف کی آخری آیت میں'' وَلَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا '' کا شانِ نزول جو روایات حدیث میں مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شرک سے مراد شرک خفی یعنی ریا ہے۔

امام حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی اور اس کو صحیح علی شرط الشیخین فرمایا ہے، روایت یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا تھا، اس کے ساتھ اس کی یہ خواہش بھی تھی، کہ لوگوں میں اس کی بہادری اور غازیانہ عمل پہچانا جائے، اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ جہاد میں ایسی نیت کرنے سے جہاد کا ثواب نہیں ملتا۔

خلاصہ ان تمام روایات کا یہی ہے کہ اس آیت میں جس شرک سے منع کیا گیا ہے وہ ریاکاری کا شرک خفی ہے اور یہ عمل اگرچہ اللہ ہی کے لیے ہو مگر اس کے ساتھ کوئی نفسانی غرض شہرت و وجاہت کا بھی شامل ہو تو یہ بھی ایک قسم کا شرک خفی ہے جو انسان کے عمل کو ضائع بلکہ مضرت رساں بنادیتا ہے۔

حضرت محمود بن لبید فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہارے بارے میں جس چیز پر سب سے زیادہ خوف رکھتا ہوں وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ریا۔ (رواہ احمد فی مسندہ)

اور بیہقی نے شعب الایمان میں اس حدیث کو نقل کر کے اس میں یہ زیادتی بھی نقل کی ہے کہ قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کی جزا عطا فرمائیں گے تو ریا کار لوگوں سے فرمادیں گے کہ تم اپنے عمل کی جزا لینے کے لیے ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لیے تم نے یہ عمل کیا تھا، پھر دیکھو کہ ان کے پاس تمہارے لیے کوئی جزا ہے یا نہیں۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں شرکاء میں شریک ہونے سے غنی اور بالاتر ہوں، جو شخص کوئی عمل نیک کرتا ہے پھر اس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر دیتا ہے تو میں وہ سارا عمل اسی شریک کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس عمل سے بری ہوں اس کو تو خالص اسی شخص کا کر دیتا ہوں جس کو میرے ساتھ شریک کیا تھا۔ (رواہ مسلم)

اور حکیم ترمذی نے صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ شرک کا ذکر فرمایا کہ ”ھو فیکم اخفی من دبیب النمل“ یعنی شرک تمہارے اندر ایسے مخفی انداز سے آجاتا ہے جیسے چیونٹی کی رفتار بے آواز، اور فرمایا کہ میں تمہیں ایک ایسا کام بتلاتا ہوں کہ جب تم وہ کام کرلو تو شرک اکبر اور اصغر یعنی ریا سے سب سے محفوظ ہو جاؤ، تم تین مرتبہ روزانہ یہ دعاء کیا کرو:

”اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَا اَعْلَمُ“۔

(معارف القرآن سورۂ کہف پ ۱۶، ج ۵، ص ۶۶۳)

دکھلاوے کے لیے پیسے خرچ کرنا بھی شرک ہے

وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ (سورہ نساء پ۵) سے متکبرین کی ایک دوسری صفت بتلا دی کہ یہ لوگ اللہ کے راستہ میں خود بھی خرچ نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں البتہ لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتے رہتے ہیں اور چونکہ یہ لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اس لیے اللہ کی رضا اور ثوابِ آخرت کی نیت سے خرچ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسے لوگ تو شیطان کے ساتھی ہیں لہٰذا اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو اُن کے ساتھی شیطان کا ہوگا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح حقوق واجبہ میں کوتاہی کرنا، بخل کرنا معیوب ہے اسی طرح لوگوں کو دکھانے کے لیے اور بے مقصد مصارف میں خرچ کرنا بھی بہت بُرا ہے، وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے دکھانے کو نیکی کرتے ہیں ان کا وہ عمل عنداللہ مقبول نہیں ہوتا اور حدیث میں اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔

عن ابی هریرةؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم قال الله تعالیٰ انا اغنی الشرکاء عن الشرک، من عمل عملاً اشرک فیه معی غیری ترکته وشرکهٗ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں شرک سے بالکل بے نیاز ہوں جو شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک ٹھہراتا ہے تو میں اس عمل کو شریک ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور اس عمل کرنے والے کو بھی چھوڑ دیتا ہوں۔

وعن شداد بن اوس قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من صلی یرائی فقد أشرک ومن صام یرائی فقد اشرک

ومن تصدق یرائی فقد اشرک. (احمد بحوالہ مشکوۃ)

شداد بن اوسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس نے نماز پڑھی دکھانے کے لیے تو اس نے شرک کیا، جس نے روزہ رکھا دکھانے کے لیے تو اس نے شرک کیا، اور جس نے کوئی صدقہ دیا دکھانے کے لیے تو اس نے شرک کیا۔

عن محمود بن لبید ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اخوف ما اخاف علیکم الشرک الاصغر، قالوا یا رسول اللہ وما الشرک الاصغر قال الریاء. (احمد بحوالۂ مشکوۃ)

محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے متعلق مجھے بہت زیادہ اندیشہ شرک اصغر کا ہے، صحابہ نے پوچھا شرک اصغر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ریاء۔ (معارف القرآن ۲/۱۴۷، سورۂ نساء پ۵)

شرک وظلم کی تعریف

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ۔ (انعام پ۷)

اس میں ظلم سے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تصریح کے موافق شرک مراد ہے عام گناہ مراد نہیں، لیکن لفظ بظلم کو نکرہ لاکر عربی زبان کے قواعد کے مطابق عام کردیا جو ہر قسم کے شرک کو شامل ہے۔

اور مراد آیت کی یہ ہے کہ جو آدمی اپنے ایمان میں کسی قسم کا شرک ملادے یعنی خدا تعالیٰ کو تمام صفات کمال کے ساتھ ماننے کے باوجود غیر اللہ کو بھی ان میں سے بعض صفات کا حامل سمجھے وہ اس امن وایمان سے خارج ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرک صرف یہی نہیں کہ کھلے طور پر مشرک وبت پرست ہوجائے، بلکہ وہ آدمی بھی مشرک ہے جو اگرچہ کسی بت کی پوجا پاٹ نہیں کرتا اور کلمۂ

اسلام پڑھتا ہے، مگر کسی فرشتہ یا رسول یا کسی ولی اللہ کو اللہ کی بعض صفات خاصہ کا شریک ٹھہرائے اس میں ان عوام کے لیے سخت تنبیہ ہے جو اولیاء اللہ اور ان کے مزار کو حاجت روا سمجھتے ہیں، اور عملاً ان کو ایسا سمجھتے ہیں گویا خدائی کے اختیارات ان کے حوالے کر دیئے گئے ہیں، نعوذ باللہ منہ۔ (معارف القرآن ج ۳،ص: ۳۸۷،سورہ انعام ۴۵۴)

شرک جلی وخفی کی تعریف

شرک جلی کو تو سب جانتے ہیں کہ کسی غیر اللہ کو عبادت اور اطاعت میں یا اس کی مخصوص صفات میں اللہ تعالیٰ کے برابر یا اس کا ساجھی قرار دینا ہے اور شرک خفی یہ ہے کہ اپنے کاروبار اور دینی دنیوی مقاصد میں اور نفع نقصان میں اگر چہ عقیدہ تو یہی ہو کہ کارساز اللہ تعالیٰ ہے، مگر عملاً دوسروں کو کارساز سمجھے اور ساری کوششیں دوسروں ہی سے وابستہ رکھے یا عبادات میں ریا کاری کرے کہ دوسروں کو دکھانے کے لیے نماز وغیرہ کو درست کر کے پڑھے یا صدقہ خیرات نام آوری کے خیال سے کرے یا عملاً نفع نقصان کا مالک کسی غیر اللہ کو قرار دے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

دریں نوعے از شرک پوشیدہ است کہ زیدم بہ بخشید وعمرم بخت

یعنی اس میں بھی ایک قسم کا شرک چھپا ہوا ہے کہ آدمی یوں سمجھے کہ مجھے زید نے کچھ بخش دیا اور عمر نے نقصان پہنچا دیا، بلکہ حقیقت اس کے سوا نہیں کہ بخشش یا نقصان جو کچھ ہے وہ قادر مطلق حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، زید اور عمر پردے ہیں جن کے اندر سے بخشش یا نقصان کا ظہور ہوتا ہے، ورنہ جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ اگر ساری دنیا کے جن وانس مل کر تم کو کوئی ایسا نفع پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر نہیں فرمایا تو مجال نہیں کہ پہنچا سکیں، اسی طرح اگر ساری دنیا کے جن وانس مل کر تم کو کوئی ایسا نقصان پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا تو یہ بھی کسی

سے ممکن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ شرک جلی اور خفی دونوں سے انتہائی پرہیز کرنا چاہئے، اور شرک میں جس طرح بتوں وغیرہ کی پوجا پاٹ داخل ہے، اسی طرح انبیاء واولیاء کو علم و قدرت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا بھی شرک میں داخل ہے، اگر خدانخواستہ کسی کا عقیدہ ہی ایسا ہو تو شرک جلی ہے اور عقیدہ نہ ہو مگر عمل اس طرح کا ہے تو شرک خفی کہلائے گا۔ (معارف القرآن ۳/۴۸۱، سورہ انعام پ)

شعائر اسلام کی تعریف

''شعائر'' شعیرۃ کی جمع ہے جس کے معنیٰ علامت کے ہیں، جو چیزیں کسی خاص مذہب یا جماعت کی علامتِ خاص سمجھی جاتی ہوں وہ اس کے شعائر کہلاتے ہیں، شعائرِ اسلام ان خاص احکام کا نام ہے جو عرف عام میں مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں، حج کے اکثر احکام ایسے ہی ہیں۔ (معارف القرآن سورہ حج پ۱۷، ص۲۶۳ ج۶)

شعائر اللہ کی تعریف

''شعائر'' جمع ہے شعیرۃ کی جس کے معنی علامت کے ہیں، شعائر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیا ہے۔ (معارف، بقرہ ۱/۴۰۰)

''یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ'' (مائدہ پ۶)

یعنی اے ایمان والو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، اس میں لفظ شعائر جس کا ترجمہ نشانیوں سے کیا گیا ہے، شعیرہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں علامت، اسی لیے شعائر اور شعیرہ اس محسوس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی علامت ہو، شعائر اسلام ان اعمال وافعال کو کہا جائے گا جو عرفاً مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور محسوس و مشاہد ہیں، جیسے نماز، اذان، حج، ختنہ اور سنت کے موافق ڈاڑھی وغیرہ

شعائر اللہ کی تفسیر اس آیت میں مختلف الفاظ سے منقول ہے، مگر صاف بات وہ ہے جو بحر محیط اور روح المعانی میں حضرت حسن بصری اور عطاء سے منقول ہے اور امام جصاص نے اس کو تمام اقوال کے لیے جامع فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ شعائر اللہ سے مراد تمام شرائع اور دین کے مقرر کردہ واجبات وفرائض اور ان کی حدود ہیں، اس آیت میں:

''لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ '' کے ارشاد کا یہی حاصل ہے کہ اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو اور شعائر اللہ کی بے حرمتی ایک تو یہ ہے کہ سرے سے ان احکام کو نظر انداز کر دیا جائے۔

دوسرے یہ ہے کہ ان پر عمل تو کریں، مگر ادھورا کریں، پورا نہ کریں۔

تیسرے یہ کہ مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر کے آگے بڑھنے لگیں ''لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ'' میں ان تینوں صورتوں سے منع فرمایا گیا ہے۔

یہی ہدایت قرآن کریم نے دوسرے عنوان سے اس طرح ارشاد فرمائی ہے ''وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ''یعنی جو شخص اللہ کی حرمات کی تعظیم کرے تو وہ دلوں کے تقویٰ کا اثر ہے، آیت کے دوسرے جملہ میں شعائر اللہ کی ایک خاص قسم یعنی شعائر حج کی کچھ تفصیلات بتائی گئی ہیں۔

(معارف القرآن ۸۱/۳، سورہ مائدہ پ ٦)

شعائر ان خاص احکام وعبادات کا نام ہے جو دین واسلام کی علامات سمجھی جاتی ہیں، قربانی بھی انہیں میں سے ہے ایسے احکام کی پابندی زیادہ اہم ہے۔

(معارف القرآن ص ۲٦۷، ج ٦، سورہ حج)

شعر کی تعریف

اصل لغت میں شعر ہر اس کلام کو کہا جاتا ہے جس میں محض خیالی اور غیر تحقیقی

مضامین بیان کئے گئے ہوں جس میں کوئی بحر، وزن، ردیف اور قافیہ کچھ شرط نہیں، فن منطق میں بھی ایسی ہی مضامین کو ادلۂ شعریہ اور قضایا شعریہ کہا جاتا ہے، اصطلاحی شعر وغزل میں بھی چونکہ عموماً خیالات کا ہی غلبہ ہوتا ہے اس لئے اصطلاحِ شعرا میں کلام موزوں مقفّیٰ کو شعر کہنے لگے، بعض مفسرین نے آیات قرآن: **بَلْ هُوَ شَاعِرٌ مَّجْنُوْنَ**، **شَاعِرٍ يَتَرَبَّصُ بِهٖ** وغیرہ میں شعر اصطلاحی معنیٰ میں مراد لے کر کہا کہ کفار مکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وزن دار، قافیہ دار کلام لانے والے کہتے تھے، لیکن بعض نے کہا کہ کفار کا مقصد یہ نہ تھا، اس لئے کہ وہ طرز وطریق سے واقف تھے، اور ظاہر ہے کہ قرآن اشعار کا مجموعہ نہیں اس کا قائل تو ایک عجمی بھی نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ فصیح و بلیغ عرب، بلکہ کفار آپ کو شاعر شعر کے اصلی معنیٰ یعنی خیالی مضامین کے لحاظ سے کہتے تھے، مقصد ان کا دراصل آپ کو نعوذ باللہ جھوٹا کہنا تھا کیونکہ شعر بمعنیٰ کذب بھی استعمال ہوتا ہے اور شاعر کاذب کو کہا جاتا ہے اس لئے ادلۂ کاذبہ کو ادِلۂ شعریہ کہا جاتا ہے، خلاصہ یہ کہ جیسے موزوں اور مقفّیٰ کلام کو شعر کہتے ہیں اسی طرح ظنّی اور تخمینی کلام کو بھی شعر کہتے ہیں، جو اہل منطق کی اصطلاح ہے۔ (معارف القرآن ص ۵۵۴، ج ۶، سورہ شعراء، پ ۱۹)

شعوب وقبائل کی تعریف اور دونوں کا فرق

شعوب، شعب کی جمع ہے، بہت بڑی جماعت کو شعب کہتے ہیں، جو کسی ایک اصل پر مجتمع ہوں، پھر ان میں مختلف قبائل اور خاندان ہوتے ہیں، پھر خاندانوں میں بھی بڑے خاندان اور اس کے مختلف حصوں کے عربی زبان میں الگ الگ نام ہیں، سب سے بڑا حصہ شعب اور سب سے چھوٹا حصہ عشیرہ کہلاتا ہے، اور ابوروق کا قول ہے کہ شعب اور شعوب عجمی قوموں کے لیے بولا جاتا ہے جن کے انساب محفوظ نہیں، اور ''قبائل'' عرب کے لوگوں کے لیے جن کے انساب محفوظ چلے آتے ہیں اور ''اسباط'' بنی اسرائیل کے لیے۔ (معارف القرآن ۱۲۵/۸، سورہ حجرات پ ۲۶)

شفاعت کی تعریف

شفاعت کے لفظی معنی ملنے یا ملانے کے ہیں، اسی وجہ سے لفظ شفعہ عربی زبان میں جوڑے کے معنی میں آتا ہے، اور اس کے بالمقابل لفظ وتر بمعنیٰ طاق استعمال کیا جاتا ہے، اس لیے شفاعت کے لفظی معنی یہ ہوئے کہ کسی کمزور طالب حق کے ساتھ اپنی قوت ملا کر اس کو قوی کر دیا جائے، یا بے کس اکیلے شخص کے ساتھ خود مل کر اس کو جوڑا بنا دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جائز شفاعت وسفارش کے لیے ایک تو یہ شرط ہے کہ جس کی سفارش کی جائے اس کا مطالبہ حق اور جائز ہو، دوسرے یہ کہ وہ اپنے مطالبہ کو بوجہ کمزوری خود بڑے لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا، آپ پہنچا دیں، اس سے معلوم ہوا کہ خلاف حق سفارش کرنا یا دوسروں کو اس کے قبول پر مجبور کرنا شفاعت سیئہ یعنی بری سفارش ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سفارش میں اپنے تعلق یا وجاہت سے طریقہ دباؤ اور اجبار کا استعمال کیا جائے تو وہ بھی ظلم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، اسی لیے وہ بھی شفاعت سیئہ میں داخل ہے۔ (معارف القرآن ۲/۴۹۷، سورہ نساء پ۵)

شفاعت حسنہ کی تعریف

شفاعت حسنہ وہ ہے جس کا منشاء کسی مسلمان کے حق کو پورا کرنا ہو، یا اس کو کوئی جائز نفع پہونچانا یا مضرت اور نقصان سے بچانا ہو، اور یہ سفارش کا کام بھی کسی دنیوی جوڑ توڑ کے لئے نہ ہو بلکہ محض اللہ کے لئے کمزور کی رعایت مقصود ہو، اور اس سفارش پر کوئی رشوت مالی یا جانی نہ لی جائے اور یہ سفارش کسی ناجائز کام میں بھی نہ ہو، نیز یہ سفارش کسی ایسے ثابت شدہ جرم کی معافی کے لئے نہ ہو جن کی سزا قرآن میں معین ومقرر ہے۔

تفسیر بحر محیط اور مظہری وغیرہ میں ہے کہ کسی مسلمان کی حاجت روائی کے لئے اللہ

تعالیٰ سے دعا مانگنا بھی شفاعت حسنہ میں داخل ہے، اور دعا کرنے والے کو اجر ملتا ہے۔

(معارف القرآن سورہ نساء پ ۵، ص ۵۰۰ ج ۲)

شقاوت اور بدبختی کی تعریف

لفظ شقی شقاوت سے مشتق ہے، یہ لفظ دو معنیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک شقاوت آخرت، دوسرے شقاوت دنیا، یعنی جسمانی مشقت و مصیبت، اس جگہ یہی دوسرے معنیٰ مراد ہوسکتے ہیں، کیونکہ پہلے معنیٰ میں کسی پیغمبر کے لئے تو کیا کسی نیک مسلمان کے لئے بھی یہ لفظ نہیں بولا جاسکتا، اسی لئے فرّاء نے اس شقاوت کی تفسیر یہ کی ہے: ھو أن یاکل من کدِّ یدیہ. یعنی شقاوت سے اس جگہ مراد یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے خوراک حاصل کرنا پڑے گی۔ (قرطبی)

(معارف القرآن ج ۶/ ۱۵۶، طٰہٰ: پ ۱۶)

شکر کی تعریف

قرطبی نے فرمایا کہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا اعتراف کرے کہ یہ نعمت فلاں منعم نے دی ہے اور پھر اس کو اس کی طاعت و مرضی کے مطابق استعمال کرے اور کسی کی دی ہوئی نعمت کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرنا ناشکری اور کفران نعمت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شکر جس طرح زبان سے ہوتا ہے اسی طرح عمل سے بھی شکر ہوتا ہے۔ اور عملی شکر اس نعمت کا منعم کی طاعت و مرضی کے مطابق استعمال ہے اور ابو عبدالرحمٰن اسلمی نے فرمایا کہ نماز شکر ہے روزہ شکر ہے اور ہر نیک کام شکر ہے، اور محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ شکر تقویٰ اور عمل صالح کا نام ہے۔ (ابن کثیر،

(معارف القرآن ۷/۲۷۲، پ ۲۲)

شکر و صبر کی تعریف

شکر کی حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور حرام و ناجائز کاموں میں خرچ نہ کرے، اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اپنے افعال و اعمال کو بھی اس کی مرضی کے مطابق بنائے۔

اور صبر کا خلاصہ یہ ہے کہ خلاف طبع امور پر پریشان نہ ہو، اپنے قول و عمل میں ناشکری سے بچے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دنیا میں بھی اُمیدوار رہے اور آخرت میں صبر کے اجر عظیم کا یقین رکھے۔ (معارف القرآن ص ۲۳۳، ج ۵، سورہ ابراہیم پ ۱۳)

شوریٰ کی تعریف

وامرھم شوریٰ بینھم: (سورۂ شوریٰ، پ ۲۵)

یعنی ان کے کام آپس میں مشورہ سے طے ہوئے ہیں، شوریٰ بروزن بشریٰ مصدر ہے، تقدیر عبارت ذوشوریٰ ہے، مراد یہ ہے کہ مہمات امور جن مین شریعت نے کوئی خاص حکم متعین نہیں کردیا ہے ان کو طے کرنے میں یہ باہمی مشورہ سے کام لیتے ہیں، مہمات امور کی قید خود لفظ امر سے مستفاد ہے، کیونکہ عرف میں امر ایسے ہی کاموں کے لیے بولا جاتا ہے جن کی اہمیت ہو جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت وشاورھم فی الامر کے تحت تفصیل گذر چکی۔

(معارف القرآن سورۂ شوریٰ ۷/۷۰۵)

شوط کی تعریف

بیت اللہ کے چاروں طرف سات بار چکر لگاتے ہیں، ہر چکر کو شوط کہتے ہیں صفا مروہ کے درمیان سعی کے وقت صفا سے مروہ تک جانے کو بھی ایک شوط اور مروہ سے صفا تک آنے کو دوسرا شوط کہتے ہیں، اسی طرح باقی سات تک۔ (احکام حج ص:۱۳)

شہاب ثاقب کی تعریف

قدیم یونانی فلاسفہ اس بات کے قائل تھے کہ شہاب ثاقب دراصل کوئی زمینی مادّہ ہوتا ہے جو بخارات کے ساتھ اوپر چلا جاتا ہے، اور کرۂ نار کے قریب پہنچ کر جل اٹھتا ہے، لیکن قرآن کریم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''شہاب ثاقب'' کوئی زمینی مادّہ نہیں بلکہ عالمِ بالا ہی میں پیدا ہونے والی کوئی چیز ہے، قدیم مفسرین اس موقع پر یہ کہتے آئے ہیں کہ یونانی فلاسفہ کا یہ خیال کہ ''شہاب ثاقب'' کوئی زمینی مادّہ ہے محض قیاس اور تخمینہ پر مبنی ہے، اس لئے اس سے قرآن پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا، اس کے علاوہ اگر کوئی زمینی مادّہ اوپر جا کر مشتعل ہوجاتا ہو تو قرآن کریم سے اس کی بھی کوئی منافات نہیں۔ (معارف القرآن ص۴۲، ج۷، صٰفّٰت)

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ آپ صحابہ کے ایک مجمع میں تشریف فرما تھے کہ ستارہ ٹوٹا آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم زمانۂ جاہلیت میں یعنی اسلام سے پہلے اس ستارہ ٹوٹنے کو کیا سمجھا کرتے تھے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم یہ سمجھا کرتے تھے کہ دنیا میں کوئی بڑا حادثہ پیدا ہونے والا ہے، یا کوئی بڑا آدمی مرے گا یا پیدا ہوگا، آپ نے فرمایا کہ لغو خیال ہے، اس کا کسی کے مرنے جینے سے کوئی تعلق نہیں یہ شعلے تو شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پھینکے جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شہاب ثاقب کے متعلق جو کچھ فلاسفہ نے کہا ہے وہ بھی قرآن کے منافی نہیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ یہ شعلے براہ راست بعض ستاروں سے ٹوٹ کر گرائے جاتے ہوں۔

(معارف القرآن ص ۲۸۸، ج ۵، سورہ حجر، پ۱۴)

شہید کی تعریف

"وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ" (سورہ بقرہ پ:۲)

ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے لیکن اس کی موت کو دوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے اور اسی سے جزا وسزا کا ادراک ہوتا ہے لیکن شہید کو اس حیات میں اور مردوں سے ایک گونہ امتیاز ہے، اور وہ امتیاز یہ ہے کہ اس کی یہ حیات، آثار میں اوروں سے قوی ہے..... اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء پھر اور معمولی مردے۔

البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء وصالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں۔

(معارف القرآن سورہ بقرہ پ:۲، ۱/۳۶۶)

ص - ض

صابرین کی تعریف

اِنَّمَا یُوفَّی الصَّابِرُونَ اَجرَھُم بِغَیرِ حِسَاب (سورہ زمر، پ۲۳)

حضرت امام مالکؒ نے اس آیت میں صابرین سے مراد وہ لوگ لئے ہیں جو دنیا کے مصائب اور رنج وغم پر صبر کرنے والے ہیں اور بعض حضرات نے فرمایا کہ صابرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو معاصی سے اپنے نفس کو روکیں۔

قرطبی فرماتے ہیں کہ لفظ صابر جب بغیر کسی دوسریلفظ کے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہی ہوتا ہے جو اپنے نفس کو گناہوں سے باز رکھنے کی مشقت پر صبر کرے اور مصیبت پر صبر کرنے والے کے لئے لفظ صابر بولا جاتا ہے تو **صابر علی کذا** کے الفاظ بولے جاتے ہیں یعنی فلاں مصیبت پر صبر کرنے والا۔ واللہ اعلم

(معارف القرآن ص۵۴۳، ج۷، سورہ زمر، پ۲۳)

صاحب بالجنب کی تعریف

والصاحب بالجنب: اس کے لفظی معنی ''ہم پہلو ساتھی'' کے ہیں جس میں رفیق سفر بھی داخل ہے، جو ریل میں، جہاز میں، بس میں، گاڑی میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، اور وہ شخص بھی داخل ہے جو کسی عام مجلس میں آپ کے برابر بیٹھا ہو۔

شریعت اسلام نے جس طرح نزدیک و دور کے دائمی پڑوسیوں کے حقوق واجب فرمائے، اسی طرح اس شخص کا بھی حق صحبت لازم کر دیا جو تھوڑی دیر کے لیے کسی مجلس یا سفر میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، جس میں مسلم وغیر مسلم اور رشتہ دار وغیر

رشتہ دار سب برابر ہیں، اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کی ہدایت فرمائی، جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ کے کسی قول و فعل سے اس کو ایذا نہ پہنچے، کوئی گفتگو ایسی نہ کریں جس سے اس کی دل آزاری ہو، کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے اس کو تکلیف ہو، مثلاً سگریٹ پی کر اس کا دھواں اس کے منھ کی طرف نہ چھوڑیں، پان کھا کر پیک اس کی طرف نہ ڈالیں، اس طرح نہ بیٹھیں جس سے اس کی جگہ تنگ ہو جائے۔

(معارف القرآن ۴۱۳/۲، سورۂ نساء پ ۵)

صاع کا وزن اور اس کی تعریف

علامہ شامیؒ نے جو وزن صاع کا لکھا ہے اس حساب سے وزن پورے صاع کا تقریباً ساڑھے تین سیر ہوتا ہے، اور نصف صاع پونے دو سیر وزن انگریزی یعنی ۸۰ تولے کے سیر سے ہوتا ہے، یہی مفتیٰ بہ ہے۔ اور سہارنپور میں ۸۶ روپے بھر کا سیر ہے، اور دیوبند میں ۸۸ کا ہے، اس لیے اہل دیوبند ایک سیر دس چھٹانک کے حساب سے صدقۂ فطر ادا کرتے ہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم، امداد المفتیین ۳۸۲/۲)

صبر کی حقیقت

"اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ"۔ (سورۂ بقرہ پ: ۲)

صبر کے اصلی معنی اپنے نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں، قرآن و سنت کی اصطلاح میں صبر کے تین شعبے ہیں۔

ایک اپنے نفس کو حرام و ناجائز چیزوں سے روکنا۔

دوسرے طاعت و عبادت کی پابندی پر مجبور کرنا۔

تیسرے مصائب و آفات پر صبر کرنا، یعنی جو مصیبت آ گئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا اور اس کے ثواب کا امیدوار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف و پریشانی

کے اظہار کا کوئی کلمہ بھی منھ سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔

(ذکرہ ابن کثیر عن سعید بن جبیر)

یہ تینوں شعبے صبر کے فرائض میں داخل ہیں، ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شعبے کو صبر کہا جاتا ہے دو شعبے جو صبر کی اصل اور بنیاد ہیں عام طور پر ان کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں صابرین انہی لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں، بعض روایات میں ہے کہ محشر میں ندا کی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گذرے ہیں، وہ کھڑے ہوجائیں گے اور ان کو بلا حساب جنت میں داخلہ کی اجازت دے دی جائے گی۔ ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ آیت قرآن ''اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ'' سے بھی اس طرح اشارہ ہوتا ہے۔ (معارف القرآن ۴۲۲/۱، سورۂ بقرہ پ:۲)

صبر کی تعریف

صبر کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں، اسی لیے اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی صبر بولا جاتا ہے، جس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ نیک کاموں کے کرنے پر اپنے نفس کو ثابت قدم رکھے، اور یہ بھی کہ برے کاموں میں مبتلا ہونے سے اس کو روکے، اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کا حکم دینے سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ جو احکام آیات مذکورہ میں آپ کو دیئے گئے ہیں، مثلاً استقامت، اقامت صلوۃ وغیرہ ان پر آپ مضبوطی سے قائم رہیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مخالفین کی مخالفت اور ایذاؤں پر صبر کی تلقین مقصود ہو۔

(معارف القرآن ۶۷۸/۴، سورہ ہود پ۱۲)

صبر کی تعریف

صبر کے معنی اصل لغت کے اعتبار سے خلاف طبع چیزوں پر ثابت قدم رہنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کے ہیں، کسی مصیبت پر صبر کرنے کو بھی اسی لیے صبر کہا جاتا ہے کہ اس میں رونے پیٹنے اور واویلا کرنے کے طبعی جذبہ کو دبایا جاتا ہے، ہر تجربہ کار عقل مند جانتا ہے کہ دنیا میں ہر بڑے مقصد کے لیے بہت سی خلاف طبع محنت و مشقت برداشت کرنا لازمی ہے، جس شخص کو محنت و مشقت کی عادت اور خلاف طبع چیزوں کی برداشت حاصل ہو جائے وہ اکثر مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صبر ایسی نعمت ہے کہ اس سے زیادہ وسیع تر نعمت کسی کو نہیں ملی۔ (معارف القرآن ۴/۴۲، سورہ اعراف پ:۹)

صبر کے مختلف اقسام

صبر کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن وسنت میں نفس کو خلاف طبع چیزوں پر جمائے رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے جس کی تین قسمیں ہیں:

صبر علی الطاعت

اول: صبر علی الطاعت یعنی جن کاموں کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے ان کی پابندی طبیعت پر کتنی بھی شاق ہو اس پر نفس کو جمائے رکھنا۔

صبر عن المعاصی

دوسرے: صبر عن المعاصی، یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے وہ نفس کے لیے کتنی ہی مرغوب ولذیذ ہوں نفس کو اس سے روکنا۔

صبر علی المصائب

تیسرے صبر علی المصائب، یعنی مصیبت و تکلیف پر صبر کرنا، حد سے زائد پریشان نہ ہونا، اور سب تکلیف وراحت کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر نفس کو بے قابو نہ ہونے دینا۔

مصابرت اسی لفظ سے ماخوذ ہے، اس کے معنی ہیں دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا، اور مرابطہ کے معنی گھوڑے باندھنے اور جنگ کی تیاری کے لیے جاتے ہیں، قرآن کریم میں اسی معنی کے لیے آیا ہے ''ومن رباط الخیل''۔

اصطلاح قرآن وحدیث میں یہ لفظ دو معنی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اول اسلامی سرحدوں کی حفاظت جس کے لیے جنگی گھوڑے اور جنگی سامان کے ساتھ رہنا لازمی ہے، تاکہ دشمن اسلامی سرحد کی طرف رُخ کرنے کی جرأت نہ کرے۔

دوسرے نماز جماعت کی ایسی پابندی کہ ایک نماز کے بعد ہی سے دوسری نماز کے لیے تیاری میں رہے، یہ دونوں چیزیں اسلام میں بڑی مقبول عبادت ہیں، جن کے فضائل بے شمار ہیں۔ (معارف القرآن ص:۱۷۵، سورہ آل عمران پ:۴)

صبر اختیاری وغیر اختیاری کی تعریف

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (سورہ رعد پ۱۳)

یعنی وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے صبر کرتے ہیں۔

صبر کے معنیٰ عربی زبان میں اس مفہوم سے بہت عام ہیں جو اردو زبان میں سمجھا جاتا ہے، کہ کسی مصیبت اور تکلیف پر صبر کریں، کیونکہ اس کے اصلی معنیٰ خلاف طبع چیزوں سے پریشان نہ ہونا بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے کام پر لگے رہنا ہے، اسی لئے اس کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں ایک صبر علی الطاعت یعنی اللہ تعالیٰ کے

احکام کی تعمیل پر ثابت قدم رہنا، دوسرے صبر عن المعصیت یعنی گناہوں سے بچنے پر ثابت قدم رہنا۔

صبر کے ساتھ ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ کی قید نے یہ بتلایا کہ مطلقاً صبر کوئی فضیلت کی چیز نہیں کیونکہ کبھی نہ کبھی تو بے صبرے انسان کو بھی انجام کار ایک مدت کے بعد صبر آہی جاتا ہے، جو صبر غیر اختیاری ہو اس کی کوئی خاص فضیلت نہیں، نہ ایسی غیر اختیاری کیفیت کا اللہ تعالیٰ کسی کو حکم دیتے ہیں، اسی لئے حدیث میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا الصبر عندالصدمة الاولیٰ یعنی اصلی اور معتبر صبر تو وہی ہے جو ابتداءِ صدمہ کے وقت اختیار کرلیا جائے ورنہ بعد میں تو کبھی نہ کبھی جبری طور پر انسان کو صبر آہی جاتا ہے، بلکہ قابلِ مدح وثناء وہ صبر ہے کہ اپنے اختیار سے خلافِ طبع امر کو برداشت کرے، خواہ وہ فرائض وواجبات کی ادائیگی ہو یا محرمات ومکروہات سے بچنا ہو۔

اسی لئے اگر کوئی شخص چوری کی نیت سے کسی مکان میں داخل ہوگیا مگر وہاں چوری کا موقع نہ ملا صبر کرکے واپس آگیا، تو یہ غیر اختیاری صبر کوئی مدح وثواب کی چیزیں نہیں، ثواب جب ہے کہ گناہ سے بچنا خدا کے خوف اور اس کی رضا جوئی کے سبب سے ہو۔ (معارف القرآن ۱۹۲، ج ۵، سورہ رعد پ ۱۳)

صدقہ کی تعریف

صدقات، صدقہ کی جمع ہے، صدقہ لغت میں اس مال کے جزء کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے لیے خرچ کیا جائے۔ (قاموس)

امام راغبؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ صدقہ کو صدقہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا دینے والا گویا یہ دعوی کرتا ہے کہ میں اپنے قول وفعل میں صادق ہوں، اس

کے خرچ کرنے کی کوئی غرض دنیوی نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر رہا ہوں، اسی لیے جس صدقہ میں کوئی نام و نمود یا دنیوی غرض شامل ہو جائے قرآن کریم نے اس کو کالعدم قرار دیا ہے۔

لفظ صدقہ اپنے اصلی معنی کی رُو سے عام ہے، نفلی صدقہ کو بھی کہا جاتا ہے۔ فرض زکوٰۃ کو بھی، نفل کے لیے اس کا استعمال عام ہے ہی، فرض کے لیے بھی قرآن کریم میں بہت جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے جیسے **خذ من اموالھم صدقة** اور آیت زیر بحث **انما الصدقات** وغیرہ، بلکہ قرطبی کی تحقیق تو یہ ہے کہ قرآن میں جب مطلق لفظ صدقہ بولا جاتا ہے تو اس سے صدقہ فرض ہی مراد ہوتا اور روایات حدیث میں لفظ صدقہ ہر نیک کام کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جیسے حدیث میں ہے کہ کسی مسلمان سے خوش ہو کر ملنا بھی صدقہ ہے، کسی بوجھ اٹھانے والے کا بوجھ اٹھوا دینا بھی صدقہ ہے، کنویں سے پانی کا ڈول اپنے لیے نکالا اس میں سے کسی دوسرے کو دے دینا بھی صدقہ ہے۔ اس حدیث میں لفظ صدقہ مجازی طور پر عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

(معارف القرآن ۳۹۵/۴، سورۂ توبہ پ ۱۰)

صدقہ کے لیے تملیک لازم

صدقہ کے معنی حقیقی یہی ہیں کہ کسی فقیر حاجت مند کو اس کا مالک بنا دیا جائے کسی کو کھانا کھلا دینا، رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کر دینا، حقیقی معنی کے اعتبار سے صدقہ نہیں کہلاتا، شیخ ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ حقیقت صدقہ کی یہی ہے کہ کسی فقیر کو اس مال کا مالک بنا دیا جائے، اسی طرح امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ صدقہ تملیک کا نام ہے۔

(معارف القرآن ۴۱۱/۴، توبہ، جصاص ۱۵۲/۲)

صدُقات اور مہر کی تعریف

وَاٰتُو النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً: (سورہ نساء، پ۴)

آیت میں جو لفظ صدقات آیا ہے صدقہ بفتح الصاد وضم الدال کی جمع ہے، صدقہ اور صداق عورتوں کے مہر کو کہا جاتا ہے، ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں وسمی به بانه يظهر به صدق ميل الرجل الى المرأة یعنی مہر کو صداق اور صدقہ اس لیے کہتے ہیں کہ صدق کے اس مادہ میں سچ کے معنی ہیں، اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا اپنی بیوی کی طرف سچا میلان ظاہر ہوتا ہے اس لیے اس مناسبت سے مہر کو صداق کہنے لگے۔ (معارف القرآن سورہ نساء ۲/۲۹۹)

صدّیق کی تعریف

صِدِّيقاً نَّبِيّاً، لفظ صدیق بکسر صاد قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے، اس کے معنی اور تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، بعض نے فرمایا کہ جس شخص نے عمر میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو وہ صدیق ہے، بعض نے فرمایا کہ جو شخص اعتقاد اور قول و عمل ہر چیز میں صادق ہو، یعنی جو دل میں اعتقاد ہو ٹھیک وہی زبان پر ہو، اور اس کا ہر فعل اور ہر حرکت وسکون اسی اعتقاد اور قول کے تابع ہو۔ روح المعانی اور مظہری وغیرہ میں اسی آخری معنی کو اختیار کیا ہے اور پھر صدیقیت کے درجات متفاوت ہیں، اصل صدیق تو نبی ورسول ہی ہوسکتا ہے اور ہر نبی ورسول کے لیے صدیق ہونا وصف لازم ہے مگر اس کا عکس نہیں کہ جو صدیق ہو اس کا نبی ہونا ضروری ہو، بلکہ غیر نبی بھی جو اپنے نبی ورسول کے اتباع میں صدق کا یہ مقام حاصل کرلے وہ بھی صدیق کہلائے گا۔ حضرت مریم کو خود قرآن کریم نے ''وأمه صديقة'' کا خطاب دیا ہے، حالانکہ جمہور امت کے نزدیک وہ نبی نہیں اور کوئی عورت نبی نہیں ہوسکتی۔

(معارف القرآن، سورہ مریم ۶/۳۰)

صدّیقین، شہداء اور صالحین کی تعریف

امام راغبؒ نے فرمایا کہ ان درجات میں سب سے پہلا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جن کو قوت الٰہیہ کی امداد حاصل ہے، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو قریب سے دیکھ رہا ہو۔

(انبیاء کے بعد) دوسرا درجہ صدیقین کا ہے اور وہ وہ لوگ ہیں جو معرفت میں انبیاء علیہم السلام کے قریب ہے، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو دور سے دیکھ رہا ہو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا میں کسی ایسی چیز کی عبادت نہیں کرسکتا جس کو نہ دیکھا ہو، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں نے آنکھوں سے تو نہیں دیکھا، لیکن ان کے قلوب نے حقائقِ ایمان کے ذریعہ دیکھ لیا ہے، اس دیکھنے سے حضرت علی کی مراد اسی قسم کی رؤیت ہے کہ ان کی معرفتِ علمی مثل دیکھنے کے ہے۔

تیسرا درجہ شہداء کا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو دلائل و براہین کے ذریعہ جانتے ہیں، مشاہدہ نہیں ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو آئینہ میں قریب سے دیکھ رہا ہو، جیسے حضرت حارثہ نے فرمایا کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے ربّ کریم کے عرش کو دیکھ رہا ہوں۔

اور حدیث اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ میں بھی اسی قسم کی رؤیت مراد ہوسکتی ہے۔

چوتھا درجہ صالحین کا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو تقلید و اتباع کے ذریعہ پہچانتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسی چیز کو آئینہ میں دور سے دیکھے اور حدیث میں فان لم تکن تراه فانه یراک وارد ہوا ہے اس میں بھی رؤیت کا یہی درجہ مراد ہوسکتا ہے۔

امام راغب اصفہانی کی اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ یہ درجات معرفتِ رب

کے درجات ہیں اور معرفت کے مختلف درجات کی بناء پر مختلف مدارج ہیں۔

(معارف القرآن ۱۷۴، ج ۲، سورہ نساء، پ ۵)

کیا ہر مومن صدّیق وشہید ہے

وَالَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اُولٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ

(سورہ حدید، پ ۲۷)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدّیق وشہید ہر مؤمن کو کہا جا سکتا ہے اور حضرت قتادہ اور عمرو بن میمون نے اس آیت کی بناء پر فرمایا کہ ہر وہ شخص جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے وہ صدّیق وشہید ہے۔

ابن جریر نے حضرت براء بن عازبؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومنی امتی شھداء یعنی میری امت کے سب مومن شہید ہیں، اور اس کی دلیل میں آپ نے آیت مذکورہ تلاوت فرمائی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک روز ان کے پاس کچھ حضرات صحابہ جمع تھے، انہوں نے فرمایا کلکم صدّیق و شھید یعنی تم میں سے ہر ایک صدّیق بھی ہے شہید بھی، لوگوں نے تعجب سے کہا کہ ابو ہریرہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تو حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میری بات کا یقین نہیں آتا تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو:

وَالَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اُولٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَآءُ

لیکن قرآن کریم کی ایک دوسری آیت سے بظاہر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ صدّیق وشہید ہر مومن نہیں۔ بلکہ مومنین میں سے ایک اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کو صدّیق وشہید کہا جاتا ہے، آیت یہ ہے: فَاُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ، کیونکہ اس آیت میں انبیاء کے ساتھ

عام مومنین میں تین طبقے خصوصیت سے ذکر کئے گئے ہیں، صدّیقین، شہداء اور صالحین، اور ظاہر اس سے یہ ہے کہ ان تینوں کے مفہوم اور مصداق میں فرق ہے، ورنہ تینوں کو الگ الگ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی، اسی لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ صدّیقین وشہداء تو دراصل مومنین کے مخصوص اعلیٰ طبقات کے لوگ ہیں، جو بڑی صفات عالیہ کے حامل ہیں، یہاں سب مومنین کو صدّیق وشہید فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ ہر مومن بھی ایک حیثیت سے صدّیقین وشہداء کے حکم میں ہے، اور ان کے زمرہ میں لاحق سمجھا جائے گا۔ (معارف القرآن ص ۳۱۲، ج ۸، سورہ حدید، پ ۲۷)

صلح کی تعریف اور اس کے شرائط

فَلَا جُنَاحَ عَلَيهِمَا اَن يُّصلِحَ بَينَهُمَا صُلحاً (سورہ نساء، پ ۵)

اس آیت کے شروع میں تو میاں بیوی کے باہمی اختلاف کے وقت صرف صلح کا جائز ہونا بتلایا گیا ہے اور آخر آیت میں صلح نہ ہونے کی صورت میں بھی صبر وتحمل کے ساتھ تعلق نبھانے کی تلقین فرمائی گئی ہے درمیان میں ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا ہے جس سے مصالحت کا پسندیدہ وافضل وبہتر ہونا ثابت ہوتا ہے وَالصُّلحُ خَير ٌ یعنی باہم مصالحت کرنا بہتر ہے" اور یہ جملہ ایسے عام عنوان سے بیان فرمایا جس میں زیر بحث میاں بیوی کے جھگڑے بھی داخل ہیں، اور دوسری قسم کے گھریلو اختلافات بھی، اور تمام دنیا کے معاملات کے باہمی جھگڑے اور خصومات اور مقدمات بھی، کیونکہ الفاظ قرآن عام ہیں کہ صلح بہتر ہے۔

خلاصۂ مضمون یہ کہ طرفین سے اپنے پورے پورے مطالبہ پر اڑے رہنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ طرفین اپنے کچھ مطالبات سے دستبردار ہوکر کسی درمیانی صورت پر رضامندی کے ساتھ مصالحت کرلیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے كُلُّ صُلحٍ جَائِزٌ بَينَ المُسلِمِينَ اِلَّا صُلحاً اَحَلَّ حَرَاماً اَو حَرَّمَ حَلَالاً وَالمُسلِمُونَ عَلٰى

شُرُوطِهِم اِلَّا شَرطاً حَرَّمَ حَلَالاً (تفسیر مظہری)

''یعنی مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کی مصالحت جائز ہے، بجز اس صلح کے جس میں کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام ٹھہرایا گیا ہو، اور مسلمانوں کو اپنی مانی ہوئی شرطوں پر قائم رہنا چاہیئے بجز ان شرائط کے جن کے ذریعے کسی حلال کو حرام قرار دیا گیا ہو''۔

مثلاً کسی عورت سے اس بات پر صلح کر لینا جائز نہیں کہ اس کے ساتھ اس کی بہن کو بھی نکاح میں رکھا جائے، کیونکہ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا شرعاً حرام ہے، یا اس پر صلح کریں کہ دوسری بیوی کے حقوق ادا نہ کرے گا، کیونکہ اس میں ایک حلال کو حرام ٹھہرانا ہے۔

(معارف القرآن ص ۵۶۴، ج ۲، سورہ نساء، پ ۵)

صلوٰۃ کی تعریف

اَقِیمُوا الصَّلٰوۃ: (سورہ بقرہ پ ۱)

صلوٰۃ کے لفظی معنی دعا کے ہیں، اصطلاح شرع میں وہ خاص عبادت ہے جس کو نماز کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں عموماً نماز کی جتنی مرتبہ تاکید کی گئی ہے لفظ اقامت کے ساتھ آئی ہے، مطلق نماز پڑھنے کا ذکر صرف ایک دو جگہ آیا ہے اس لیے اقامت صلوٰۃ کی حقیقت کو سمجھنا چاہیئے، اقامت کے لفظی معنی سیدھا کرنے اور ثابت رکھنے کے ہیں، اور عادۃً جو عمود یا دیوار یا درخت وغیرہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے وہ قائم رہتا ہے گر جانے کا خطرہ کم ہوتا ہے اس لیے اقامت کے معنی دائم اور قائم کرنے کے بھی آتے ہیں۔

قرآن وسنت کی اصطلاح میں اقامت صلوٰۃ کے معنی نماز کو اس کے وقت میں پابندی کے ساتھ اس کے پورے آداب وشرائط کی رعایت کر کے ادا کرنا ہیں، مطلق نماز پڑھ لینے کا نام اقامت صلوٰۃ نہیں ہے، نماز کے جتنے فضائل اور آثار وبرکات قرآن وحدیث میں آئے ہیں وہ سب اقامت صلوۃ کے ساتھ مقید ہیں، مثلاً قرآن کریم میں ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ.

یعنی نماز انسان کو ہر بے حیائی اور ہر بُرے کام سے روک دیتی ہے۔

نماز کا یہ اثر اسی وقت ظاہر ہوگا جب کہ نماز کی اقامت اس معنی سے کرے جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں، اس لیے بہت سے نمازیوں کو برائیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا دیکھ کر اس آیت پر کوئی شبہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ ان لوگوں نے نماز پڑھی تو ہے مگر اس کو قائم نہیں کیا۔ (معارف القرآن ۱/۱۵۵، سورۂ بقرہ پ۱)

صلوٰۃ کے مختلف معانی

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا (پ۲۲) لفظ صلوٰۃ عربی زبان میں چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، رحمت، دعاء، مدح وثنا، آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف جو نسبت صلوٰۃ کی ہے اس سے مراد رحمت نازل کرنا ہے، اور فرشتوں کی طرف سے صلوۃ ان کا آپ کے لئے دعا کرنا ہے اور عام مومنین کی طرف سے صلوٰۃ کا مفہوم دعاء اور مدح وثنا کا مجموعہ ہے۔ عامۂ مفسرین نے یہی معنیٰ لکھے ہیں اور امام بخاریؒ نے ابوالعالیہ سے یہ نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ کی صلوۃ سے مراد آپ کی تعظیم اور فرشتوں کے سامنے مدح وثنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی تعظیم دنیا میں تو یہ ہے کہ آپ کو بلند مرتبہ عطا فرمایا کہ اکثر مواقع اذان واقامت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ آپ کا ذکر شامل کردیا ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو دنیا بھر میں پھیلا دیا اور غالب کیا اور آپ کی شریعت پر عمل قیامت تک جاری رکھا، اس کے ساتھ آپ کی شریعت کو محفوظ رکھنے کا ذمہ حق تعالیٰ نے لے لیا۔

اور آخرت میں آپ کی تعظیم یہ ہے کہ آپ کا مقام تمام خلائق سے بلند وبالا کیا اور جس وقت کسی پیغمبر اور فرشتے کو شفاعت کی مجال نہ تھی اس حال میں آپ کو مقام شفاعت عطا فرمایا جس کو مقام محمود کہا جاتا ہے۔ (معارف القرآن ۲۲۲، ج۷، سورہ احزاب، پ۲۲)

صور کی تعریف

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ صور کیا چیز ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک سینگ ہے جس میں پھونک ماری جائے گی، مراد یہ ہے کہ سینگ کی طرح کوئی چیز ہے، جس میں فرشتے کی پھونک مارنے کا پوری دنیا پر یہ اثر ہوگا کہ سب مردے زندہ ہوکر کھڑے ہوجائیں گے، حقیقت اس صور کی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

(معارف القرآن سورہ طٰہٰ پ ۱۶، ص ۱۵۰ ج ۶)

صوم کی تعریف

صوم کے لفظی معنی امساک یعنی رُکنے اور بچنے کے ہیں، اور اصطلاح شرع میں کھانے پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے رُکنے اور باز رہنے کا نام صوم ہے بشرطیکہ وہ طلوع صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک مسلسل رُکا رہے، اور نیت روزہ کی بھی ہو، اس لیے اگر غروب سے ایک منٹ پہلے بھی کچھ کھا پی لیا تو روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر ان تمام چیزوں سے پرہیز تو پورے دن پوری احتیاط سے کیا مگر نیت روزہ کی نہیں کی تو بھی روزہ نہیں ہوا۔

صوم یعنی روزہ ان عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کے عمود اور شعائر قرار دیا گیا ہے۔ اس کے فضائل بے شمار ہیں جن کے تفصیلی بیان کا موقع نہیں۔

(معارف القرآن ۱/۳۸۶، سورۂ بقرہ پ ۱)

ضال کی تعریف

وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَهَدٰی (سورۃ الضحیٰ، پ ۳۰)

لفظ ضال کے معنیٰ گمراہ کے بھی آتے ہیں اور ناواقف بے خبر کے بھی، یہاں

دوسرے ہی معنیٰ مراد ہو سکتے ہیں کہ نبوت سے پہلے آپ ﷺ شریعت الٰہیہ کے احکام اور علوم سے بے خبر تھے آپ ﷺ کو منصب نبوت پر فائز کر کے آپ کی رہنمائی فرمائی۔ (معارف القرآن ص ۷۶۷، ج ۸، سورۃ الضحیٰ)

قَالَ فَعَلْتُهَا اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ (سورہ شعراء)

یہاں ضلال کا مطلب بے خبری ہے اور اس سے مراد قبطی کا بلا ارادہ قتل ہو جاتا ہے، اس معنیٰ کی تائید حضرت قتادہؒ اور ابن زیدؒ کی روایات سے بھی ہوتی ہے کہ دراصل عربی میں ضلال کے کئی معنیٰ آتے ہیں، اور ہر جگہ اس کا مطلب گمراہی نہیں ہوتا، یہاں بھی اس کا ترجمہ گمراہ کرنا درست نہیں۔ (معارف القرآن ص ۵۱۷، ج ۶، سورہ شعراء)

ضرورت کی تعریف

ضرورت کی تعریف یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب الموت ہو جائے گا، یہی صورت اضطرار کی ہے، اسی حالت میں حرام اور ممنوع چیز کا استعمال (چند شرائط کے ساتھ) جائز ہو جاتا ہے۔

(جواہر الفقہ، اعضاء انسانی کی پیوندکاری ۷/۳۵)

ضروریات دین کی تعریف

ضروریاتِ دین سے مراد وہ احکام و مسائل ہیں جو اسلام اور مسلمانوں میں اتنے متواتر اور مشہور ہوں کہ مسلمانوں کے ان پڑھ جاہلوں تک کو بھی ان سے واقفیت ہو، جیسے پانچ نمازوں کا فرض ہونا، صبح کی دو، ظہر کی چار رکعت کا فرض ہونا۔ رمضان کے روزے فرض ہونا، سود، شراب، خنزیر کا حرام ہونا وغیرہ اگر کوئی شخص ان مسائل سے متعلق آیاتِ قرآن میں ایسی تاویل کرے جس سے مسلمانوں کا متواتر اور مشہور مفہوم الٹ جائے وہ بلاشبہ باجماع امت کافر ہے، کیونکہ وہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے انکار ہے۔ (معارف القرآن ۷/۶۶۱، سورۃ السجدہ)

ط

طاغوت اور جِبت کی تعریف

حضرت ابن عباسؓ، ابن جبیر اور ابوالعالیہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ "جِبت" حبشی لغت میں ساحر کو کہتے ہیں اور "طاغوت" سے مراد کاہن ہے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ "جِبت" سے مراد سحر ہے اور "طاغوت" سے مراد شیطان ہے۔

مالک بن انس سے منقول ہے کہ اللہ کے سوا جن چیزوں کی عبادت کی جاتی ہے ان سب کو طاغوت کہا جاتا ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ مالک بن انس کا قول زیادہ پسندیدہ ہے کیونکہ اس کا ثبوت قرآن سے بھی ہوتا ہے ہے ارشاد ہے اَنِ اعْبُدُو اللّٰهَ وَاجْتَنِبُو االطَّاغُوْتَ

(معارف القرآن ص۴۳۲، ج۲، پ۵، سورہ نساء)

طاغی اور سرکش کی تعریف

لِلطّٰغِينَ مَاٰبًا (پ۳۰، سورہ نبا)

طاغین طاغی کی جمع ہے طغیان سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ ہے سرکشی اور طاغی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سرکشی اور نافرمانی میں حد سے گزر جائے اور یہ جبھی ہوسکتا ہے جب کہ وہ ایمان ہی سے نکل جائے اس لئے طاغین سے مراد اس جگہ کفار ہوں گے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد وہ بدعقیدہ گمراہ مسلمانوں کے فرقے ہوں جو قرآن وسنت کی حدود سے نکلے ہوئے ہیں اگرچہ صراحتاً کفر اختیار نہیں کیا جیسے روافض، خوارج، معتزلہ وغیرہ (کمافی المظہری) (معارف القرآن ص۶۵۶، ج۸، پ۳۰، سورہ نبا)

طغیان کے معنی

حکم استقامت کے بعد فرمایا وَلَا تَطْغَوْا یہ لفظ مصدر طغیان سے بنا ہے اس کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں جو ضد ہے استقامت کی، آیت میں استقامت کا حکم مثبت انداز میں صادر فرمانے پر کفایت نہیں فرمائی، بلکہ اس کے منفی پہلو کی ممانعت بھی صراحۃً ذکر کردی کہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہ میں اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول کی مقرر کردہ حدود سے باہر نہ نکلو کہ یہ ہر فساد اور دینی و دنیوی خرابی کا راستہ ہے۔ (معارف القرآن ص ۶۷۲، ج ۴، پ ۱۲، سورہ ہود)

طور کی تعریف

طور کے معنیٰ عبرانی زبان میں پہاڑ کے ہیں جس پر درخت اگتے ہوں، یہاں طور سے مراد وہ طورِ سینین ہے جو ارضِ مدین میں واقع ہے، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ سے شرف ہم کلامی نصیب ہوا بعض روایات حدیث میں ہے کہ دنیا میں چار پہاڑ جنت کے ہیں ان میں سے ایک طور ہے (قرطبی)

(معارف القرآن، ص ۱۷۹، ج ۸، سورہ طور پ ۲۷)

طہور کی تعریف

وَاَنزَلنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَھُوراً (سورہ فرقان، پ ۱۹)

طہور کا لفظ عربی زبان میں مبالغے کا صیغہ ہے، طہور اس کو کہا جاتا ہے جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیز کو بھی اس سے پاک کیا جاسکے، حق تعالیٰ نے پانی کو یہ خاص صفت عطا فرمائی ہے کہ جیسے وہ خود پاک ہے اس سے دوسری ہر قسم کی نجاست حقیقی و معنوی کو بھی دور کیا جاسکتا ہے، اور جس پانی کو آدمی استعمال کرتے ہیں وہ عموماً وہی ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے کبھی بارش کی صورت میں، کبھی برف اور اولے کی صورت میں پھر وہ

ہی پانی پہاڑوں کی رگوں کے ذریعہ قدرتی پائپ لائن کی صورت میں ساری زمین پر پھیلتا ہے، جو کہیں خود بخود چشموں کی صورت میں نکل کر زمین میں بہنے لگتا ہے، کہیں زمین کھود کر کنویں کی صورت میں نکالا جاتا ہے، یہ سب پانی اپنی ذات سے پاک اور دوسری چیزوں کو پاک کرنے والا ہے، اس پر قرآن وسنت کی نصوص بھی ناطق ہیں اور امت کا اجماع بھی۔ (معارف القرآن، ص۴۷۲، ج۶، سورہ فرقان، پ۱۹)

طیب اور خبیث کی تعریف

''قُلْ لَا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّب'' (سورہ مائدہ پ۷) عربی زبان میں طیب اور خبیث دو متقابل لفظ ہیں، طیب ہر چیز کے عمدہ اور جید کو اور خبیث ہر چیز کے ردی اور خراب کو کہا جاتا ہے، اس آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک خبیث سے مراد حرام یا ناپاک ہے، اور طیب سے مراد حلال اور پاک، معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلکہ ہر عقل سلیم کے نزدیک پاک وناپاک یا حلال وحرام برابر نہیں ہو سکتے۔

اس جگہ لفظ خبیث اور طیب اپنے عموم کے اعتبار سے حرام وحلال مال ودولت کو بھی شامل ہے اور اچھے برے انسانوں کو بھی، اور بھلے بُرے اعمال واخلاق کو بھی۔

(معارف القرآن ۲۴۱/۳، سورہ مائدہ پ۷)

طِیبِ نفس کی تعریف

فَاِنْ طِبْنَ لَکُم عَنْ شَئیٍ (سورہ نساء، پ۴)

آیت شریفہ میں جو یہ قید لگائی گئی کہ طِیبِ نفس کی خوشی سے تمہاری بیویاں اگر مہر کا کچھ حصہ تم کو دے دیں یا تم سے وصول ہی نہ کریں تو تم اس کو کھا سکتے ہو، اس میں ایک بہت بڑا راز ہے، بات یہ ہے کہ شریعت کا یہ اصول ہے کہ کسی کا ذرا سا مال بھی کسی دوسرے کے لئے حلال نہیں ہے جب تک کہ طِیبِ نفس سے اجازت نہ ہو، بطور قاعدہ کلیہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلَا لَا تَظلِمُوا اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ امرِءٍ اِلَّا بِطِیبِ نَفسٍ مِّنهُ (مشکوٰۃ ص۲۵۵)

ترجمہ: خبردار ظلم نہ کرو، اور اچھی طرح سے سمجھ لو، کہ کسی شخص کا مال (دوسرے شخص کے لئے) حلال نہیں ہے، جب تک کہ اس کے نفس کی خوشی سے حاصل نہ ہو۔

یہ ایک عظیم اصول ہے، اور اس کے ماتحت بہت سے جزئیات آجاتے ہیں۔

سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے یہ بھی فرمایا کہ اس سلسلہ میں طِیبِ نفس کا ذکر ہے طِیبِ قلب نہیں فرمایا، اس لئے کہ کسی کا مال حلال ہونے کے لئے اس کے دل کی خوشی کافی نہیں، جو لوگ رشوت یا سود دیتے ہیں بہت سے ظاہری منافع سوچ کر اور عقلی طور پر آمدنی کا حساب لگا کر خرچ کر دیتے ہیں، مگر یہ خوشی معتبر نہیں، اگر نفس سے پوچھا جائے تو وہ اس خرچہ پر قطعاً راضی نہ ہوگا، اسی وجہ سے طِیبِ نفس کو فیصل قرار دیا گیا۔

مساجد و مدارس یا اور کسی ضرورت کے لئے اگر چندہ کیا جائے اس میں بھی دینے والے کے طِیبِ نفس کا خیال رکھنا لازم ہے، پنچایت، چودھری، سردار، وفد کے دباؤ سے اگر کوئی شخص چندہ دے اور طِیبِ نفس نہ ہو تو اس چندہ کو کام میں لگانا حلال نہیں، بلکہ اس کو واپس کیا جائے گا۔ (معارف القرآن، ص ۲۹۸، ج ۲، سورہ نساء، پ۴)

فائدہ: معاملات دو قسم کے ہیں ایک وہ جن میں دل سے رضامند ہونا ضروری ہے، جیسے خرید و فروخت و ہبہ وغیرہ کہ ان میں دل سے رضامند ہونا معاملے کے لئے شرط ہے بنفس قرآن اِلَّا اَن تَکُونَ تِجَارَۃً عَن تَرَاضٍ مِّنکُم یعنی کسی دوسرے شخص کا مال حلال نہیں ہوتا جب تک تجارت وغیرہ کا معاملہ طرفین کی رضامندی سے نہ ہو اور حدیث میں ہے:

لَا یَحِلُّ مَالُ امرِءٍ اِلَّا بِطِیبِ نَفسٍ مِّنہُ (مشکوٰۃ ص۲۵۵) یعنی کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں ہے جب تک وہ خوش دلی سے اس کے دینے پر راضی نہ ہو۔

ایسے معاملات اگر اکراہ کے ساتھ کرالئے جائیں تو شرعاً ان کا کوئی اعتبار نہیں، اکراہ

کی حالت سے نکلنے کے بعد اس کو اختیار ہوں گا کہ بحالت اکراہ جو بیع یا ہبہ وغیرہ کیا تھا اس کو اپنی رضا سے باقی رکھے یا فسخ کردے۔

اور کچھ معاملات ایسے بھی ہیں جن میں صرف زبان سے الفاظ کہہ دینے پر مدار ہے دل کا قصد وارادہ یا رضا وخوشی شرطِ معاملہ نہیں مثلاً نکاح، طلاق، رجعت، عتاق وغیرہ ایسے معاملات کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے: **ثَلاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزلُهُنَّ جِدٌّ اَلنِّکَاحُ وَالطَّلاقُ وَالرَّجعَۃُ**۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

یعنی اگر جو شخص زبان سے نکاح کا ایجاب وقبول شرائط کے مطابق کرلے یا کوئی شوہر اپنی بیوی کو زبان سے طلاق دیدے یا طلاق کے بعد زبان سے رجعت کرے خواہ وہ بطور ہنسی مذاق کے ہو دل میں ارادہ نکاح یا طلاق یا رجعت کا نہ ہو پھر بھی محض الفاظ کے کہنے سے نکاح منعقد ہوجائے گا اور طلاق پڑجائے گی نیز رجعت صحیح ہوجائے گی، امام اعظم ابو حنیفہؒ، شعبی، زہری، نخعی، اور قتادہ رحمھم اللہ کے نزدیک طلاقِ مُکرہ کا بھی یہی حکم ہے۔

(معارف القرآن، ص ۳۹۵، ج ۵، سورہ نحل، پ ۱۴)

طیبات اور خبائث کی تعریف

لغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیزوں کو کہا جاتا ہے اور خبائث اس کے بالمقابل گندی اور قابل نفرت چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے، اس لیے آیت کے اس جملہ نے یہ بتلادیا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لیے حلال کی گئیں اور جو گندی قابل نفرت اور مضر ہیں وہ حرام کی گئی ہیں، وجہ یہ ہے کہ انسان دوسرے جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصد زندگی دنیا میں کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور جینے مرنے تک محدود ہو، اس کو قدرت نے مخدوم کائنات کسی خاص مقصد سے بنایا ہے اور وہ مقصد اعلیٰ پاکیزہ اخلاق کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، اسی لیے بداخلاق انسان درحقیقت انسان کہلانے کے قابل نہیں۔ (معارف القرآن ۴۲/۳، سورہ مائدہ)

ظ

ظالم اور مقتصد کی تعریف

ظالم سے مراد وہ آدمی ہے جو بعض واجبات میں کوتاہی کرتا ہے اور بعض محرمات کا بھی ارتکاب کر لیتا ہے۔

اور مقتصد یعنی درمیانی چال چلنے والا وہ شخص ہے جو تمام واجبات شرعیہ کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات سے بچتا ہے، مگر بعض اوقات بعض مستحبات کو چھوڑ دیتا ہے اور بعض مکروہات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔

اور سابق بالخیرات وہ شخص ہے جو تمام واجبات اور مستحبات کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات و مکروہات سے بچتا ہے اور بعض مباحات کو اشتغالِ عبادت یا شبہ حرمت کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔ (معارف القرآن سورۂ فاطر ۷/۳۴۵)

ظلم کی تعریف و تقسیم

ظلم کی ایک قسم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشیں گے، دوسری قسم وہ ہے جس کی مغفرت ہو سکے گی اور تیسری قسم وہ ہے کہ جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ لئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔

پہلی قسم کا ظلم شرک ہے، دوسری قسم کا ظلم حقوق اللہ میں کوتاہی ہے، اور تیسری قسم کا ظلم حقوق العباد کی خلاف ورزی ہے۔

(ابن کثیر بحوالہ مسند بزار)

شرک کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کو عبادت یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا ہے۔ (معارف القرآن ص ۵۵۰، ج ۲)

ظلمات کی تعریف

لفظ ظلمات ''ظلمۃ'' کی جمع ہے جس کے معنیٰ ہیں اندھیری رات، ظلمات البر والبحر کے معنیٰ خشکی اور دریا کی اندھیریاں ہیں، چونکہ اندھیری کی مختلف قسمیں ہیں رات کی اندھیری، گھٹا بادل کی اندھیری، گرد غبار کی اندھیری، دریا میں موجوں کی اندھیری، ان تمام قسموں کو شامل کرنے کے لئے لفظ ظلمات جمع استعمال فرمایا گیا ہے۔

(معارف القرآن سورہ انعام پ ۷، ص ۳۹۲ ج ۳)

ظن و یقین کی تعریف اور دونوں کا فرق

قطعیات وظنیات کی تعریف اور دونوں کا فرق

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئاً۔ (سورہ نجم پ ۲۷)

لفظ ''ظن'' عربی زبان میں مختلف معانی کے لیے بولا جاتا ہے، ایک معنی یہ بھی ہے کہ بے بنیاد خیالات کو ظن کہا جاتا ہے آیت میں یہی مراد ہے اور یہی مشرکین مکہ کی بت پرستی کا سبب تھا، اسی کے ازالہ کے لیے یہ فرمایا گیا ہے۔

دوسرے معنیٰ ظن کے وہ ہیں جو یقین کے بالمقابل آتے ہیں، ''یقین'' کہا جاتا ہے اس علم قطعی مطابق للواقع کو جس میں کسی شک وشبہ کی راہ نہ ہو، جیسے قرآن کریم یا احادیث متواترہ سے حاصل شدہ علم، اس کے بالمقابل ظن اس علم کو کہا جاتا ہے جو بے بنیاد خیالات تو نہیں دلیل کی بنیاد پر قائم ہے، مگر یہ دلیل اس درجہ قطعی نہیں جس میں کوئی دوسرا احتمال ہی نہ رہے، جیسے عام روایات احادیث سے ثابت ہونے والے احکام، اسی لیے قسم اول کے مسائل کو قطعیات اور یقینیات کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کو ظنیات،

اور یہ ظن شریعت میں معتبر ہے قرآن وحدیث میں اس کے معتبر ہونے کے شواہد موجود ہیں اور تمام امت کے نزدیک واجب العمل ہے، آیت مذکورہ میں ظن کو جو نا قابل اعتبار قرار دیا ہے اس سے مراد ظن بمعنی بے بنیاد و بے دلیل خیالات ہیں، اس لیے کوئی اشکال نہیں۔

(معارف القرآن ۲۰۸/۸، سورہ نجم پ: ۲۷)

ظہار کی تعریف

''ظہار'' بکسر ظا سے مشتق ہے جو بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی ایک خاص صورت کے لیے بولا جاتا ہے اور زمانۂ اسلام سے پہلے رائج ومعروف ہے، وہ صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو یہ کہہ دے کہ ''انت علی کظھر امّی'' یعنی تو مجھ پر ایسی حرام ہے جیسے میری ماں کی پشت، اس موقع پر پشت کا ذکر شاید بطور کنایہ کے ہے کہ اصل مراد تو بطن تھا، ذکر پشت کا کر دیا کما ذکرہ القرطبی۔

اصطلاح شرع میں ظہار کی تعریف یہ ہے کہ اپنی بیوی کو اپنی محرمات ابدیہ، ماں، بہن، بیٹی وغیرہ کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دینا جس کو دیکھنا اس کے لیے جائز نہیں، ماں کی پشت بھی اس کی ایک مثال ہے، زمانۂ جاہلیت میں یہ لفظ دائمی حرمت کے لیے بولا جاتا تھا اور طلاق کے لفظ سے بھی زیادہ شدید سمجھا جاتا تھا، کیونکہ طلاق کے بعد تو رجعت یا نکاح جدید ہوکر پھر بیوی بن سکتی ہے، مگر ظہار کی صورت میں رسم جاہلیت کے مطابق ان کے آپس میں میاں بیوی ہوکر رہنے کی قطعی کوئی صورت نہ تھی، شریعت اسلامیہ نے اس رسم کی اصلاح کی۔

(معارف القرآن ۳۲۵/۸، سورہ مجادلہ پ: ۲۸)

ع

عالم اور فقیہ کی تعریف

لفظ علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی ذات وصفات کا کماحقہ علم رکھتے ہیں اور مخلوقات عالم میں اس کے تصرفات پر اور اس کے احسانات وانعامات پر نظر رکھتے ہیں، صرف عربی زبان یا اس کے صرف ونحو اور فن بلاغت جاننے والوں کو قرآن کی اصطلاح میں عالم نہیں کہا جاتا، جب تک اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت مذکورہ طریق پر حاصل نہ ہو۔

حسن بصریؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ عالم وہ شخص ہے جو خلوت وجلوت میں اللہ سے ڈرے اور جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے ترغیب دی ہے وہ اس کو مرغوب ہو، اور جو چیز اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اس کو اس سے نفرت ہو۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:

لَيْسَ الْعِلْمُ بِكَثْرَةِ الْحَدِيْثِ وَلٰكِنَّ الْعِلْمَ عَنْ كَثْرَةِ الْخَشْيَةِ.

یعنی بہت سی احادیث یاد کر لینا یا بہت باتیں کرنا کوئی علم نہیں بلکہ علم وہ ہے جس کے ساتھ اللہ کا خوف ہو۔

حاصل یہ ہے کہ جس قدر کسی میں خدائے تعالیٰ کا خوف ہے وہ اسی درجہ کا عالم ہے اور احمد بن صالح مصری نے فرمایا کہ خشیۃ اللہ کو کثرت روایت اور کثرتِ معلومات سے نہیں پہچانا جاسکتا بلکہ اس کو کتاب وسنت کے اتباع سے پہچانا جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ

جس شخص میں خشیت نہ ہو وہ عالم نہیں (مظہری) اس کی تصدیق اکابر سلف کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت ربیع بن انسؓ نے فرمایا:

مَنْ لَّمْ یَخْشَ فَلَیْسَ بِعَالِمٍ۔ یعنی جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ عالم نہیں۔

اور مجاہدؒ نے فرمایا:

اِنَّمَا الْعَالِمُ مَنْ خَشِیَ اللہَ۔ یعنی عالم تو صرف وہی ہے جو اللہ سے ڈرے۔

سعد بن ابراہیم سے کسی نے .... پوچھا کہ مدینہ میں سب سے زیادہ افقہ کون ہے؟ تو فرمایا: **اَتْقَاھُمْ لِرَبِّه** یعنی جو اپنے رب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔

اور حضرت علی مرتضیٰؓ نے فقیہ کی تعریف اس طرح فرمائی:

اِنَّ الْفَقِیْهَ حق الفقیه مَنْ لَمْ یقنط النَّاسَ مِنْ رَّحْمَةِ اللہِ وَلَمْ یرخص لَھُمْ فِی مَعَاصِی اللہِ تَعالیٰ، وَلَمْ یُومِنُھُمْ مِنْ عَذَابِ اللہِ تعالیٰ وَلَمْ یَدَع الْقُرْآنَ رَغْبَة عَنْهُ اِلٰی غیرہٖ اِنَّهٗ لَا خَیْرَ فِی عِبَادَةٍ لَاعِلْمَ فِیْھَا وَلَاعِلْمٍ لَافِقْه فِیْهِ وَلَا قِرَاءَةٍ لَّا تَدَبُّرَ فِیْھَا۔ (قرطبی)

فقیہ مکمل وہ فقیہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس بھی نہ کرے اور ان کو گناہوں کی رخصت بھی نہ دے اور ان کو اللہ کے عذاب سے مطمئن بھی نہ کرے، اور قرآن کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف رغبت نہ کرے (اور فرمایا) اس عبادت میں کوئی خیر نہیں جو بے علم کے ہو اور اس علم میں کوئی خیر نہیں جو بے فقہ یعنی بے سمجھ بوجھ کے ہو، اور اس قرأت میں کوئی خیر نہیں جو بغیر تدبر کے ہو۔

مذکورہ تصریحات سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ بہت سے علماء کو دیکھا جاتا ہے کہ ان میں خدا کا خوف وخشیت نہیں، کیونکہ تصریحات بالا سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک صرف عربی جاننے کا نام علم اور جاننے والے کا نام عالم نہیں، جس میں خشیت نہ ہو، وہ قرآن کی اصطلاح میں عالم ہی نہیں البتہ خشیت کبھی صرف اعتقادی اور عقلی ہوتی ہے

جس کی وجہ سے آدمی بہ تکلف احکام شرعیہ کا پابند ہوتا ہے اور کبھی یہ خشیت حالی اور ملکہ راسخہ کے درجہ میں ہو جاتی ہے جس میں اتباع شریعت ایک تقاضائے طبیعت بن جاتا ہے، خشیت کا پہلا درجہ مامور بہ اور عالم کے لیے ضروری ہے دوسرا درجہ افضل و اعلیٰ ہے ضروری نہیں۔

(معارف القرآن ۷/۳۳۸، پ۲۲)

عالم کی تعریف

تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ (عنکبوت)

امام بغویؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرما کر فرمایا کہ عالم وہی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں غور و فکر کرے، اور اس کی طاعت پر عمل کرے، اور اس کو ناراض کرنے والے کاموں سے بچے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے محض الفاظ سمجھ لینے سے اللہ کے نزدیک کوئی شخص عالم نہیں ہوتا جب تک قرآن میں تدبّر اور غور و فکر کی عادت نہ ڈالے، اور جب تک کہ اپنے عمل کو قرآن کے مطابق نہ بنائے۔

مسند احمد میں حضرت عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہزار امثال سیکھی ہیں، ابن کثیرؒ اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ حضرت عمرو بن عاص کی بہت بڑی فضیلت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مذکورہ میں عالم انہی کو فرمایا ہے جو اللہ و رسول کی بیان کردہ امثال کو سمجھیں۔

اور حضرت عمرو بن مُرّہ نے فرمایا کہ جب میں قرآن کی کسی آیت پر پہنچتا ہوں جو میری سمجھ میں نہ آئے تو مجھے بڑا غم ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ (ابن کثیر)

(معارف القرآن ص ۶۹۴، ج ۶، سورہ عنکبوت، پ۲۰)

عالَم کی تعریف

''العلمین'' عالم کی جمع ہے جس میں دنیا کی تمام اجناس آسمان، چاند، سورج اور تمام ستارے اور ہوا وفضاء، برق و باراں، فرشتے، جنات، زمین اوراس کی تمام مخلوقات، حیوانات، انسان، نباتات، جمادات سب داخل ہیں۔

(معارف القرآن سورہ فاتحہ پ:۱، ۱/۷۰)

عاملین فی الصدقہ کی تعریف

آج کل کے سفراء عامل فی الصدقہ کے حکم میں ہیں یا نہیں؟

عاملین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات زکوٰۃ وعشر وغیرہ ...... لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں، یہ لوگ چونکہ اپنے تمام اوقات اس خدمت میں خرچ کرتے ہیں، اس لیے ان کی ضروریات کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہے، قرآن کریم کی اس آیت نے مصارف زکوٰۃ میں ان کا حصہ رکھ کر یہ متعین کر دیا کہ ان کا حق الخدمت اسی مدِّ زکوٰۃ سے دیا جائے گا۔

اس میں اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے زکوٰۃ وصدقات وصول کرنے کا فریضہ براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا ہے، جس کا ذکر اسی سورت میں آگے آنے والی اس آیت میں ہے، **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً** یعنی وصول کریں آپ مسلمانوں کے اموال میں سے صدقہ، اس آیت میں فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ زکوۃ وصدقات وصول کرے اور یہ ظاہر ہے کہ امیر خود اس کام کو پورے ملک میں بغیر اعوان اور مددگاروں کے نہیں کرسکتا، انہی اعوان اور مددگاروں کا ذکر مذکور الصدر آیت میں **وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا** کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔

انہی آیات کی تعمیل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے صحابہ کرام کو صدقات وصول کرنے کے لیے عامل بنا کر مختلف خطوں میں بھیجا ہے اور آیت مذکورہ کی ہدایت کے موافق زکوۃ ہی کی حاصل شدہ رقم میں سے ان کو حق الخدمت دیا ہے، ان میں وہ حضرات صحابہ بھی شامل ہیں جو اغنیاء تھے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کسی غنی یعنی مال دار کے لیے حلال نہیں بجز پانچ شخصوں کے، ایک وہ شخص جو جہاد کے لیے نکلا ہے، اور وہاں اس کے پاس بقدر ضرورت مال نہیں، اگر چہ گھر میں مال دار ہو، دوسرے عامل صدقہ جو صدقہ وصول کرنے کی خدمت انجام دیتا ہو، تیسرے وہ شخص کہ اگر چہ اس کے پاس مال ہے مگر وہ موجودہ مال سے زیادہ کا مقروض ہے، چوتھے وہ شخص جو صدقہ کا مال کسی غریب مسکین سے پیسے دے کر خرید لے، پانچویں وہ شخص جس کو کسی غریب فقیر نے صدقہ کا حاصل شدہ مال بطور ہدیہ تحفہ پیش کر دیا ہو۔

رہا یہ مسئلہ کہ عاملین صدقہ کو اس میں سے کتنی رقم دی جائے سو اس کا حکم یہ ہے کہ ان کی محنت و عمل کی حیثیت کے مطابق دی جائے گی۔ (احکام القرآن جصاص، قرطبی)

البتہ یہ ضروری ہوگا کہ عاملین کی تنخواہیں نصف زکوۃ سے بڑھنے نہ پائیں، اگر زکوۃ کی وصول یابی اتنی کم ہو کہ عاملین کی تنخواہیں دے کر نصف بھی باقی نہیں رہتی تو پھر تنخواہوں میں کمی کی جائے گی، نصف سے زائد صرف نہیں کیا جائے گا۔

(تفسیر مظہری، ظہیریہ)

بیان مذکور سے معلوم ہوا کہ عاملین صدقہ کو جو رقم مد زکوۃ سے دی جاتی ہے وہ بحیثیت صدقہ نہیں بلکہ ان کی خدمت کا معاوضہ ہے، اسی لیے باوجود غنی اور مال دار ہونے کے بھی وہ اس رقم کے مستحق ہیں، اور زکوۃ سے ان کو دینا جائز ہے، اور مصارف زکوۃ کی آٹھ مدات میں سے صرف ایک یہی مد ایسی ہے جس میں رقم زکوۃ

بطور معاوضہ خدمت دی جاتی ہے، ورنہ زکوٰۃ نام ہی اس عطیہ کا ہے جو غریبوں کو بغیر کسی معاوضہ خدمت کے دیا جائے، اور اگر کسی غریب فقیر کو کوئی خدمت لے کر مال زکوٰۃ دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔

اسی لیے یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ مال زکوٰۃ کو معاوضہ خدمت میں کیسے دیا گیا، دوسرے یہ کہ مال دار کے لیے یہ مال زکوۃ حلال کیسے ہوا، ان دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ عاملین صدقہ کی اصلی حیثیت کو سمجھ لیا جائے، وہ یہ ہے کہ یہ حضرات فقراء کے وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ سب جانتے ہیں کہ وکیل کا قبضہ اصل مؤکل کے قبضہ کے حکم میں ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اپنا قرض وصول کرنے کے لیے کسی کو وکیل مختار بنا دے اور قرضدار یہ قرض وکیل کو سپرد کر دے تو وکیل کا قبضہ ہوتے ہی قرض دار بری ہو جاتا ہے، تو جب رقم زکوٰۃ عاملین صدقہ نے فقراء کے وکیل ہونے کی حیثیت سے وصول کر لی تو ان کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، اب یہ پوری رقم ان فقراء کی ملک ہے جن کی طرف سے بطور وکیل انہوں نے وصول کی ہے، اب جو رقم بطور حق الخدمت کے ان کو دی جاتی ہے وہ مال داروں کی طرف سے نہیں بلکہ فقراء کی طرف سے ہوئی، اور فقراء کو اس میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا اختیار ہے، ان کو یہ بھی حق ہے کہ جب اپنا کام ان لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنی رقم میں سے ان کو معاوضہ خدمت دے دیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ فقراء نے تو ان کو وکیل مختار بنایا نہیں یہ ان کے وکیل کیسے بن گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ جس کو امیر کہا جاتا ہے وہ قدرتی طور پر منجانب اللہ پورے ملک کے فقراء و غرباء کا وکیل ہوتا ہے، کیونکہ ان سب کی ضروریات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے، امیر مملکت جس جس کو صدقات کی وصول یابی پر عامل بنا دے وہ سب ان کے نائب کی حیثیت سے فقراء

کے وکیل ہو جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ عاملین صدقہ کو جو کچھ دیا گیا وہ درحقیقت زکوٰۃ نہیں دی گئی بلکہ زکوٰۃ جن فقراء کا حق ہے ان کی طرف سے معاوضہ خدمت دیا گیا، جیسے کوئی غریب فقیر کسی کو اپنے مقدمہ کا وکیل بنا دے اور اس کا حق الخدمت زکوۃ کے حاصل شدہ مال سے ادا کر دے تو یہاں تو دینے والا بطور زکوۃ کے دے رہا ہے اور نہ لینے والا زکوۃ کی حیثیت سے لے رہا ہے۔

فائدہ: تفصیل مذکور سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات زکوۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لیے وصول کرتے ہیں ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جا سکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے، زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جا سکتی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں، بلکہ اصحاب زکوٰۃ مال داروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی لیے ان کے قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لیے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں اور امیر المومنین کی ولایت عامہ کی بنا پر جو خود بخود وکالتِ فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لیے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے، اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔

اس معاملہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے، بہت سے ادارے زکوٰۃ کا فنڈ

وصول کر کے اس کو سالہا سال رکھے رہتے ہیں، اور اصحاب زکوٰۃ سمجھتے ہیں کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہوگئی، حالانکہ ان کی زکوٰۃ اس وقت ادا ہوگی جب ان کی رقم مصارف زکوٰۃ میں صرف ہو جائے۔

اسی طرح بہت سے لوگ ناواقفیت سے ان لوگوں کو عاملین صدقہ کے حکم میں داخل سمجھ کر زکوٰۃ ہی کی رقم سے ان کی تنخواہ دیتے ہیں، یہ نہ دینے والوں کے لیے جائز ہے نہ لینے والوں کے لیے۔ (معارف القرآن ۳۹۹/۴، سورۂ توبہ پ ۱۰)

سابقہ تحقیق کے ایک جزء سے رجوع

فائدہ: حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سابقہ تحقیق میں دو باتیں تحریر فرمائی گئیں ہیں جسکی تفصیل حضرت کے فتاویٰ امداد المفتین کی کتاب الزکوٰۃ اور جواہر الفقہ جلد ۴ صفحہ ۳۶۸ مطبوعہ دیوبند میں مذکور ہے جس کا حاصل دو باتیں ہیں۔

ایک تو یہ کہ دینی مدارس کے سفراء، محصلین چندہ مدارس کے طلبہ اور فقراء کے وکیل نہیں بلکہ معطین یعنی زکوٰۃ دینے والوں کے وکیل ہیں، لہٰذا ان کے قبضہ میں زکوٰۃ پہنچنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی جب تک کہ مستحقین زکوٰۃ پر صرف نہ کر دی جائے۔

دوسری بات یہ تحریر فرمائی کہ سفراء مدارس عاملین فی الصدقہ کی حکم میں نہیں لہٰذا زکوٰۃ کی رقم سے ان کو تنخواہ نہیں دی جاسکتی، مذکورہ بالا تحقیق میں شق اول سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رجوع فرمالیا تھا جسکی تفصیل درج ذیل ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

”تملیک زکوۃ کے مسئلہ سے متعلق میرا رسالہ جو ۱۳۶۱ھ میں لکھا گیا تھا اور امداد المفتین کا جزء ہو کر بار بار شائع ہوا اس میں مہتممین مدرسہ کا حکم عاملین صدقہ کے حکم سے مختلف اسی شبہ کی بنیاد پر لکھا گیا تھا جو خود سیدی حضرت حکیم الامتؒ نے پیش فرمایا لیکن جب اس شعبہ کو خود حضرتؒ نے رأس الفقہاء حضرت مولانا خلیل احمد

سہارنپوریؒ کے سامنے پیش فرمایا اور حضرت موصوف نے اس کا جواب تحریر فرمایا تو حضرت حکیم الامتؒ کا وہ شبہ رفع ہوگیا اور وہ اسی حکم پر مطمئن ہو گئے جو حضرت ممدوح نے لکھا تھا۔ ''یعنی آج کل کے مہتممین مدرسہ اور ان کے مقرر کردہ چندہ وصول کرنے والے عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہو کر فقراء کے وکیل ہیں، معطیین نے چندہ کی وکالت صرف اس درجہ میں کی ہے کہ انہوں نے ان حضرات کو وکیل فقراء تسلیم کر کے اپنا چندہ ان کے حوالے کر دیا تو جب بحیثیت وکیل فقراء رقم ان کے قبضہ میں چلی گئی تو وہ فقراء کی ملک ہوگئی، اور زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، بات تو اتنے ہی سے صاف ہوگئی تھی لیکن اس کی مزید تائید وتوثیق ابوحنیفہؒ وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے اس فتوے سے ہوگئی جو تذکرۃ الرشید میں مولانا صادق الیقین صاحبؒ کے ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا، جس میں اس کی تصریح ہے کہ اگرچہ یہ طلباء وفقراء مجہول الکمّیت والذوات ہیں اس کے باوجود ان کی وکالت مہتمان مدرسہ کیلئے عرفی طور پر ثابت ہوگئی اور ان کا قبضہ فقراء کا قبضہ ہوگیا۔

حضرت گنگوہیؒ کے اس مدلل فتویٰ اور حضرت مولانا خلیل احمد قدس اللہ سرہٗ کی تحقیق اور اس پر حضرت حکیم الامتؒ کی تسلیم وتصدیق کے بعد مسئلہ میں تو کوئی اشکال نہیں رہا تاہم احقر نے جب پاکستان آنے کے بعد کراچی میں دارالعلوم قائم کیا تو احتیاطاً یہ صورت اختیار کی کہ جن طلباء کو دارالعلوم میں داخلہ دیا جاتا ہے تو ان کے داخلہ فارم پر یہ توکیل کا مضمون ہر طالب علم کی طرف سے برائے مہتمم مدرسہ یا جن کو وہ مامور کرے طبع کر دیا گیا ہے اور داخل ہونے والا طالب علم باقاعدہ مہتمم مدرسہ کو اپنی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے کا بھی وکیل بناتا ہے اور عام فقراء کی ضرورتوں پر خرچ کرنے کا بھی۔ اس طرح مہتمم مدرسہ ہر سال داخل ہونے والے متعین طلباء کا وکیل ہوتا ہے۔ اور ان کی طرف سے تمام مصارف طلباء پر خرچ کرنے کا مجاز۔ اس طرح مجہول الکمّیت والذوات ہونے کا شبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے میں امدادالمفتیین

میں اس مسئلہ سے متعلق شائع شدہ عبارت سے رجوع کر کے اسی فیصلہ کو تسلیم کرتا ہوں جو فیصلہ ان سب اکابر کا ہے، یعنی موجودہ زمانہ کے مہتممان مدارس یا ان کے مامور کردہ حضرات جو چندہ یا زکوٰۃ وصول کرتے ہیں وہ بحیثیت وکیل فقراء کے وصول ہوتی ہے اوران کے قبضہ میں پہنچتے ہی معطیین زکوٰۃ کی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے۔''

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دارالعلوم کراچی ۱۴ ۷/ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ

(جواہر الفقہ ص ۳۸۷، ج ۴ مطبوعہ دیوبند)

عبادت واستعانت کی تعریف

عبادت کے معنی ہیں اپنی پوری طاقت مکمل فرمانبرداری میں صرف کرنا اور خوف وعظمت کے پیش نظر نافرمانی سے دور رہنا۔ (روح البیان ۱/۱۴۷)

(معارف القرآن ۱/۱۳۲ سورہ بقرہ پ:۱)

عبادت کے معنی ہیں کسی کی انتہائی تعظیم ومحبت کی وجہ سے اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار۔

''نَسْتَعِیْنُ'' استعانت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی سے مدد مانگنا۔

(معارف القرآن سورہ فاتحہ پ:۱، ۱/۷۶)

عبادت وشرک کی تعریف

عبادت کے معنیٰ اوپر معلوم ہوچکے ہیں کہ کسی ذات کی انتہائی عظمت ومحبت کی بنا پر اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور تذلّل کا اظہار ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے تو یہی شرک کہلاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شرک صرف اسی کو نہیں کہتے کہ بت پرستوں کی طرح کسی پتھر کی مورتی وغیرہ کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھے بلکہ کسی کی عظمت، محبت، اطاعت

کو وہ درجہ دینا جو اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے یہ بھی شرک جلی میں داخل ہے، قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کے شرک کا بیان کرتے ہوئے، ارشاد فرمایا ہے:

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ)

یعنی ان لوگوں نے اپنے دینی عالموں کو اپنا رب بنالیا ہے۔

حضرت عدی بن حاتمؓ جو مسلمان ہونے سے پہلے نصرانی تھے انہوں نے اس آیت کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا ہم تو اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے پھر قرآن میں ان کو معبود بنانے کا الزام ہم پر کیسے لگایا گیا؟ آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے علماء بہت سی ایسی چیزوں کو حرام قرار دے دیتے ہیں جن کو اللہ نے حلال کیا ہے، اور تم اپنے علماء کے کہنے پر ان کو حرام ہی سمجھتے ہو، اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، تمہارے علماء ان کو حلال کر دیتے ہیں، تو تم ان کے کہنے کا اتباع کر کے حلال کر لیتے ہو؟ عدی بن حاتمؓ نے عرض کیا کہ بے شک ایسا تو ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو ان کی عبادت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف حق تعالیٰ کا ہے جو شخص اس میں کسی دوسرے کو شریک قرار دے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حرام و حلال معلوم ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی دوسرے کے قول کو واجب الاتباع سمجھے وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے، اور شرک میں مبتلا ہے۔

عام مسلمان جو قرآن و سنت کو براہِ راست سمجھنے کی اور ان سے احکام شرعیہ نکالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے کسی امام، مجتہد، یا عالم و مفتی کے قول پر اعتماد کر کے عمل کرتے ہیں اُس کا اِس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ درحقیقت قرآن و سنت ہی پر عمل ہے، اور احکام خداوندی ہی کی اطاعت ہے، اور خود قرآن کریم نے

اس کی ہدایت فرمائی ہے:

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

یعنی اگر تم خود احکام الٰہیہ کو نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو

اور جس طرح احکام حلال وحرام میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شریک کرنا شرک ہے اسی طرح کسی کے نام کی نظر (منت) ماننا بھی شرک میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو حاجت روا، مشکل کشا سمجھ کر اس سے دعا مانگنا بھی شرک ہے کیونکہ حدیث میں دعا کو عبادت فرمایا گیا ہے۔

اسی طرح ایسے اعمال وافعال جو علامات شرک کی سمجھے جاتے ہیں اُن کا ارتکاب بھی بحکم شرک ہے۔ (معارف القرآن ج۱، ص۱۴۱، سورہ فاتحہ، پ۱)

عبادتِ مقصودہ وغیر مقصودہ کی تعریف

عبادات دو قسم کی ہیں ایک عباداتِ مقصودہ اصلیہ، جن کی اصل وضع اور مشروعیت محض عبادت یعنی رضائے الٰہی کے لئے ہوئی ہے، ان پر جو آثار وثمرات دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں وہ مقصود اصلی نہیں بلکہ وہ خاص اعمال وافعال اور ان کے ادا کرنے کا وہ خاص طریقہ جو قرآن وحدیث میں منقول ہے، اور ان کی خاص ہیئت و صورت جو سنت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، وہ خود مقصود ہے، اگر ان اعمال وافعال کے جو خواص وثمرات ہیں وہ کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل ہو جائیں، تب بھی ان اعمال کا ترک جائز نہیں اور اعمال کرنے پر بالفرض وہ آثار مرتب نہ ہوں تو بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اعمال ضائع ہو گئے، مثلاً: روزہ کا مشہور فائدہ انسان کی بہیمی قوت کو توڑنا ہے، اگر کسی کو بلا روزہ یہ کیفیت حاصل ہو جائے تب بھی اس پر روزہ بدستور فرض رہے گا، اذان کی اصلی غرض محلّہ والوں کو نماز کے لئے جمع کرنا ہے، لیکن اگر کسی محلّہ پر سارے اہلِ محلّہ مسجد میں موجود ہوں پھر بھی اذان کا چھوڑ دینا جائز

نہیں، اسی طرح خطبۂ جمعہ کا مشہور فائدہ مسلمانوں کو احکامِ شرعیہ کی تعلیم و تذکیر ہے، لیکن اگر کسی مجمع میں علماء فقہاء ہی ہوں جن کو سب احکام معلوم بھی ہوں اور یاد بھی، خطبۂ جمعہ اس وقت بھی فرض ہے اس کو چھوڑ دیں گے تو جمعہ ادا نہ ہوگا۔

دوسری قسم عبادات کی وہ ہے جو کسی عبادت کا ذریعہ بن جانے کے سبب عبادت کہلاتی ہے، اپنی ذات میں عبادت نہیں، اس طرح کی عبادت کا نہ کوئی خاص طریقہ شریعت میں موجود ہے نہ کوئی خاص نوع، بلکہ دنیا کا ہر کام کھانا، پینا، سونا، جاگنا، زراعت، تجارت، صناعت کے کل کاروبار اگر ان کو ذرائع عبادت سمجھ کر (جیسا کہ حقیقت میں ذرائع ہیں) کیا جائے تو وہ سب اس دوسرے معنیٰ میں عبادت کی فہرست میں آجاتے ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ ان میں کوئی ایسی صورت نہ اختیار کی جائے جو شرعاً ناجائز ہو، اسی لئے وہ عبادت اگر ایک ذریعہ کے بجائے کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل ہو جائے تو اس کی ضرورت نہیں رہتی۔

مثلاً: حج ایک عبادت مقصودہ ہے، اس کا ایک خاص طریقہ اور خاص اعمال وارکان واجبات وسنن کی تفصیل کے ساتھ قرآن وحدیث میں مذکور ہیں، یہاں وہ اعمال وافعال خود مقصود ہیں ان پر مرتب ہونے والے ثمرات جو ایک بین الاقوامی اجتماع سے ہو سکتے ہیں، یا عشق الٰہی کا ایک مظاہرہ جو حج کے تمام اعمال وارکان میں مشاہد ہے، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس کو مقصود حج قرار دیا جا سکے، اسی لئے اگر یہ فوائد مکہ مکرمہ کے علاوہ کسی دوسرے شہر یا ملک میں یا ایام حج کے کے علاوہ دوسرے ایام میں اس خاص ہیئت کے علاوہ دوسری ہیئت میں حاصل ہو سکیں تو فریضۂ حج ساقط نہیں ہو سکتا، اسی لئے باجماعِ امت افعالِ حج کی جو صورت وطریقہ شریعت میں منقول ہے اسی کو ادا کرنا فرض وضروری ہے، ان میں کسی قسم کے تغیّر، تبدّل اور کمی بیشی کا کسی کو اختیار نہیں۔

لیکن اسی فریضۂ حج کے ساتھ کچھ اور اعمال وافعال بھی ہیں جو عبادت مقصودہ نہیں بلکہ محض ذریعۂ عبادت ہونے کی وجہ سے عبادت سمجھے جاتے ہیں، مثلاً: حج کے لئے روپیہ جمع کرنا، ضروریات سفر مہیّا کرنا، اور آج کل بکنگ آفس میں جانا، وہاں کی ہدایات وشرائط کو پورا کرنا، پھر ہوائی یا بحری جہاز پر سوار ہونا، جدّہ پہنچنا، پھر وہاں سے سفر کا انتظام کر کے مکّہ مکرمہ میں داخل ہونا، یہ سارے کام عبادات ہیں مگر عباداتِ مقصودہ نہیں، اسی لئے جو شخص مکہ مکرمہ میں موجود ہے یا کسی دوسرے شخص نے اس کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے کر اس کو بسہولت مکہ مکرمہ پہنچا دیا تو اس کے ذمّہ ان تمام کاموں میں سے کوئی کام نہیں رہ جاتا، اس کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جب تک یہ سارے کام نہیں کر کے آؤ گے حج ہی نہیں ہوگا، یا تمہارے حج میں کوئی نقصان رہے گا، اسی طرح نماز ایک عبادت مقصودہ ہے، اس کے لئے چل کر مسجد میں جانا بھی بوجہ ذریعۂ عبادت ہونے کے عبادت ہے، لیکن اگر کوئی شخص مسجد ہی کے حجرے میں رہتا ہے تو چل کر جانے کی عبادت غیر مقصودہ اس سے ساقط ہوگئی، کیونکہ اصل عبادت بغیر اس ذریعہ کے حاصل ہوگئی ہے۔

عباداتِ مقصودہ وغیر مقصودہ میں فرق واضح ہوجانے کے بعد اب ان کے متعلقہ احکام شرعیہ کا فرق سمجھئے!

عباداتِ غیر مقصودہ یعنی ذرائع عبادت کے متعلق شریعت میں بڑی وسعت ہے، ان کا کوئی خاص طریقہ یا خاص وضع لازم ومقرر نہیں، ان میں کمی وبیشی بھی کوئی جرم نہیں جب کہ اصل عبادت میں کمی بیشی نہ ہو، اور ان میں ضروریاتِ زمانہ واختلافِ مقام کی وجہ سے تغیّر وتبدیل بھی کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ یہ تغیّر خود کسی شرعی حکم کے خلاف نہ ہو، مثلاً: حج کے لئے سفر اونٹوں کی سواری کی بجائے موٹر، ریل، ہوائی جہاز وغیرہ میں کیا جائے تو بلا کراہت درست ہے، اس کو بدعت نہیں کہا جاسکتا،

کیونکہ یہ سفر خود کوئی عبادت نہیں بلکہ عبادتِ حج کا ذریعہ ہے، علامہ شاطبیؒ نے کتاب الاعتصام میں اسی مضمون کو بالالفاظ ذیل تحریر فرمایا:

لو کان ثم من یسیر الیٰ فریضۃ الحج طیرانا فی الھواء او مشیا علی الماء لم یعد مبتدعا

اسی طرح فریضۂ جہاد کے لئے تیر اور نیزوں کے بجائے آج رائفل، اور توپ یا ٹینک یا بم استعمال کئے جائیں تو کوئی ممانعت نہیں بلکہ ضروری اور مستحسن ہیں، کیونکہ تیر چلانا خود کوئی عبادت نہیں، بلکہ عبادتِ جہاد کا ایک ذریعہ ہے وہ ضرورتِ زمانہ کے اعتبار سے بدلا جا سکتا ہے۔

اسی مضمون کو بعض علماء و محققین نے اس الفاظ سے بیان فرمایا ہے کہ حدیث میں ''احداث فی الدّین'' یعنی دین میں کوئی نئی چیز کے پیدا کرنے کو بدعت قرار دیا گیا ہے، ''احداث للدّین'' یعنی دین کی ضرورت کے لئے کوئی نیا ذریعہ پیدا کرنا اس میں داخل نہیں، یہ حکم عبادت غیر مقصودہ کا ہے جو اصل میں خود عبادت نہیں۔ بلکہ ذریعہ عبادت ہونے کے سبب عبادت کہلاتی ہیں۔

اب عبادتِ مقصودہ کو لیجئے! تو ان کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے، یہاں جس طرح یہ عبادات خود مقصود ہیں ان کی وہ ہیئت وصورت بھی مقصود ہے جو شریعت میں بتلائی گئی ہے، ان میں ادنیٰ تغیّر وتبدّل بھی اپنی رائے سے جائز نہیں، ان میں جس طرح کوتاہی وکمی حرام ہے اسی طرح زیادتی واضافہ بھی حرام ہے، ظہر کی نماز کی جیسے چار کے بجائے تین رکعت پڑھنا جرم ہے اسی طرح پانچ پڑھنا بھی جرمِ عظیم ہے، پھر رکعات کی کمی بیشی پر ان کی شکل وصورت، ترتیب وغیرہ میں بھی ادنیٰ تغیّر کرنے کی اجازت نہیں، قیام وقعود، رکوع وسجود کی ہیئت جو سنّت سے ثابت ہے اس کے خلاف کرنا جرم ہے۔

حج ہی کو لیجئے کہ سفرِ حج میں یہ توسّع ہے کہ چاہے پیدل کرلے، چاہے سواری پر اور اونٹ پر سوار ہوکر یا ہوائی جہاز پر، لیکن ارکانِ حج کی ادائیگی مثلاً: طواف وسعی میں یہ آزادی نہیں کہ جس کا جی چاہے بجائے پیدل طواف کرنے کے طیارہ میں بیٹھ کر بیت اللہ کے گرد طواف کرے، یا صفا ومروہ کے درمیان سعی کرلیا کرے بلکہ ارکان حج میں بلا عذر شرعی ایسا کرنا درست نہیں۔

(آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام، جواہر الفقہ ،ص ۳۱۵، ۳۱۶، ج ۷)

عدت کی تعریف

عدّت کے لفظی معنیٰ عدد شمار کرنے کے ہیں، شرعی اصطلاح میں اس مدت کو کہا جاتا ہے جس میں عورت ایک شوہر کے نکاح سے نکلنے کے بعد دوسرے نکاح سے ممنوع ہوتی ہے، اس مدتِ انتظار کو عدت کہا جاتا ہے، اور کسی شوہر کے نکاح سے نکلنے کی صورتیں دو ہوتی ہیں، ایک یہ کہ شوہر کا انتقال ہوجائے، اس کی عدت کو عدّت وفات کہا جاتا ہے، جو غیر حاملہ کے لئے چار ماہ دس دن مقرر ہے۔ دوسری صورت نکاح سے نکلنے کی طلاق ہے۔ عدّت طلاق غیر حاملہ عورت کے لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک تین حیض پورے ہیں اور امام شافعی اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک تین طہر عدت طلاق ہے۔

(معارف القرآن ص ۴۷۸، ج ۸، سوہ طلاق، پ ۲۸)

عدل وانصاف کی تعریف

عدل: اس لفظ کے اصلی اور لغوی معنیٰ برابر کرنے کے ہیں، اسی مناسبت سے حکام کا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ ''عدل'' کہلاتا ہے، قرآن کریم میں: أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ، اسی معنیٰ کے لئے آیا ہے، اور اسی لحاظ سے

لفظ عدل افراط وتفریط کے درمیان اعتدال کو بھی کہا جاتا ہے، اور اسی کی مناسبت سے بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ لفظ عدل تفسیر ظاہر و باطن کی برابری سے کی ہے، یعنی جو قول یا فعل انسان کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہو اور باطن میں بھی اس کا وہی اعتقاد اور حال ہو، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ یہاں لفظ عدل اپنے عام معنیٰ میں ہے، جو ان سب صورتوں کو شامل ہے جو مختلف ائمۂ تفسیر سے منقول ہیں، ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔

اور ابن عربی نے فرمایا کہ لفظ عدل کے اصلی معنیٰ برابری کرنے کے ہیں، پھر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے، مثلاً ایک مفہوم عدل کا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظِ نفس پر اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔

دوسرا عدل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے، وہ یہ کہ اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو، اس کی ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اس کے لئے انجام کار مضر ہوں، اور قناعت و صبر سے کام لے، نفس پر بلا وجہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

تیسرا عدل اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے، اور کسی ادنیٰ اعلیٰ معاملہ میں کسی سے خیانت نہ کرے، سب لوگوں کے لئے اپنے نفس سے انصاف کا مطالبہ کرے، کسی انسان کو اس کے کسی قول و فعل سے ظاہراً یا باطناً کوئی ایذاء اور تکلیف نہ پہونچے۔

(معارف القرآن ج ۵/ ۳۸۹، نحل: پ ۱۴)

عدوۃ، قصویٰ، دنیا کے معنی

عدویٰ کے معنی ایک جانب کے آتے ہیں، اور لفظ دنیا ادنیٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں قریب تر، آخرت کے مقابلہ میں اس جہاں کو بھی دنیا اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عالم آخرت کی نسبت انسان کی طرف قریب تر ہے۔ اور لفظ قصویٰ اقصیٰ سے بنا ہے اقصیٰ کے معنی بعید تر۔ (معارف ۲۴۵/۴، سورۂ انفال)

عرف کے معنی

عرف بمعنی معروف ہر اچھے اور مستحسن کام کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے ساتھ برائی اور ظلم سے پیش آئیں آپ ان سے انتقام نہ لیں، بلکہ معاف کردیں، مگر ساتھ ہی ان کو نیک کام کی ہدایت بھی کرتے رہیں، گویا بدی کا بدلہ نیکی سے، ظلم کا بدلہ صرف انصاف ہی سے نہیں بلکہ احسان سے دیں۔

(معارف القرآن ۱۵۷/۴، سورہ اعراف پ ۹)

عرفات کی تعریف

''عرفات'' لفظاً جمع ہے، اور ایک خاص میدان کا نام ہے، جس کے حدود اربعہ معروف ومشہور ہیں، یہ میدان حرم سے خارج واقع ہوا ہے، حجاج کو اس میں پہونچنا اور زوال آفتاب سے مغرب تک یہاں قیام کرنا حج میں حج کا اہم ترین فرض ہے، جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور فدیہ نہیں ہوسکتا۔

عرفات کو عرفات کہنے کی بہت سی وجوہ بتلائی جاتی ہیں ان میں واضح یہ ہے کہ اس میدان میں انسان اپنے رب کی معرفت اور بذریعہ عبادت وذکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، نیز مشرق ومغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقع ملتا ہے۔ (معارف القرآن ج۱ ص ۴۸۸ سورہ بقرہ پ ۲)

عزت کی تعریف

’’عزت‘‘ کے معنیٰ ہیں قوت وغلبہ کے، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے اور مخلوق میں سے جس کسی کو بھی کوئی قوت وغلبہ ملتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، تو کس قدر بے عقلی ہوگی کہ عزت حاصل کرنے کے لئے اصل عزت کے مالک اور عزت دینے والے کو تو ناراض کیا جائے، اور اس کے دشمنوں کے ذریعہ عزت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ (معارف القرآن سورہ نساء پ۵، ص۵۸۲ ج۲)

عزم کی تعریف

عزم کے لفظی معنیٰ کسی کام کے لئے اپنے ارادہ کو مضبوط باندھنے کے ہیں، ’’عزم‘‘ کسی کام کے ارادہ پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ہیں۔

(معارف القرآن سورہ طٰہٰ پ۱۶، ص۱۴۳ ج۶)

عُشر وخراج کی تعریف

عشر وخراج شریعت اسلامی کے دو اصطلاحی لفظ ہیں، ان دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے زمینوں پر عائد کردہ ٹیکس کی ایک حیثیت ان دونوں میں ہے، فرق یہ ہے کہ عشر فقط ٹیکس نہیں بلکہ اس میں ٹیکس سے زیادہ اصلی حیثیت عبادت مالی کی ہے، مثل زکوٰۃ کے، اس لئے اس کو زکوٰۃ الارض بھی کہا جاتا ہے، اور خراج خالص ٹیکس ہے، جس میں عبادت کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمان چونکہ عبادت کے اہل اور پابند ہیں، ان سے جو زمین کی پیداوار کا حصہ لیا جاتا ہے اس کو عشر کہتے ہیں، اور غیر مسلم چونکہ عبادت کے اہل نہیں، ان کی زمینوں پر جو کچھ عائد کیا جاتا ہے اس کا نام خراج ہے، عملی طور پر زکوٰۃ اور عشر میں یہ بھی فرق ہے کہ سونا چاندی اور تجارت کے مال پر زکوٰۃ سال بھر گذرنے کے بعد عائد ہوتی ہے، اور عشر زمین سے

پیداوار حاصل ہوتے ہی واجب ہو جاتا ہے، دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اگر زمین سے کوئی پیداوار نہ ہو تو عشر ساقط ہو جاتا ہے، لیکن اموال تجارت اور سونے چاندی پر اگر کوئی نفع بھی نہ ہو تب بھی سال پورا ہونے پر ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی، عشر وخراج کے مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کتب فقہ میں مذکور ہے، اور احقر نے اپنی کتاب نظام الاراضی میں تفصیل سے لکھ دیا ہے، جس میں پاکستان و ہندوستان کی زمینوں کے خصوصی احکام بھی لکھے گئے ہیں۔ (معارف القرآن ص ۶۴۰، ج ۱، سورہ بقرہ، پ ۳)

عشر کی تعریف

لفظ عشر کے اصلی معنی دسواں حصہ ہے، مگر حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تفصیل واجبات شرعیہ کی بیان فرمائی ہے، اس میں عشری زمینوں کی بھی دو قسم قرار دی ہیں، ایک میں عشر یعنی دسواں حصہ پیداوار کا ادا کرنا فرض ہوتا ہے، اور دوسری میں نصف عشر یعنی بیسواں حصہ، لیکن فقہاء کی اصطلاح میں ان دونوں قسم پر عائد ہونے والی زکوٰۃ کو عشر ہی کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(جواہر الفقہ ۳/۳۳۵، رسالہ عشر وخراج)

عشر وعشری زمین کی تعریف

جو زمین مسلمانوں نے کفار سے جنگ کر کے فتح کی ہو اور فتح کر کے مسلمانوں میں تقسیم کر دی ہو وہ زمین عشری کہلاتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی جگہ کے کافر باشندے خود بخود ہی بغیر جنگ کے مشرف باسلام ہو گئے ہوں تو ان کی زمین بھی عشری کہلاتی ہے۔

لیکن اگر وہ زمین جنگ کر کے فتح نہیں کی گئی بلکہ بغیر جنگ کئے صرف صلح سے فتح ہو گئی اور زمین ان کے کافر مالکوں ہی کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی تو وہ زمین

عشری نہیں۔

اسی طرح اگر وہ زمین جنگ کر کے فتح تو کی ہے لیکن مسلمانوں میں تقسیم نہیں کی گئی بلکہ وہیں کے کافر باشندوں کی ملکیت میں رہنے دی تو وہ زمین بھی عشری نہیں۔

اگر عشری زمین کوئی کافر خرید لے تو وہ عشری نہیں رہتی، پھر اگر اس سے مسلمان خرید لے یا کسی اور طریقہ سے مسلمان کو مل جائے تب بھی وہ عشری نہ ہوگی، لہٰذا اس پر عشر واجب نہ ہوگا۔ (احکام زکوۃ، جواہر الفقہ ۲۴۹/۳-۲۵۰)

عُصبہ (جماعت) کی تعریف

عُصبہ کے معنیٰ جماعت کے ہیں جو دس سے چالیس تک ہو، اس سے کم وبیش کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ (معارف القرآن سورہ نور پ ۱۸، ص ۳۷۵ ج ۶)

عصبات، ذوی الفروض، ذوی الارحام کی تعریف

اُولُوا الاَرحَام مطلقاً اقرباء اور رشتہ داروں کے لئے بولا جاتا ہے، ان میں سے خاص خاص رشتہ داروں کے حصہ تو خود قران کریم نے سورہ نساء میں متعین فرمادیئے جن کو علمِ میراث کی اصطلاح میں اہلِ فرائض یا ذوی الفروض کہا جاتا ہے ان کو دینے کے بعد جو مال بچے وہ اس آیت کی رو سے دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہونا چاہئے، جس کا تفصیلی بیان احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس طرح موجود ہے کہ ذوی الفروض کے حصہ کے دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ میت کے عصبات یعنی جدی رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ دیا جائے یعنی عصبہ قریب کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے، اور اگر عصبات میں سے کوئی بھی زندہ موجود نہیں تو پھر باقی رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے۔

عصبات کے علاوہ جو دوسرے رشتہ دار ہوتے ہیں علمِ میراث وفرائض کی خاص

اصطلاح میں لفظ ذوی الارحام انہیں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے لیکن یہ اصطلاح بعد میں مقرر کی گئی ہے قرآن کریم میں **اُولُو الاَرحَام** کا لفظ لغوی معنی کے مطابق تمام رشتہ داروں پر حاوی ہے جس میں ذوی الفروض اور عصبات اور ذوی الارحام سب اجمالی طور پر داخل ہیں، پھر اس کی تفصیل سورہ نساء کی کچھ آیات میں آ گئی جن میں خاص خاص رشتہ داروں کے حصے حق تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیئے جن کو اصطلاحِ میراث میں ذوی الفروض کہتے ہیں، اور باقی کے متعلق رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا **الحقوا الفرائض باھلھا فمابقی فھو لاولیٰ رجل ذکر** (بخاری) یعنی جن کے حصہ قرآن نے مقرر کر دیئے ہیں وہ پورے ان کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ ان لوگوں کو دیئے جائیں جو میت سے قریب تر مرد ہوں ان کو اصطلاحِ میراث میں عصبات کہا جاتا ہے۔

اگر کسی میت کے عصبات میں کوئی موجود نہ ہو تو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق پھر دوسرے رشتہ داروں کو دیا جاتا ہے جن کو اصطلاح میں ذوی الارحام کہا جاتا ہے، جیسے ماموں، خالہ، وغیرہ۔ (معارف القرآن ۳۰۰/۴، سورہ انفال، پ ۱۱)

عفو کی تعریف

خُذِ الْعَفْوَ (اعراف پ ۹) عربی لغت کے اعتبار سے لفظ عفو کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، اور اس موقع پر ہر معنی کی گنجائش ہے، اسی لیے علماء تفسیر کی مختلف جماعتوں نے مختلف معنی لیے ہیں، جمہور مفسرین نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ عفو کہا جاتا ہے ہر ایسے کام کو جو آسانی کے ساتھ بغیر کسی کلفت اور مشقت کے ہو سکے، تو معنی اس جملہ کے یہ ہوئے کہ آپ قبول کر لیا کریں اس چیز کو جو لوگ آسانی سے کر سکیں، یعنی واجبات شرعیہ میں آپ لوگوں سے اعلیٰ معیار کا مطالبہ نہ کریں بلکہ وہ جس پیمانہ پر آسانی سے عمل پیرا ہو سکیں اتنے ہی درجہ کو قبول کر لیا کریں، مثلاً نماز کی اصل حقیقت

تو یہ ہے کہ بندہ ساری دنیا سے منقطع اور یکسو ہوکر اپنے رب کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے اس لیے کھڑا ہے کہ حمد وثنا کے ساتھ اپنے معروضات کو بلا واسطہ بارگاہ الٰہی میں خود پیش کر رہا ہے، گویا وہ اس وقت براہ راست حق تعالیٰ شانہ سے مخاطب ہے، اس کے جو آثار خشوع، خضوع ادب واحترام کے ہونا چاہئیں ظاہر ہے کہ لاکھوں نمازیوں میں سے کسی کسی اللہ کے بندے کو نصیب ہوتے ہیں، عام لوگ اس درجہ کو نہیں پا سکتے، تو اس آیت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دی کہ آپ ان لوگوں سے اس اعلیٰ معیار کا مطالبہ ہی نہ رکھیں بلکہ جس درجہ کو وہ آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں وہ ہی قبول فرمالیں، اسی طرح دوسری عبادات زکوۃ، روزہ، حج اور عام معاملات ومعاشرت کے واجبات شرعیہ میں جو لوگ پورا پورا حق ادا نہیں کر سکتے اس سے سرسری اطاعت وفرمانبرداری ہی کو قبول کرلیا جائے۔

صحیح بخاری میں بروایت عبداللہ بن زبیرؓ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت کے یہی معنی نقل کیے گئے ہیں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے پر فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اعمال واخلاق میں سرسری اطاعت قبول کرنے کا حکم دیا ہے، میں نے عزم کرلیا ہے کہ جب تک میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں ایسا ہی عمل کروں گا۔ (ابن کثیر)

ائمہ تفسیر کی ایک بڑی جماعت حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیرؓ، صدیقہ عائشہ اور مجاہدؒ وغیرہ نے اس جملہ کے بھی یہی معنی قرار دیئے ہیں۔

دوسرے معنی عفو کے معافی اور درگزر کرنے کے بھی آتے ہیں، علماء تفسیر کی ایک جماعت نے اس جگہ یہی معنی مراد لے کر اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ آپ گناہگاروں اور خطا کاروں کے گناہ وقصور کو معاف کر دیا کریں۔

امام تفسیر ابن جریر طبری نے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین سے آیت کا مطلب پوچھا، جبریل امین نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنے کے بعد یہ مطلب بتلایا کہ اس آیت میں آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص آپ پر ظلم کرے آپ اس کو معاف کردیں اور جو آپ کو کچھ نہ دے آپ اس پر بخشش کریں، جو آپ سے تعلق قطع کرے آپ اس سے بھی ملا کریں۔ (معارف القرآن ۱۵۶/۴، سورہ اعراف پ ۹)

عقبۃ کی تعریف

عقبۃ پہاڑ کے حصہ کو کہا جاتا ہے، اس جگہ (سورہ توبہ آیت میں) وہ عقبہ مراد ہے جو منیٰ میں جمرہ عقبہ کے ساتھ پہاڑ کا حصہ ہے، آج کل حجاج کی کثرت کے سبب پہاڑ کا یہ حصہ صاف کرکے میدان بنادیا گیا ہے، صرف جمرہ رہ گیا ہے، اس عقبہ پر مدینہ طیبہ کے حضرات سے تین مرتبہ بیعت لی گئی ہے۔ (معارف ۴۶۷/۴، توبہ)

عقد، عہد اور معاہدہ کی تعریف

اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ: (سورہ مائدہ پ ۶)

لفظ عقود عقد کی جمع ہے جس کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں، اور جو معاہدہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں بندھ جائے اس کو بھی عقد کہا جاتا ہے، اس لیے بمعنی عہود ہو گیا۔

امام تفسیر ابن جریر نے مفسرین صحابہ وتابعین کا اس پر اجماع نقل کیا ہے، امام جصاص نے فرمایا کہ عقد کہا جائے یا عہد ومعاہدہ، اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریق نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو، اور دونوں متفق ہوکر اس کے پابند ہوگئے ہوں، ہمارے عرف میں اسی کا نام معاہدہ ہے، اس لیے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہوگیا کہ باہمی معاہدات کا پورا کرنا لازم وضروری سمجھو۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ان معاہدات سے کون سے معاہدات مراد ہیں، اس میں

حضرات مفسرین کے اقوال بظاہر مختلف نظر آتے ہیں، کسی نے کہا ہے اس سے مراد وہ معاہدات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے ایمان وطاعت کے متعلق لیے ہیں، یا وہ معاہدات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نازل کئے ہوئے احکام حلال وحرام سے متعلق اپنے بندوں سے لیے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی منقول ہے اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے اس جگہ وہ معاہدات مراد ہیں جو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کرلیا کرتے ہیں، جیسے معاہدہ نکاح، معاہدہ بیع وشراء وغیرہ۔ مفسرین میں سے ابن زید اور زید بن اسلم اسی طرف گئے ہیں، اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے وہ حلف اور معاہدے مراد ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں ایک دوسرے سے باہمی امداد کے لیے لیا کرتے تھے، مجاہد، ربیع، قتادہ وغیرہ مفسرین نے بھی یہی فرمایا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں، بلکہ یہ سب قسم کے معاہدات لفظ عقود کے تحت میں داخل ہیں اور سبھی پورے کرنے کے لیے قرآن کریم نے ہدایت دی ہے۔

اسی لیے امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس لفظ کے حکم میں داخل ہیں، اور پھر فرمایا کہ اس کی ابتدائی تین قسمیں ہیں، ایک وہ معاہدہ جو انسان کا رب العالمین کے ساتھ ہے، مثلاً ایمان، طاعت کا عہد یا حلال و حرام کی پابندی کا عہد۔

دوسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا خود اپنے نفس کے ساتھ ہے، جیسے کسی چیز کی نذر اپنے ذمہ مان لے، یا حلف کر کے کوئی چیز اپنے ذمہ لازم کرلے۔

تیسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہے، اور اس تیسری قسم میں وہ تمام معاہدات شامل ہیں جو دو شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

حکومتوں کے بین العالمی معاہدات، یا باہمی سمجھوتے، جماعتوں کے باہمی عہد و میثاق اور دو انسانوں کے درمیان ہر طرح کے معاملات نکاح، تجارت، شرکت، اجارہ، ہبہ وغیرہ ان تمام معاہدات میں جو جائز شرطیں باہم طے ہو جائیں اس آیت کی رو سے ان کی پابندی ہر فریق پر لازم و واجب ہے۔ اور جائز کی قید اس لیے لگائی کہ خلاف شرع شرط لگانا یا اس کا قبول کرنا کسی کے لیے جائز نہیں۔

(معارف القرآن ۱۲/۳، سورہ مائدہ پ ٦)

عقلمند کی تعریف

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے مال و جائداد کے متعلق یہ وصیت کر کے مر جائے کہ میرا مال اس شخص کو دے دیا جائے جو سب سے زیادہ عقلمند ہو تو اس مال کے مصرف شرعی وہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے عبادت و طاعت میں مشغول ہوں، کیونکہ عقل کا تقاضا یہی ہے اور دنیا داروں میں سب سے زیادہ عقل والا وہی ہے، یہی مسئلہ فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب درّ مختار باب الوصیۃ میں مذکور ہے۔

(معارف القرآن ص ٦۵۴، ج ٦، سورہ قصص، پ ۲۰)

عمرہ کی تعریف

عمرہ کے لفظی معنی زیارت کے ہیں اور اصطلاح شرع میں مسجد حرام کی حاضری اور طواف و سعی کو کہا جاتا ہے۔ (معارف القرآن سورہ بقرہ ۴۰/۱)

عنکبوت کی تعریف

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ (پ ۲۰ سورہ عنکبوت)

عنکبوت مکڑی کو کہا جاتا ہے، اس کی مختلف قسمیں ہیں بعض ان میں زمین میں

گھر بناتی ہیں بظاہر وہ یہاں مراد نہیں، بلکہ مراد وہ مکڑی ہے جو جالا تانتی ہے اور اس میں معلق رہتی ہے، اس جالے کے ذریعہ مکھی کو شکار کرتی ہے، یہ ظاہر ہے کہ جانوروں کے جتنے قسم کے گھونسلے اور گھر معروف ہیں یہ جالے کے تار ان سب سے زیادہ کمزور ہیں کہ معمولی ہوا سے بھی ٹوٹ سکتے ہیں، اس آیت میں غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں اور ان پر اعتماد کرنے والوں کی مثال مکڑی کے اس جالے سے دی ہے جو کہ نہایت کمزور ہے اسی طرح جو لوگ اللہ کے سوا بتوں پر یا کسی انسان وغیرہ پر بھروسہ کرتے ہیں ان کا بھروسہ ایسا ہی ہے جیسا یہ مکڑی اپنے جالے کے تاروں پر بھروسہ کرتی ہے۔

مکڑی کو مارنے اور اس کے جالے صاف کر دینے کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں، بعض حضرات اس کو پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ جانور بوقت ہجرت غارِ ثور کے دہانے پر جالا تان دینے کی وجہ سے قابل احترام ہو گیا جیسا کہ خطیب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس کے قتل کی ممانعت نقل کی ہے، مگر ثعلبی نے اور ابن عطیہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی سے یہ روایت نقل کی ہے ''طَهِّرُوْا بُيُوْتَكُمْ مِنْ نَسْجِ الْعَنْكَبُوْتِ فَاِنَّ تَرْكَهٗ يُوْرِثُ الْفَقْرَ'' یعنی مکڑی کے جالوں سے اپنے مکانات کو صاف رکھا کرو، کیونکہ اس کے چھوڑ دینے سے فقر و فاقہ پیدا ہوتا ہے'' سنداً ان دونوں روایتوں کی قابل اعتماد نہیں، اور دوسری روایت کی دوسری احادیث سے تائید ہوتی ہے جن میں مکانات اور فناء دار کو صاف رکھنے کا حکم ہے۔ (روح المعانی، معارف القرآن ۶۹۳، ج ۶)

عہد کی تعریف

لفظ ''عہد'' ان تمام معاملات اور معاہدات کو شامل ہے جن کا زبان سے التزام کیا جائے، یعنی اس کی ذمہ داری لی جائے خواہ اس پر قسم کھائے یا نہ کھائے، خواہ وہ

کسی کام کے کرنے سے متعلق ہو یا نہ کرنے سے، لفظ ''عدل'' کے مفہوم میں ایفائے عہد بھی داخل ہے۔ (قرطبی)

(معارف القرآن سورہ نحل پ۱۴، ص۳۹۵ ج۵)

عہد اور وعدہ کا فرق

عہد اس قول کا نام ہے جو فریقین کے درمیان باہمی بات چیت سے طے ہوتا ہے، جس پر جانبین کو قائم رہنا ضروری ہوتا ہے، بخلاف وعدہ کے کہ وہ صرف جانبِ واحد سے ہوتا ہے، یعنی عہد عام ہے اور وعدہ خاص ہے۔

(معارف القرآن ص۹۴، ج۲، سورہ آل عمران پ۳)

غ

غِلظت (سختی) کی تعریف اور اس کی دو قسمیں

وَاغلُظ عَلَیھِم (سورہ توبہ، پ۱۰)

لفظ غِلظ کے اصلی معنیٰ یہ ہیں کہ مخاطب جس طرز عمل کا مستحق ہے اس میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے، یہ لفظ رأفت کے مقابل استعمال ہوتا ہے، جس کے معنیٰ رحمت اور نرم دلی کے ہیں۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس جگہ غِلظت استعمال کرنے سے عملی غلاظت مراد ہے کہ ان پر احکام شرعیہ جاری کرنے میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے، زبان اور کلام میں غلظت اختیار کرنا مراد نہیں کیونکہ وہ سنتِ انبیاء کے خلاف ہے، وہ کسی سے سخت کلامی اور سبّ وشتم نہیں کرتے اور رسول اللہ ﷺ کے حال میں تو خود حق تعالیٰ نے فرمایا وَلَو کُنتَ فَظّاً غَلِیظَ القَلبِ لَانفَضُّوا مِن حَولِکَ یعنی اگر آپ سخت کلام سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے، اور آنحضرت ﷺ کے تعامل میں بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ کفار ومنافقین سے گفتگو اور خطاب میں کبھی غلظت (سختی) اختیار فرمائی ہو۔

تنبیہ: افسوس کہ خطاب اور کلام میں غِلظت جس کو کفار کے مقابلے میں بھی اسلام نے اختیار نہیں کیا آج کل کے مسلمان دوسروں مسلمانوں کے بارے میں بے دھڑک استعمال کرتے ہیں اور بہت سے لوگ تو اس کو دین کی خدمت سمجھ کر خوش ہوتے ہیں، انا للہ۔

وَلیَجِدُوا فِیکُم غِلظَۃ (سورہ توبہ، پ۱۱)

غِلظت کے معنیٰ شدت وقوت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ کفار کے ساتھ برتاؤ میں ایسی صورت اختیار کرو کہ وہ کسی حیثیت سے تمہاری کمزوری محسوس نہ کریں۔

(معارف القرآن ص۴۹۴، ج۴، سورہ توبہ، پ۱۱)

غلول (خیانت) کی تعریف، خیانت اور عام چوریوں کا فرق

لفظ غلول مطلق خیانت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور خاص کر مال غنیمت کی خیانت کے لیے بھی، اور مال غنیمت میں چوری اور خیانت کا جرم عام چوریوں اور خیانتوں سے زیادہ اشد ہے، کیونکہ مال غنیمت میں پورے لشکر اسلام کا حق ہوتا ہے تو جس نے اس میں چوری کی اس نے سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی چوری کی، اگر کسی وقت اس کو تلافی کا خیال بھی آوے تو بہت مشکل ہے کہ سب کو ان کا حق پہنچائے یا معاف کرائے، بخلاف دوسری چوریوں کے کہ مال کا مالک معلوم و متعین ہے، کسی وقت اللہ نے توبہ کی توفیق دی تو اس کا حق ادا کر کے یا معاف کرا کر بَری ہوسکتا ہے، یہی وجہ تھی کہ ایک غزوہ میں ایک شخص نے اُون کا کچھ حصہ چھپا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا، مال غنیمت تقسیم ہونے کے بعد اس کو خیال آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا، آپؐ نے باوجود رحمۃ للعالمین ہونے اور امت پر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہونے کے اس کو یہ کہہ کر واپس کردیا کہ اب میں اس کو کس طرح سارے لشکر میں تقسیم کروں اب تو قیامت کے روز ہی تم اس کو لے کر حاضر ہوگے۔

اس لیے غلول کی سزا بھی عام چوریوں سے زیادا شد ہے کہ میدان حشر میں جہاں ساری مخلوق جمع ہوگی، سب کے سامنے اس کو اس طرح رسوا کیا جائے گا کہ جو مال چوری کیا تھا وہ اس کی گردن پر لدا ہوا ہوگا، صحیحین میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ

مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو ایسا نہ ہو کہ قیامت میں کسی کو اس طرح دیکھوں کہ اس کی گردن پر ایک اونٹ لدا ہوا ہو (اور یہ اعلان ہوتا ہو کہ اس نے مال غنیمت کا اونٹ چرایا تھا) وہ شخص اگر مجھ سے شفاعت کا طالب ہوگا تو میں اس کو صاف جواب دے دوں گا کہ میں نے حکم الٰہی پہنچا دیا تھا، اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔

اللہ بچائے یہ میدان حشر کی رسوائی ایسی ہوگی کہ بعض روایات میں ہے کہ جن کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا وہ تمنا کریں گے کہ ہمیں جہنم میں بھیج دیا جائے مگر اس رسوائی سے بچ جائیں۔

یہی حال مساجد، مدارس، خانقاہوں اور اوقاف کے اموال کا ہے، جس میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کا چندہ ہوتا ہے اگر معاف بھی کرائے تو کس کس سے معاف کرائے، اسی طرح حکومت کے سرکاری خزانے (بیت المال) کا حکم ہے کیونکہ اس میں پورے ملک کے باشندوں کا حق ہے، جو اس میں چوری کرے اس نے سب کی چوری کی، مگر چونکہ یہی اموال عموماً ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی شخص مالک نہیں ہوتا، نگرانی کرنے والے بے پروائی کرتے ہیں چوری کے مواقع بکثرت ہوتے ہیں اس لیے آج کل دنیا میں سب سے زیادہ چوری اور خیانت انہی اموال میں ہورہی ہے، اور لوگ اس کے انجام بد اور وبال عظیم سے غافل ہیں، کہ اس جُرم کی سزا علاوہ عذاب جہنم کے میدان حشر کی رسوائی بھی ہے، اور رسول اللہ کی شفاعت سے محرومی بھی۔ نعوذ باللہ منہ۔

(معارف القرآن ۲/۲۳۳، سورۂ آل عمران پ۴)

غلو فی الدین کی تعریف

''غلو'' کے لفظی معنیٰ حد سے نکل جانے کے ہیں، اور امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا: ''الغلو فی الدین ھو مجاوزۃ حدّ الحق فیہ ''یعنی دین

کے بارے میں غلو یہ ہے کہ دین میں جس چیز کی جو حد مقرر کی گئی اس سے آگے نکل جائے۔

غلو کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں، دین میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد و عمل میں دین نے جو حدود مقرر کی ہیں ان سے آگے بڑھ جائیں مثلاً انبیاء کی تعظیم کی حد یہ ہے کہ ان کو خلق خدا میں سب سے افضل جانے، اس حد سے آگے بڑھ کر انہی کو خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دینا اعتقادی غلو ہے۔ (معارف القرآن ۲۱۰/۳، سورہ بقرہ)

آیت مذکورہ میں ''لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ'' کے ساتھ لفظ ''غَیْرَ الْحَقِّ'' لایا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ناحق کا غلو مت کرو، یہ لفظ محققین اہل تفسیر کے نزدیک تاکید کے لیے استعمال ہوا ہے، کیونکہ غلو فی الدین ہمیشہ ناحق ہوتا ہے، اس میں حق ہونے کا احتمال ہی نہیں، اور علامہ زمخشری وغیرہ نے اس جگہ غلو کی دو قسمیں قرار دی ہیں، ایک ناحق اور باطل جس کی ممانعت اس جگہ کی گئی ہے، دوسرے حق اور جائز جس کی مثال میں انہوں نے علمی تحقیق و تدقیق کو پیش کیا ہے، جیسا کہ عقائد کے مسائل میں حضرات متکلمین کا اور فقہی مسائل میں فقہاء رحمہم اللہ کا طریق رہا ہے، ان کے نزدیک یہ بھی اگرچہ غلو ہے مگر غلو حق اور جائز ہے اور جمہور کی تحقیق یہ ہے کہ یہ غلو کی تعریف میں داخل ہی نہیں، قرآن وسنت کے مسائل میں گہری نظر اور موشگافی جس حد تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ وتابعین سے ثابت ہے وہ غلو نہیں اور جو غلو کی حد تک پہنچے وہ اس میں بھی مذموم ہے۔ (معارف القرآن ۹۹/۳، سورہ مائدہ پ ۶)

غلو فی الدین وہ تباہ کن چیز ہے جس نے پچھلی امتوں کے دین کو دین ہی کے نام پر برباد کر دیا ہے، اسی لیے ہمارے آقا و مولا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس وباء عظیم سے بچانے کے لیے مکمل تدبیریں فرمائیں۔

حدیث میں ہے کہ حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمی جمرات کے

لیے حضرت عبداللہ بن عباس کو فرمایا کہ آپ کے واسطے کنکریاں جمع کر لائیں۔ انہوں نے متوسط قسم کی کنکریاں پیش کر دیں، آپ نے ان کو بہت پسند فرما کر دو مرتبہ فرمایا: بِمِثْلِهِنَّ بِمِثْلِهِنَّ یعنی ایسی ہی متوسط کنکریوں سے جمرات پر رمی کرنا چاہیے پھر فرمایا:

"اِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّيْنِ فِاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِيْ دِيْنِهِمْ".

یعنی غلو فی الدین سے بچتے رہو کیونکہ تم سے پہلی امتیں غلو فی الدین ہی کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئیں۔

اس حدیث سے چند اہم مسائل معلوم ہوئے اول یہ کہ حج میں جو کنکریاں جمرات پر پھینکی جاتی ہیں ان کی حد مسنون یہ ہے جو متوسط ہوں، نہ بہت چھوٹی ہوں، نہ بہت بڑی ہوں، بڑے بڑے پتھر اٹھا کر پھینکنا غلو فی الدین میں داخل ہے۔

دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی حد شرعی وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے متعین فرما دی اس سے تجاوز کرنا غلو ہے۔

تیسرے یہ واضح ہو گیا کہ غلو فی الدین کی تعریف یہ ہے کہ کسی کام میں اس کی حد مسنون سے تجاوز کیا جائے۔ (معارف القرآن ۲/۶۱۹، ۶۲۰ سورہ نساء)

غَمْرہ کی تعریف

غمرہ ایسے گہرے پانی کو کہتے ہیں جس میں آدمی ڈوب جائے اور جو اس میں داخل ہونے والے کو اپنے اندر چھپا لے اسی لئے لفظ غمرہ پردہ اور ہر ڈھانپ لینے والی چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ (معارف القرآن ۳۲۱، ج ۶، سورہ مومنون پ ۱۸)

غنیمت اور فیٔ کی تعریف

لفظ غنیمت لغت میں اس مال کو بولا جاتا ہے جو دشمن سے حاصل کیا جائے، اصطلاحِ شریعت میں غیر مسلموں سے جو مال جنگ و قتال اور قہر و غلبہ کے ذریعہ حاصل

ہواس کو غنیمت کہتے ہیں، اور جو صلح ورضامندی سے حاصل ہو جیسے جزیہ وخراج وغیرہ اس کو فیٔ حق کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں ان ہی دونوں لفظوں سے ان دونوں قسموں کے احکام بتلائے گئے ہیں، سورہ انفال میں مالِ غنیمت کے احکام کا ذکر ہے جو جنگ وقتال کے وقت غیر مسلموں سے حاصل ہو۔ (معارف القرآن ۲۳۷، ج ۴، سورہ انفال، پ ۱۰)

غول کی تعریف

لَا فِيْهَا غَوْلٌ (صٰفّٰت، پ ۲۳)

غولٌ کے معنیٰ کسی نے ''دردِ سر'' بیان کئے ہیں، کسی نے ''پیٹ کا درد'' کسی نے ''بدبو اور گندگی'' اور کسی نے ''عقل کا بہک جانا'' درحقیقت لفظ غول ان سبھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں غَولٌ آفت کے معنیٰ میں ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جنت کی شراب میں ایسی کوئی آفت نہیں ہوگی جیسی دنیا کی شرابوں میں پائی جاتی ہیں، نہ دردِ سر ہوگا، نہ دردِ شکم، نہ بدبو کا بھبکارہ، نہ عقل کا بہک جانا۔

(تفسیر ابن جریر، معارف القرآن ص ۴۳۶، ج ۷، صفّٰت)

غویٰ اور غوایت کی تعریف

غویٰ دو معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک معنیٰ زندگی تلخ ہو جانے اور عیش خراب ہو جانے کے ہیں، دوسرے معنیٰ گمراہ ہو جانے یا غافل ہو جانے کے ہیں، ائمۂ تفسیر قشیری اور قرطبی وغیرہ نے اس جگہ لفظ غویٰ کے پہلے معنیٰ ہی کو اختیار کیا ہے، اور مراد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جو عیش جنت میں حاصل تھا وہ نہ رہا، زندگی تلخ ہو گئی۔

(معارف القرآن سورہ طٰہٰ پ ۱۶، ص ۱۵۸ ج ۶)

غیب کی تعریف

یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (سورہ بقرہ پ ۱)

لفظ غیب لغت میں ایسی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں اور نہ انسان کے حواس خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں، یعنی نہ وہ آنکھ سے نظر آئیں، نہ کان سے سنائی دیں، نہ ناک سے سونگھ کر یا زبان سے چکھ کر ان کا علم ہوسکے اور نہ ہاتھ سے چھو کر ان کو معلوم کیا جا سکے، قرآن میں لفظ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور ان کا علم بداہت عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات بھی آجاتی ہیں، تقدیری امور، جنت و دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنے والے واقعات بھی، فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیاء سابقین بھی جس کی تفصیل اسی سورہ بقرہ کے ختم پر آمَنَ الرَّسُوْلُ میں بیان کی گئی ہے، گویا یہاں ایمان مجمل کا بیان ہوا ہے، اور آخری آیت میں ایمان مفصل کا۔

تو اب ایمان بالغیب کے معنی یہ ہوگئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات لے کر آئے ہیں ان سب کو یقینی طور پر دل سے ماننا، شرط یہ ہے کہ اس تعلیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا قطعی طور پر ثابت ہو، جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے۔ (عقیدہ طحاوی، عقائد نسفی وغیرہ)

اس تعریف میں ماننے کا نام ایمان بتلایا گیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ محض جاننے کو ایمان نہیں کہتے، کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس و شیطان اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے۔

(معارف القرآن ص:۱۰۹ ج ۱ سورہ بقرہ پ ۱)

غیب کی تعریف اور مفاتیح الغیب کا مطلب

وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ الخ. (انعام پ۷)

لفظ مفاتح جمع ہے اس کا مفرد بفتح میم بھی ہوسکتا ہے، جو خزانہ کے لیے بولا جاتا ہے اور بکسر میم بھی ہوسکتا ہے، جس کے معنی ہیں کنجی، لفظ مفاتح میں دونوں معنی کی گنجائش ہے، اس لیے بعض مفسرین اور مترجمین نے اس کا ترجمہ خزانوں سے کیا ہے، اور بعض نے کنجیوں سے، اور حاصل دونوں کا ایک ہی ہے، کیونکہ کنجیوں کا مالک ہونے سے بھی خزانوں کا مالک ہونا مراد ہوتا ہے۔

لفظ غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں، یا وجود میں تو آ چکی ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیا۔ (مظہری)

پہلی قسم کی مثال وہ تمام حالات و واقعات ہیں جو قیامت سے متعلق ہیں، یا کائنات میں آئندہ پیش آنے والے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً یہ کہ کون، کب اور کہاں پیدا ہوگا، کیا کیا کام کرے گا، کتنی عمر ہوگی، عمر میں کتنے سانس لے گا، کتنے قدم اٹھائے گا، کہاں مرے گا، کہاں دفن ہوگا، رزق کس کو کتنا اور کس وقت ملے گا بارش کس وقت، کہاں اور کتنی ہوگی۔

اور دوسری قسم کی مثال وہ حمل ہے جو عورت کے رحم میں وجود تو اختیار کر چکا ہے مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی، خوب صورت ہے یا بدصورت، نیک طبیعت ہے یا بد خصلت، اسی طرح اور ایسی چیزیں جو وجود میں آ جانے کے باوجود مخلوق کے علم و نظر سے غائب ہیں۔

''وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ '' کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کے پاس ہیں خزانے غیب کے، اس کے پاس ہونے سے مراد اس کی ملک اور قبضہ میں ہونا ہے، مطلب یہ ہوا کہ

غیب کے خزانوں کا علم بھی اس کے قبضہ میں ہے، اور ان کو وجود وظہور میں لانا بھی اسی کی قدرت میں ہے کہ کب کب اور کتنا کتنا وجود میں آئے گا جیسا کہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں مذکور ہے "وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ اِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُوْم "یعنی ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں مگر ہم ہر چیز کو ایک خاص انداز سے نازل کرتے ہیں۔

(معارف القرآن ص: ۳۴۵، سورہ انعام پ ۷)

غیبت کی تعریف

غیبت کرنا یعنی اس کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو وہ سنتا تو اس کو ایذاء ہوتی اگرچہ وہ سچی بات ہی ہو، کیونکہ جو غلط الزام لگائے وہ تہمت ہے جس کی حرمت الگ قرآن کریم سے ثابت ہے۔

اور غیبت کی تعریف میں اس شخص کی غیر موجودگی کی قید سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موجودگی کی حالت میں ایسی رنج دہ بات کہنا جائز ہے کیونکہ وہ غیبت تو نہیں مگر لمز میں داخل ہے جس کی حرمت اس سے پہلی آیت میں آ چکی ہے۔

(معارف القرآن ۱۲۱/۸، سورۂ حجرات)

ف

فاحشہ کی تعریف

یَا نِسَاءَ النَّبِی مَنْ یَّأتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَیِّنَةٍ۔(سورہ احزاب پ۲۲)

لفظ "فاحشہ" عربی زبان میں بدکاری اور زنا وغیرہ کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور مطلق معصیت اور گناہ کے لیے بھی، یہ لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔

اس آیت میں فاحشہ کے لفظ سے بدکاری اور زنا مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب پیغمبروں کی ازواج کو اس سخت عیب سے بری فرمایا ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی ازواج میں کسی سے بھی ایسا فعل صادر نہیں ہوا۔

حضرت لوط اور نوح علیہما السلام کی بیویاں ان کے دین سے منحرف ہوئیں اور سرکشی اختیار کی جس کی سزا ان کو ملی، لیکن بدکاری کا الزام ان میں بھی کسی پر نہیں تھا، ازواج مطہرات میں سے کسی سے بے حیائی و بدکاری کے صدور کا تو احتمال ہی نہ تھا اس لیے اس آیت میں فاحشہ سے مراد عام گناہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء و تکلیف ہے۔ (معارف القرآن ۱۳۰/۷، سورہ احزاب)

فاسق اور فسوق کی تعریف

فسق کے لفظی معنیٰ خروج اور باہر نکل جانے کے ہیں، اصطلاح شرع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو فسق کہتے ہیں، اور اطاعت الٰہیہ سے نکل جانا، کفر

وانکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور عملی نافرمانی کے ذریعہ بھی، اس لئے لفظ فاسق کافر کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآن کریم میں بیشتر لفظ فاسقین کافروں ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، اور مومن گنہگار کو بھی فاسق کہا جاتا ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ فاسق اِسی معنیٰ کیلئے استعمال ہوا ہے۔ اور فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی قسیم قرار دیا گیا ہے، جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے، اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنالے وہ فقہاء کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے۔ (مظہری) اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علانیہ جرأت کے ساتھ کرتا پھرے اس کو فاجر کہا جاتا ہے۔ (معارف القرآن ج ا ص ۱۶۸ سورہ بقرہ پ ۲)

فسوق کے لفظی معنیٰ خروج کے ہیں، اصطلاح قرآن میں عدول حکمی اور نافرمانی کو فسوق کہا جاتا ہے، جو اپنے عام معنیٰ کے اعتبار سے سب گناہوں کو شامل ہے، اس لئے بعض حضرات نے اس جگہ عام معنیٰ ہی مراد لئے ہیں، مگر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اس جگہ فسوق کی تفسیر محظورات احرام سے فرمائی ہے، یعنی وہ کام وہ حالت احرام میں ممنوع اور ناجائز ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کے مناسب یہی تفسیر ہے، کیونکہ عام گناہوں کی ممانعت احرام کے ساتھ خاص نہیں، ہر حال میں حرام ہیں۔ (معارف القرآن ج ا ص ۴۸۴ سورہ بقرہ پ ۲)

فترت کی تعریف

عَلٰی فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ. (مائدہ پ ۶)

فترت کے لفظی معنی سست ہونے، ساکن ہونے اور کسی کام کو معطل اور بند کردینے کے آتے ہیں، اس آیت میں ائمہ تفسیر نے فترت کے یہی معنی بیان فرمائے ہیں، اور مراد اس سے کچھ عرصہ کے لیے سلسلۂ نبوت وانبیاء بند رہنا ہے جو حضرت عیسیٰ کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک کا زمانہ ہے۔

زمانۂ فترت کی تحقیق

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا زمانہ ہے، اس تمام مدت میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس میں کبھی فترت نہیں ہوئی، صرف بنی اسرائیل میں سے ایک ہزار انبیاء اس عرصہ میں مبعوث ہوئے، اور غیر بنی اسرائیل میں سے جو انبیاء ہوئے وہ ان کے علاوہ ہیں، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان صرف پانچ سو سال کا عرصہ ہے، اس میں سلسلۂ انبیاء بند رہا، اسی لیے اس زمانہ کو زمانہ فترت کہا جاتا ہے، اس سے پہلے کبھی اتنا زمانہ انبیاء کی بعثت سے خالی نہیں رہا۔ (قرطبی مع ایضاح، (معارف القرآن ۹۰/۳، سورہ مائدہ پ ۶)

فتنہ کی تعریف

وَاعلَمُوا اَنَّمَا اَموَالُکُم وَاَولَادُکُم فِتنَةٌ (سورہ انفال، پ۹)

فتنہ کے معنی امتحان کے بھی آتے ہیں، اور عذاب کے بھی اور ایسی چیزوں کو بھی فتنہ کہا جاتا ہے جو عذاب کا سبب بنیں، قرآن کریم کی مختلف آیتوں میں ان تینوں معنی کے لیے لفظ فتنہ آیا ہوا ہے، یہاں تینوں معنی کی گنجائش ہے، بعض اوقات مال واولاد خود بھی انسان کے لیے دنیا ہی میں وبال جان بن جاتے ہیں، اور ان کے سبب غفلت و معصیت میں مبتلا ہو کر سبب عذاب تو بالکل ظاہر ہے، اول یہ کہ مال واولاد کے ذریعہ تمہارا امتحان لینا مقصود ہے کہ یہ چیزیں ہمارے انعامات ہیں، تم انعام لے کر شکر گزار اور اطاعت شعار بنتے ہو یا ناشکرے اور نافرمان، دوسرے اور تیسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مال اور اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا تو یہی مال و اولاد تمہارے لیے عذاب بن جائیں گے، بعض اوقات تو دنیا ہی میں یہ چیزیں انسان کو سخت مصیبتوں میں مبتلا کر دیتی ہیں، اور دنیا ہی میں مال واولاد کو وہ عذاب محسوس

کرنے لگتے ہیں ورنہ یہ تو لازمی ہے کہ دنیا میں جو مال اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کمایا گیا یا خرچ کیا گیا وہ مال ہی آخرت میں اس کے لیے سانپ، بچھو اور آگ میں داغ دینے کا ذریعہ بن جائے گا، جیسا کہ قرآن کی متعدد آیات میں اور بے شمار روایات حدیث میں اس کی تصریحات موجود ہیں، اور تیسرے معنی یہ کہ یہ چیزیں سببِ عذاب بن جائیں، یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جب یہ چیزیں اللہ تعالیٰ سے غفلت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کا سبب بنیں تو عذاب کا سبب بن گئیں۔

(معارف القرآن ص ۲۱۴، ج ۴ سورہ انفال پ ۹)

اِنَّمَا اَموالُکُم وَاَولَادُکُم فِتنَۃٌ (سورہ تغابن، پ ۲۸)

فتنہ کے معنیٰ ابتلاء اور امتحان کے ہیں، مراد آیت کی یہ ہے کہ مال و اولاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسان کی آزمائش کرتا ہے کہ ان کی محبت میں مبتلا ہو کر احکام و فرائض سے غفلت کرتا ہے، یا محبت کو اپنی حد میں رکھ کر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ مال و اولاد کی محبت انسان کے لئے بڑا فتنہ اور آزمائش ہیں، انسان اکثر گناہوں میں خصوصاً حرام کمائی میں ان ہی کی محبت کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز بعض اشخاص کو لایا جائے گا اس کو دیکھ کر لوگ کہیں گے اَکَلَ عَیَالُہٗ حَسَنَاتِہٖ یعنی اس کی نیکیوں کو اس کے عیال نے کھالیا (روح) ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اولاد کے بارے میں فرمایا مَبخَلَۃٌ مَجبَنَۃٌ یعنی یہ بخل اور جبن یعنی نامردی اور کمزوری کے اسباب ہیں کہ ان کی محبت کی وجہ سے آدمی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے رُکتا ہے، ان ہی کی محبت کی وجہ سے جہاد میں شرکت سے رہ جاتا ہے، بعض سلفِ صالحین کا قول ہے اَلعَیَالُ سُوسُ الطَّاعَاتِ یعنی عیال انسان کی نیکیوں کے لئے گھن ہے، جیسا گھن غلّہ کو کھا جاتا ہے یہ اس کی نیکیوں کو کھا جاتے ہیں۔

(معارف القرآن ص ۴۷۰، ج ۸ سورہ تغابن پ ۲۸)

فحش اور فحشاء کے معنی اور اس کی دو قسمیں

قرآن وحدیث کی اصطلاح میں ہر ایسے برے کام کے لیے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں جس کی برائی اور فساد کے اثرات برے ہوں اور دور تک پہنچیں، امام راغب نے مفردات القرآن میں اور ابن اثیر نے نہایہ میں یہی معنی بیان فرمائے ہیں، قرآن کریم میں جا بجا فحش اور فحشاء کی ممانعت وارد ہوئی ہے ایک آیت میں ارشاد ہے ''یَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ'' ایک جگہ ارشاد ہے ''حَرَّمَ رَبِّيَ الۡفَوَاحِش''۔

فحش اور فحشاء کے اس مفہوم عام میں تمام بڑے گناہ داخل ہیں خواہ اقوال سے متعلق ہوں یا افعال سے، اور ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن اور قلب سے، بدکاری اور بے حیائی کے جتنے کام ہیں وہ بھی سب اس میں داخل ہیں، اسی لیے عام زبانوں پر یہ لفظ بدکاری کے معنی میں بولا جاتا ہے، قرآن کی اس آیت میں فواحش کے قریب جانے سے بھی روکا گیا ہے، اس کو اگر مفہوم عام میں لیا جائے تو تمام بری خصلتیں اور گناہ خواہ زبان کے ہوں خواہ ہاتھ پاؤں وغیرہ کے، اور خواہ دل سے متعلق ہوں سبھی اس میں داخل ہو گئے، اور اگر مشہور عام معنی بے حیائی کے لیے جاویں تو اس کے معنی بدکاری اور اس کے مقدمات اور اسباب مراد ہوں گے۔

پھر اسی آیت میں فواحش کی تفسیر میں یہ بھی فرما دیا ''مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَن'' پہلی تفسیر کے مطابق ظاہری فواحش سے زبان اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کے تمام گناہ مراد ہوں گے، اور باطنی فواحش سے مراد وہ گناہ ہوں گے جو دل سے متعلق ہیں، جیسے حسد، کینہ، حرص، ناشکری، بے صبری وغیرہ۔

اور دوسری تفسیر کے مطابق ظاہری فواحش سے مراد وہ بے حیائی کے کام ہوں گے جن کو علانیہ کیا جاتا ہے اور باطنی وہ جو چھپا کر کئے جاویں، کھلی بدکاری میں اس

کے مقدمات ولوازمات سب داخل ہیں، بدنیتی سے کسی عورت کی طرف دیکھنا، ہاتھ وغیرہ سے چھونا، اس سے اس طرح کی باتیں کرنا سب اس میں داخل ہیں، اور باطنی بے حیائی میں وہ خیالات اور ارادے اور ان کو پورا کرنے کی خفیہ تدبیریں داخل ہیں جو کسی بے حیائی اور بدکاری کے سلسلہ میں عمل میں لائی جائیں۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ظاہری فواحش سے وہ بے حیائی کے کام مراد ہیں جن کا برا ہونا عام طور پر مشہور و معلوم ہے اور سب جانتے ہیں اور باطنی فواحش سے مراد وہ افعال ہیں جو اللہ کے نزدیک بے حیائی کے کام ہیں، اگرچہ عام طور پر ان کو لوگ برا نہیں جانتے یا عام لوگوں کو ان کا حرام ہونا معلوم نہیں، مثلاً بیوی کو تین طلاق دینے کے بعد بیوی بنا کر رکھ چھوڑا، یا کسی ایسی عورت سے نکاح کرلیا جو شرعاً اس کے لیے حلال نہیں۔ (معارف القرآن ۴۸۵/۳، سورہ انعام پ ۸)

فرض کفایہ کی تعریف

فرض کفایہ شریعت میں ایسے ہی فرائض کو کہا جاتا ہے جن کی ادائیگی ہر فرد مسلم پر ضروری نہیں بلکہ بعض کا کرلینا کافی ہے اور عموماً قومی اور اجتماعی کام اسی درجہ میں ہیں، علوم دینیہ کی تعلیم وتبلیغ بھی ایسا ہی فرض ہے، کچھ لوگ اس میں مشغول اور وہ کافی بھی ہوں تو دوسرے مسلمان اس فریضہ سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، لیکن جہاں کوئی بھی مشغول نہ ہو تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔

نماز جنازہ اور تجہیز وتکفین بھی ایک قومی چیز ہے کہ ایک بھائی اپنے دوسرے مسلمان بھائی کا حق ادا کرتا ہے اور اس کا حکم بھی یہی ہے، مساجد اور مدارس اور دوسرے رفاہ عامہ کے کام سرانجام دینا اسی حکم میں داخل ہیں، یعنی بعض مسلمان کرلیں تو باقی سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

عام طور پر وہ احکام جو اجتماعی اور قومی ضرورتوں سے متعلق ہیں ان کو شریعتِ

اسلام نے فرض کفایہ ہی قرار دیا ہے تاکہ تقسیم عمل کے اصول پر تمام فرائض کی ادائیگی ہو سکے، کچھ لوگ جہاد کا کام انجام دیں کچھ تعلیم و تبلیغ کا کچھ دوسری اسلامی یا انسانی ضروریات مہیا کرنے کا۔ (معارف القرآن ۵۲۳/۲، سورہ نساء پ:۵)

فرض کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے چند افراد یا کسی جماعت نے ان ضرورتوں کو پوار کر دیا تو دوسرے مسلمان سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اگر کسی نے بھی نہ کیا تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔

(معارف القرآن ۹۷/۳، سورہ مائدہ پ:۶)

جو کام شخصی نہیں اجتماعی ہیں اور سب مسلمانوں پر ان کے پورا کرنے کی ذمہ داری ہے ان کو شریعت میں فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے تاکہ تقسیم کار کے اصول پر سب کام اپنی اپنی جگہ چلتے رہیں اور یہ اجتماعی فرائض سب ادا ہوتے رہیں، مسلمان مردوں پر نماز جنازہ اور اس کی تکفین، مساجد کی تعمیر و نگرانی، جہاد، اسلامی سرحدوں کی حفاظت یہ سب اسی فرض کفایہ کے افراد ہیں کہ ان کی ذمہ داری تو پورے عالم کے مسلمانوں پر ہے، اگر بقدر کفایت کچھ لوگ کر لیں تو دوسرے مسلمان بھی فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، اسی فرض کفایہ کے سلسلہ کا ایک اہم کام دینی تعلیم ہے۔

پورے قرآن مجید کے معانی و مسائل کو سمجھنا تمام احادیث کو سمجھنا اور ان میں معتبر اور غیر معتبر کی پہچان پیدا کرنا قرآن وسنت سے جو احکام و مسائل نکلتے ہیں ان سب کا علم حاصل کرنا اس میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و آثار سے واقف ہونا یہ اتنا بڑا کام ہے کہ پوری عمر اور سارا وقت اس میں خرچ کر کے بھی پورا حاصل ہونا آسان نہیں، اس لئے شریعت میں اس علم کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، کہ بقدر ضرورت کچھ لوگ یہ سب علوم حاصل کر لیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جائیں گے۔

(معارف القرآن ۴۹۰، ج۴، سوہ توبہ پ۱۱)

فرقان کی تعریف

فرقان قرآن کریم کا لقب ہے، لغوی معنی اس کے تمیز اور فرق کرنے کے ہیں، قرآن چونکہ اپنے واضح ارشادات کے ذریعہ حق و باطل میں تمیز اور فرق بتلاتا ہے اور معجزہ کے ذریعہ اہل حق و اہل باطل میں امتیاز کر دیتا ہے اس لیے اس کو فرقان کہا جاتا ہے۔

(معارف القرآن ۶/۴۴۵، سورہ فرقان پ: ۱۸)

فرقان اور فرق دونوں مصدر ایک ہی معنیٰ کے ہیں، محاورات میں فرقان اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو دو چیزوں میں واضح طور پر فرق اور فصل کر دے، اسی لئے فیصلہ کو فرقان کہتے ہیں، کیونکہ وہ حق و ناحق میں فرق واضح کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد کو بھی فرقان کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ اہل حق کو فتح اور ان کے مخالف کو شکست ہو کر حق و باطل کا فرق واضح ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں اسی معنیٰ کے لئے غزوۂ بدر کو یوم الفرقان کے نام سے موسوم کیا ہے۔

(معارف القرآن سورہ انفال پ ۹، ص ۲۱۸ ج ۴)

فزع اکبر اور نفخہ کی تعریف

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ فزع اکبر سے مراد صور کا نفخۂ ثانیہ ہے، اس سے سب مردے زندہ ہو کر حساب کے لئے کھڑے ہوں گے، بعض حضرات نے نفخۂ اولیٰ کو فزع اکبر قرار دیا ہے، ابن عربی کا قول یہ ہے کہ نفخات تین ہوں گے، پہلا نفخہ نفخۂ فزع ہوگا، اس سے ساری دنیا کے لوگ گھبرا اٹھیں گے، اسی کو یہاں فزع اکبر کہا گیا، اور دوسرا نفخہ نفخۂ صعق ہوگا، جس سے سب مر جائیں گے، اور فنا ہو جائیں گے، تیسرا نفخہ نفخۂ بعث ہوگا جس سے سب مردے زندہ ہو جائیں گے۔

(معارف القرآن سورہ انبیاء پ ۱۷، ص ۲۳۰ ج ۶)

فصل الخطاب کی تعریف

فصل الخطاب کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد زورِ بیان اور قوتِ خطابت ہے، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام اونچے درجہ کے خطیب ہیں، اور خطبوں میں حمد وصلوۃ کے بعد لفظ ''اما بعد'' سب سے پہلے انہوں نے ہی کہنا شروع کیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے بہترین قوت فیصلہ مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو جھگڑے چکانے اور تنازعات کا فیصلہ کرنے کی قوت عطا فرمائی تھی۔

(معارف القرآن ۷؍۴۹۷ پ۲۳ سورۂ ص)

فضول کی تعریف

فضول وہ ہے جو زینت مباح کے دائرہ سے بھی آگے ہو، اس کا حکم بھی ظاہر ہے کہ اس کے لیے احکام میں کوئی رعایت ہونے کے بجائے اس فضول کی مخالفت احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔　　(جواہر الفقہ ، اعضاء انسان کی پیوند کاری ۷؍۳۵)

فطرت کی تعریف

فطرت سے مراد اسلام ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اپنی فطرت اور جبلّت کے اعتبار سے مسلمان پیدا کیا ہے، اگر اس کو گرد و پیش اور ماحول میں کوئی خراب کرنے والا خراب نہ کردے تو ہر پیدا ہونے والا بچہ مسلمان ہی ہوگا، مگر عادۃً ہوتا یہ ہے کہ ماں باپ اس کو بعض اوقات اسلام کے خلاف چیزیں سکھا دیتے ہیں جس کے سبب وہ اسلام پر قائم نہیں رہتا، جیسا کہ صحیحین کی ایک حدیث میں مذکور ہے، قرطبی نے اسی قول کو جمہور سلف کا قول قرار دیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ فطرت سے مراد استعداد ہے، یعنی تخلیق انسانی میں اللہ تعالیٰ

نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ ہر انسان میں اپنے خالق کو پہچاننے اور اس کو ماننے کی صلاحیت و استعداد موجود ہے، جس کا اثر اسلام کا قبول کرنا ہوتا ہے بشرطیکہ اس استعداد سے کام لے۔ (معارف القرآن ۶/۷۴۷، سورہ روم پ ۲۱)

فقہ اور تفقّہ کی تعریف

علمِ دین سے مراد دین کی سمجھ پیدا کرنا ہے یہی لفظ تفقّہ کا ترجمہ ہے، اور یہ فقہ سے مشتق ہے۔

فقہ کے معنیٰ سمجھ بوجھ ہی کے ہیں، امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فقہ کی تعریف یہ کی ہے کہ انسان ان تمام کاموں کو سمجھ لے جن کا کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اور ان تمام کاموں کو بھی سمجھ لے جن سے بچنا اس کے لئے ضروری ہے، آج کل جو علم فقہ مسائل جزئیہ کے علم کو کہا جاتا ہے یہ بعد کی اصطلاح ہے، قرآن وسنت میں فقہ کی حقیقت وہی ہے جو امام اعظمؒ نے بیان فرمائی ہے کہ جس شخص نے دین کی کتابیں سب پڑھ ڈالیں مگر یہ سمجھ بوجھ پیدا نہ کی، وہ قرآن وسنت کی اصطلاح میں عالم نہیں، اس تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ علم دین حاصل کرنے کا مفہوم قرآن کی اصطلاح میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے، وہ جن ذرائع سے حاصل ہو وہ ذرائع خواہ کتابیں ہوں یا اساتذہ کی صحبت سب اس نصاب کے اجزاء ہیں۔

(معارف القرآن ص ۴۹۰، ج ۴، سورہ توبہ، پ ۱۱)

فقیر اور مسکین کی تعریف

فقیر اور مسکین کے اصلی معنی میں اگرچہ اختلاف ہے ایک کے معنی ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو، دوسرے کے معنی ہیں جس کے پاس نصاب سے کم ہو، لیکن حکم زکوۃ میں دونوں یکساں ہیں، کوئی اختلاف نہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کے

پاس اس کی ضروریات اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال نہ ہواس کوزکوٰۃ دی جاسکتی ہے، اوراس کے لیے زکوۃ لینا بھی جائز ہے، ضروریات میں رہنے کا مکان استعمالی برتن اور کپڑے اور فرنیچر وغیرہ سب داخل ہیں، نصاب یعنی سونا ساڑھے سات تولہ یا چاندی ساڑھے باون تولہ یااس کی قیمت جس کے پاس ہواوروہ قرض دار بھی نہ ہو، نہ اس کوزکوٰۃ لینا جائز ہے نہ دینا۔اسی طرح وہ شخص جس کے پاس کچھ چاندی یا کچھ پیسے نقد ہیں اور تھوڑا سا سونا ہے تو سب کی قیمت لگا کر اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو وہ بھی صاحب نصاب ہے، اس کوزکوۃ دینا اور لینا جائز نہیں، اور جو شخص صاحب نصاب نہیں مگر تندرست، قوی اور کمانے کے قابل ہے اور ایک دن کا گذارہ اس کے پاس موجود ہے اس کو اگر چہ زکوٰۃ دینا جائز ہے مگر یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے، اس میں بہت سے لوگ غفلت برتتے ہیں، سوال کرنا ایسے لوگوں کے لیے حرام ہے ایسا شخص جو کچھ سوال کر کے حاصل کرتا ہے اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کا انگارہ فرمایا ہے۔

(ابوداؤد، بروایت علیؓ، قرطبی)

حاصل یہ ہے کہ فقیر اور مسکین میں زکوٰۃ کے باب میں کوئی فرق نہیں، البتہ وصیت کے حکم میں فرق پڑتا ہے کہ مساکین کے لیے وصیت کی ہے تو کیسے لوگوں کو دیا جائے، اور فقراء کے لیے ہے تو کیسے لوگوں کو دیا جائے، جس کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں، فقیر اور مسکین کے دونوں مصرفوں میں یہ بات قدرے مشترک ہے کہ جس کو مال زکوٰۃ دیا جائے، وہ مسلمان ہو اور حاجات اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال کا مالک نہ ہو۔ (معارف القرآن ۴/۳۹۶، سورۂ توبہ پ ۱۰)

فلاح کی تعریف

’’قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ‘‘ (سورہ مومنون پ ۱۸) لفظ فلاح قرآن وسنت میں

بکثرت استعمال ہوا ہے، اذان و اقامت میں پانچ وقت ہر مسلمان کو فلاح کی طرف دعوت دی جاتی ہے، فلاح کے معنی یہ ہیں کہ ہر مراد حاصل ہو اور ہر تکلیف دور ہو۔ (قاموس) یہ لفظ جتنا مختصر ہے اتنا ہی جامع ایسا ہے کہ کوئی انسان اس سے زیادہ کسی چیز کی خواہش کر ہی نہیں سکتا اور یہ ظاہر ہے کہ مکمل فلاح کہ ایک مراد بھی ایسی نہ رہے جو پوری نہ ہو، اور ایک بھی تکلیف ایسی نہ رہے جو دور نہ ہو یہ دنیا میں کسی بڑے سے بڑے انسان کے بس میں نہیں چاہے دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ ہفت اقلیم ہو یا سب سے بڑا رسول اور پیغمبر ہو، اس دنیا میں کسی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ کوئی چیز خلاف طبع پیش نہ آئے اور جو خواہش جس وقت دل میں پیدا ہو بلا تاخیر پوری ہو جائے، اگر اور بھی کچھ نہیں تو ہر نعمت کے لیے زوال اور فنا کا کھٹکا اور ہر تکلیف کے واقع ہو جانے کا خطرہ، اس سے کون خالی ہو سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فلاح کامل تو ایسی چیز ہے جو اس ملک دنیا میں دستیاب ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ دنیا تو دار التکلیف والمحنت بھی ہے اور اس کی کسی چیز کو بقاء و قرار بھی نہیں، یہ متاع گرانمایہ ایک دوسرے عالم میں ملتی ہے جس کا نام جنت ہے، وہ ہی ایسا ملک ہے جس میں انسان کی ہر مراد ہر وقت بلا انتظار حاصل ہوگی، **وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ**، (یعنی ان کو ملے گی ہر وہ چیز جو وہ چاہیں گے) اور وہاں کسی ادنی رنج و تکلیف کا گزر نہ ہوگا۔ (معارف القرآن ۶/۲۸۲، سورہ مومنون پ:۱۸)

فواحش کی تعریف

''فواحش'' کا لفظ ان کاموں کے لیے بولا جاتا ہے جن میں بے حیائی ہو، جیسے کہ زنا اور اس کے مقدمات، نیز وہ اعمال بد جو ڈھٹائی کے ساتھ علانیہ کئے جائیں وہ بھی فواحش کہلاتے ہیں کہ ان کا وبال بھی نہایت شدید اور پورے انسانی معاشرہ کو خراب کرنے والا ہے۔

کبیرہ گناہوں میں سب ہی گناہ داخل تھے، ان میں سے فواحش کو الگ کر کے بیان فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ فواحش کا گناہ عام کبیرہ گناہوں سے زیادہ سخت بھی ہے اور وہ ایک مرض متعدی ہوتے ہیں جس سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔

(معارف القرآن سورہ شوریٰ ۷/۷۰۴)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت فواحش کے اصل مفہوم کے اعتبار سے تمام ظاہری اور باطنی گناہوں کو اور مشہور عام مفہوم کے اعتبار سے بدکاری و بے حیائی کے جتنے طریقے کھلے یا چھپے ہوئے ہیں ان سب کو شامل ہے، اور حکم اس میں یہ دیا گیا ہے کہ ان چیزوں کے پاس بھی نہ جاؤ، پاس نہ جانے سے مراد یہ ہے کہ ایسی مجلسوں اور ایسے مقامات سے بھی بچو جہاں جا کر اس کا خطرہ ہو کہ ہم گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے، اور ایسے کاموں سے بھی بچو جن سے ان گناہوں کا راستہ نکلتا ہو، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ حَامَ حَوْلَ حِمیً أَوْشَکَ أَنْ یَقَعَ فِیْهِ.

ترجمہ: یعنی جو شخص کسی ممنوع جگہ کے گرد گھومتا ہے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ اس میں داخل بھی ہو جائے۔

اس لئے احتیاط کا مقتضیٰ یہی ہے کہ جس جگہ داخلہ ممنوع ہو اس جگہ کے ارد گرد بھی نہ پھرے۔ (معارف القرآن ج ۳/ ۴۸۶، انعام: پ ۸)

فواکہ کی تعریف

فواکہ، فَاکِہَۃٌ کی جمع ہے اور عربی میں فاکہۃ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بھوک کی ضرورت رفع کرنے کے لئے نہیں، بلکہ لذت حاصل کرنے کے لئے کھائی جائے، اُردو میں اس کا ترجمہ ''میوہ'' اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ میوہ بھی لذت حاصل کرنے کے لئے کھایا جاتا ہے، ورنہ درحقیقت ''فَاکِہَۃٌ'' کا مفہوم میوہ کے مفہوم سے زیادہ

عام ہے۔

امام رازیؒ نے اسی فَوا کِہہ کے لفظ سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جنت میں جتنی غذائیں دی جائیں گی وہ سب لذت بخشنے کے لئے دی جائیں گی، بھوک کی حالت رفع کرنے کے لئے نہیں، اس لئے کہ جنت میں انسان کو حاجت کسی چیز کی نہیں ہوگی وہاں اسی اپنی زندگی برقرار رکھنے یا حفظانِ صحت کے لئے بھی کسی غذا کی ضرورت نہیں ہوگی، ہاں خواہش ہوگی، اس خواہش کے پورا ہونے سے لذّت حاصل ہوگی، اور جنت کی تمام نعمتوں کا مقصد لذّت عطا کرنا ہوگا (تفسیر کبیر ص ۹۸، ج ۷)

(معارف القرآن ۴۳۵، ج ۷، صٓفٰت، پ ۲۳)

فی سبیل اللہ کی تعریف

لفظ فی سبیل اللہ کے لفظی معنیٰ بہت عام ہیں، جو جو کام اللہ کی رضا جوئی کے لئے کئے جائیں وہ سب اس عام مفہوم کے اعتبار سے فی سبیل اللہ میں داخل ہیں، جو لوگ رسول کریم ﷺ کی تفسیر و بیان اور ائمہ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر محض لفظی ترجمہ کے ذریعے قرآن سمجھنا چاہتے ہیں یہاں ان کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ لفظ فی سبیل اللہ دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کر دیا جو کسی حیثیت سے نیکی یا عبادت ہیں، مساجد، مدارس، شفاء خانوں، مسافر خانوں وغیرہ کی تعمیر کنویں اور پُل اور سڑکیں بنانا اور ان رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات ان سب کو انہوں نے فی سبیل اللہ میں داخل کر کے مصرفِ زکوٰۃ قرار دے دیا، جو سراسر غلط ہے، اور اجماعِ امت کے خلاف ہے، صحابہ کرام جنہوں نے قرآن کو براہِ راست رسول کریم ﷺ سے پڑھا اور سمجھا ہے ان کی اور ائمہ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں ان میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لئے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے ایک اونٹ کو فی سبیل اللہ وقف کردیا تھا تو حضور ﷺ نے اس کو فرمایا کہ اس اونٹ کو حجاج کے سفر میں استعمال کرو۔

امام ابن جریر، ابن کثیر قرآن کی تفسیر روایاتِ حدیث ہی سے کرنے کے پابند ہیں، ان سب نے لفظ فی سبیل اللہ کو ایسے مجاہدین اور حجاج کے لئے مخصوص کیا ہے جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو، اور جن حضرات فقہاء نے طالب علموں یا دوسرے نیک کام کرنے والوں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کیا ہے کہ وہ فقیر وحاجت مند ہوں۔

(معارف القرآن ص ۴۰۷، ج ۴، سورہ توبہ، پ ۱۰)

فیٔ اور غنیمت کی تعریف

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ (سورہ حشر، پ ۲۸)

لفظ ''افاء'' فیٔ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ لوٹنے کے ہیں اسی لئے دوپہر کے بعد جن چیزوں کا سایہ مشرق کی طرف لوٹتا ہے ان کو بھی فیٔ کہا جاتا ہے، اموال غنیمت جو کفار سے حاصل ہوتے ہیں ان سب کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے باغی ہوجانے کی وجہ سے ان کے اموال بحق سرکار ضبط ہوجاتے ہیں، اور ان کی ملکیت سے نکل کر پھر مالکِ حقیقی حق تعالیٰ کی طرف لوٹ جاتے ہیں اس لئے ان کے حاصل ہونے کو اَفاء کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، اس کا تقاضہ یہ تھا کہ کفار سے حاصل ہونے والے تمام قسم کے اموال کو فیٔ ہی کہا جاتا، مگر وہ مال جہاد وقتال کے ذریعے حاصل ہوا اس میں انسانی عمل اور جدوجہد کو بھی ایک قسم کا دخل ہے اس لئے اس کو تو لفظ غنیمت سے تعبیر فرمایا گیا، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ، لیکن جس کے حصول میں جہاد وقتال کی بھی کوئی ضرورت نہ پڑی اس کو لفظ فیٔ سے تعبیر فرمایا گیا۔

(معارف القرآن ۳۶۶، ج ۸، سورہ حشر، پ ۲۸)

ق

قاری کی تعریف

قُرّا قاری کی جمع ہے اُس زمانہ (یعنی عہد صحابہ) میں اس کو بھی کہا جاتا تھا جو تلاوت قرآن کی صحت وآداب کے ساتھ قرآن کا عالم بھی ہو۔ (معارف القرآن ۳۹، ج ۷، سورہ لقمان)

قانت کی تعریف

قانتین قانت کی جمع ہے، جس کے معنیٰ عابد کے ہیں، جو اپنی عبادت وطاعت پر مداومت کرتا ہے۔ (معارف القرآن سورہ تحریم، پ ۲۸، ص ۵۰۷، ج ۸)

قانع اور معترّ کی تعریف

قانع سے مراد وہ محتاج فقیر ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا، اپنی غربت اور فقر کے باوجود اپنی جگہ بیٹھ کر جو مل جائے اسی پر قناعت کرتا ہے، اور معترّ جو ایسے موقع پر جائے جہاں سے کچھ ملنے کی امید ہو، خواہ زبان سے سوال کرے یا نہ کرے۔

(معارف القرآن سورہ حج پ ۱۷، ص ۲۶۷ ج ۶)

قبیلہ کی تعریف

''قبیل'' کے معنیٰ جماعت اور جتھے کے ہیں، جو جماعت ایک خاندان کی شریک ہو اس کو قبیلہ کہتے ہیں اور عام جماعتوں کو قبیل کہا جاتا ہے۔

(معارف القرآن سورہ اعراف پ ۸، ص ۵۳۶ ج ۳)

قرابت ورشتہ داری کی تعریف

صحیح یہ ہے کہ لفظ ''اقربون'' ہر قسم کی قرابت اور رشتہ داری کو حاوی ہے خواہ وہ رشتہ باہمی ولادت کا ہو، جیسے اولاد اور ماں باپ ہیں، یا دوسری طرح کا جیسے عام خاندانی رشتوں میں یا وہ رشتے جو ازدواجی تعلق سے پیدا ہوئے ہیں، لفظ اقربون سب پر حاوی ہے۔ (معارف القرآن سورۂ نساء ۳۱۰/۲)

قرآن کریم کی تعریف

اصول فقہ میں قرآن کریم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ **ھو النظم والمعنی جمیعاً** یعنی قرآن نام ہے الفاظ اور معنی دونوں کا جس سے معلوم ہوا کہ اگر معانی قرآن کو الفاظِ قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ یا دوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں اگر چہ مضامین صحیح بالکل درست ہی ہوں۔ ان مضامین قرآنیہ کو بدلے ہوئے الفاظ میں اگر کوئی شخص نماز میں پڑھ لے تو نماز ادا نہ ہوگی اسی طرح وہ تمام احکام جو قرآن سے متعلق ہیں، اس پر عائد نہیں ہوں گے، قرآن کریم کی تلاوت کا جو ثواب احادیث صحیحہ میں وارد ہے وہ بدلی ہوئی زبان یا بدلے ہوئے الفاظ پر مرتب نہیں ہوگا، اور اسی لیے فقہاء امت نے قرآن کریم کا ترجمہ بلا متن قرآن کے لکھنے اور چھاپنے کو ممنوع قرار دیا ہے جس کو عرف میں اردو کا یا انگریزی کا قرآن کہہ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ درحقیقت جو قرآن اردو یا انگریزی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں ----- قرآن کریم کے جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں، اور الفاظِ قرآن کے ساتھ خاص خاص احکام شرعیہ بھی متعلق ہیں۔ (معارف القرآن سورۃ البقرۃ ۳۳۲/۱)

جمہور امت کا عقیدہ یہی ہے کہ قرآن نہ صرف الفاظِ قرآن کا نام ہے نہ صرف

معانی قرآن کا، اگر کوئی شخص قرآن ہی کے الفاظ مختلف جگہوں سے چن کر ایک عبارت بنا دے مثلاً کوئی یہ عبارت بنا لے **الحمدلله العزیز الرحیم الذی له ملک السمٰوت وَهُو رب العالمین خالق کل شیء وهوا لمستعان**، یہ سارے الفاظ قرآن ہی کے ہیں مگر اس عبارت کو کوئی قرآن نہیں کہہ سکتا۔

اسی طرح معانی قرآن جو کسی دوسری زبان میں بیان کئے جائیں وہ بھی قرآن نہیں، اسی وجہ سے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز میں فرض تلاوت کی وجہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ کسی زبان فارسی، اُردو، انگریزی میں پڑھ لینا بدون اضطرار کے کافی نہیں، بعض ائمہ سے جو اس میں توسع کا قول منقول ہے اُن سے بھی اپنے اس قول سے رجوع ثابت ہے۔

اسی طرح قرآن کا صرف ترجمہ کسی زبان میں بغیر عربی متن کے لکھا جائے تو اس کو اس زبان کا قرآن کہنا جائز نہیں، جیسے آج کل بہت سے لوگ صرف اردو ترجمہ قرآن کو اُردو کا قرآن، اور انگریزی کو انگریزی کا قرآن کہہ دیتے ہیں یہ ناجائز اور بے ادبی ہے، قرآن کو بغیر متن عربی کے کسی دوسری زبان میں بنام قرآن شائع کرنا اور اس کی خرید و فروخت سب ناجائز ہے اس مسئلہ کی پوری تفصیل احقر کے رسالہ ''**تحذیر الاخوان عن تغییر رسم القرآن**'' میں مذکور ہے۔

(معارف القرآن ۵۵۱، ۵۵۲، ج ۶، سورۃ الشعراء، پ ۱۹)

علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں کئی روایتیں نقل کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ سب آسمانی کتابوں کی اصل زبان عربی ہے، مگر قرآن کریم کے سوا دوسری کتابیں ملکی اور قومی زبانوں میں ترجمہ کر کے دی گئی ہیں، اس لئے ان کے معانی تو سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر الفاظ بدلے ہوئے ہیں یہ سب قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کے معانی کی طرح الفاظ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہوئے ہیں، اور شاید

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا جہاں جن وانس جمع ہو کر بھی قرآن کی ایک چھوٹی سورت بلکہ ایک آیت کی مثال نہیں بنا سکتے کیونکہ وہ معنوی اور لفظی حیثیت سے کلام الٰہی اور ایک صفت الٰہی ہے جس کی کوئی نقل نہیں اتار سکتا، معنوی حیثیت سے تو دوسری آسمانی کتابیں بھی کلامِ الٰہی ہے مگر ان میں شاید اصل عربی الفاظ کے بجائے ترجمہ ہونے ہی کی وجہ سے یہ دعویٰ کسی دوسری آسمانی کتاب نے نہیں کیا۔ ورنہ قرآن کی طرح کلامِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے ہر کتاب کی یکتائی اور بے مثال ہونا یقینی تھا۔

(معارف القرآن ص ۲۲۷، ج ۵، سورہ ابراہیم پ ۱۳)

قِران وتمتّع کی تعریف

اشہر حج میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ میقات سے ہی حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لے، اس کو اصطلاح حدیث میں قِران کہا گیا ہے، اس کا احرام حج کے احرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر ایام حج تک اس کو احرام ہی حالت میں رہنا پڑتا ہے۔

دوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھے اور مکہ مکرمہ پہونچ کر عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے، پھر آٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا احرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے اس کو اصطلاح حدیث میں تمتع کہا جاتا ہے، اور لفظی معنیٰ کے اعتبار سے لفظ تمتع دونوں صورتوں پر حاوی ہے، کیونکہ اس کے معنیٰ ہیں حج وعمرہ کو جمع کر کے نفع اٹھانا اور وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے، قُرآن کی آیت مذکورہ میں فمن تمتع اسی عام معنیٰ میں ہے۔

(معارف القرآن ج ۱ ص ۴۸۲ سورہ بقرہ پ ۲)

قربان کی تعریف

لفظ قربان عربی لغت کے اعتبار سے ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کو کسی کے قرب کا ذریعہ بنایا جائے، اور اصطلاح شرع میں اس ذبیحہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔

(معارف القرآن سورہ مائدہ پ ۶، ص۱۱۲ ج ۳)

قرض حسن کی تعریف

قرض حسن سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات وخیرات ہیں۔

(معارف القرآن ۳/ ۷۹، سورہ مائدہ پ ۶)

قَرن کی تعریف

لفظ ''قرن'' اس جماعت کو بھی کہا جاتا ہے جو ایک وقت اور ایک زمانہ میں مجتمع موجود ہو، اور زمانہ کے ایک طویل حصہ کو بھی جس کے بارے میں دس سال سے لے کر سو سال تک کے مختلف اقوال ہیں، مگر بعض واقعات وروایاتِ حدیث سے تائید اس کی ہوتی ہے کہ لفظ قرن سو سال کے لئے بولا جاتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن بُشر مازنی کو فرمایا تھا کہ تم ایک قرن زندہ رہو گے، اور وہ پورے ایک سو سال زندہ رہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچہ کو دعا دی کہ قرن بھر زندہ رہو، تو وہ پورے سو سال زندہ رہا، اکثر حضرات علماء نے حدیث خَيْرُ الْقُرُوْنَ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ، کا یہی مطلب قرار دیا ہے کہ ہر قرن کو سو سال مانا گیا۔

(معارف القرآن ج ۳/ ۲۸۵، انعام: پ ۷)

قسط کی تعریف

''قسط'' کے اصل معنیٰ انصاف واعتدال کے ہیں، اوراس جگہ قسط سے مراد وہ عمل ہے، جو افراط وتفریط سے خالی ہو، یعنی نہ اس میں کوتاہی ہو، نہ مقررہ حد سے تجاوز، جیسا کہ تمام احکام شرعیہ کا یہی حال ہے، اس لئے لفظ قسط کے مفہوم میں تمام عبادات، طاعات اوراحکام شرعیہ داخل ہیں۔

(معارف القرآن سورہ اعراف پ ۸، ص ۵۴۰ ج ۳)

قصاص کی تعریف

قصاص کے لفظی معنی مماثلت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لیے جائز ہے، اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں، قرآن مجید کی آیت میں عنقریب اسی سورت میں اس کی زیادہ وضاحت اس طرح کی ہے: فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ اورسورہ نحل کی آخری آیات میں وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ، اسی مضمون کے لیے آیا ہے۔

اسی لیے اصطلاح شرع میں قصاص کہا جاتا ہے قتل کرنے اور زخم لگانے کی اس سزا کو جس میں مساوات اور مماثلت کی رعایت کی گئی ہے۔

(معارف القرآن ۱/۴۳۵، سورۂ بقرہ پ ۲)

قطعی الثبوت وقطعی الدلالۃ کی تعریف

ثبوت کے اعتبار سے احکام اسلامیہ کی مختلف قسمیں ہوگئی ہیں۔ تمام اقسام کا اس بارے میں ایک حکم نہیں، کفر وارتداد صرف ان احکام کے انکار سے عائد ہوتا ہے جو قطعی الثبوت بھی ہوں اور قطعی الدلالت بھی۔

قطعی الثبوت ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ ان کا ثبوت قرآن مجید یا ایسی

احادیث سے ہو جن کے روایت کرنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر آج تک ہر زمانہ اور ہر قرن میں مختلف طبقات اور مختلف شہروں کے لوگ اس کثرت سے رہے ہوں کہ ان سب کا جھوٹی بات پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے (اسی کو اصطلاحِ حدیث میں تواتر اور ایسی احادیث کو احادیث متواترہ کہتے ہیں)۔

اور قطعی الدلالۃ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو عبارت قرآن مجید میں اس حکم کے متعلق واقع ہوئی ہے، یا حدیثِ متواتر سے ثابت ہوئی ہے، وہ اپنے مفہوم و مراد کو صاف صاف ظاہر کرتی ہو اس میں کسی قسم کی الجھن نہ ہو کہ جس میں کسی کی تاویل چل سکے۔

قطعیات وضروریاتِ دین کی تعریف

پھر اس قسم کے احکام قطعیہ اگر مسلمانوں کے ہر طبقہ خاص و عام میں اس طرح مشہور و معروف ہو جائیں کہ ان کا حاصل کرنا کسی خاص اہتمام اور تعلیم و تعلم پر موقوف نہ رہے بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو وراثۃً وہ باتیں معلوم ہو جاتی ہوں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا چوری، شراب خوری کا گناہ ہونا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا وغیرہ تو ایسے احکام قطعیہ کو ضروریاتِ دین کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، اور جو اس درجہ مشہور نہ ہوں وہ صرف قطعیات کہلاتے ہیں ضروریات نہیں۔

اور ضروریات اور قطعیات کے حکم میں یہ فرق ہے کہ ضروریاتِ دین کا انکار باجماع امت مطلقاً کفر ہے، ناواقفیت و جہالت کو اس میں عذر نہ قرار دیا جائے گا، اور نہ کسی کی تاویل سنی جائے گی۔

اور قطعیاتِ محضہ جو شہرت میں اس درجہ کو نہیں پہنچتے تو حنفیہ کے نزدیک اس

میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کوئی عامی آدمی بوجہ ناواقفیت و جہالت کے ان کا انکار کر بیٹھے تو ابھی اس کے کفر وارتداد کا حکم نہ کیا جائے گا، بلکہ پہلے اس کو تبلیغ کی جائے گی کہ یہ حکم اسلام کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت احکام میں سے ہے اس کا انکار کفر ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اپنے انکار پر قائم رہے تب کفر کا حکم کیا جائے گا۔

کما فی المسایرة والمسامرة لابن الهمام ولفظه واما ما ثبت قطعاً ولم يبلغ حد الضرورة كاستحقاق بنت الابن السدس مع البنت الصلبية باجماع المسلمين فظاهر كلام الحنفية الاكفار بجحده بانهم لم يشترطوا فی الإكفار سوى القطع فی الثبوت (الى قوله) ويجب حمله على ما اذا علم المنكر ثبوته قطعاً۔ (مسامرہ ص:۱۴۹)

اور جو حکم قطعی الثبوت تو ہو مگر ضرورت کی حد کو نہ پہنچا ہو (جیسے میراث میں اگر پوتی اور بیٹی حقیقی جمع ہوں تو پوتی کو چھٹا حصہ ملنے کا حکم اجماع امت سے ثابت ہے، سو ظاہر کلام حنفیہ کا یہ ہے کہ اس کے انکار کی وجہ سے کفر کا حکم کیا جائے کیونکہ انہوں نے قطعی الثبوت ہونے کے سوا اور کوئی شرط نہیں لگائی (الی قولہ) مگر واجب ہے کہ حنفیہ کے اس کلام کو اس صورت پر محمول کیا جائے کہ جب منکر کو اس کا علم ہو کہ یہ حکم قطعی الثبوت ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس طرح کفر وارتداد کی ایک قسم تبدیل مذہب ہے اسی طرح دوسری قسم یہ بھی ہے کہ ضروریاتِ دین اور قطعیاتِ اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کر دیا جائے یا ضروریات دین میں کوئی ایسی تاویل کی جائے جس سے ان کے معروف معانی کے خلاف معنی پیدا ہو جائیں اور غرض معروف بدل جائے، اور ارتداد کی اس قسم دوم کا نام قرآن کی اصطلاح میں الحاد ہے۔

(جواہر الفقہ ص:۲۲ ج۱)

قلب سلیم کی تعریف

قلب سلیم کے لفظی معنی درست دل کے ہیں، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ قلب ہے جو کلمۂ توحید کی گواہی دے اور شرک سے پاک ہو، یہی مضمون مجاہد، حسن بصری، سعید بن حبیب سے بعنوان مختلف منقول ہے، سعید بن مسیّب نے فرمایا کہ تندرست دل صرف مومن کا ہوسکتا ہے کافر کا دل بیمار ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے ''فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَرَضٌ''۔ (معارف القرآن سورہ شعراء پ۱۹، ۵۶/۶)

اِذۡ جَاءَ رَبَّهٗ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ: (سورہ صٰفّٰت ۸۴)

اس کے ٹھیٹھ لفظی معنی یہ ہیں کہ وہ آئے اپنے پروردگار کے پاس صاف دل لے کر اور پروردگار کے پاس آنے سے مراد ہے اللہ کی طرف رجوع کرنا اس کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اس کے ساتھ صاف دل کی قید لگا کر اشارہ کردیا گیا ہے کہ اللہ کی کوئی عبادت اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہے جب تک کہ عبادت کرنے والے کا دل غلط عقیدوں اور برے جذبات سے پاک نہ ہو، اگر غلط عقیدے کے ساتھ کوئی عبادت کی جائے تو خواہ عبادت گذار نے اس میں کتنی محنت اٹھائی ہو وہ قابل قبول نہیں۔ اسی طرح اگر عبادت کرنے والے کا اصل مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے دکھلاوا یا کوئی مادّی منفعت ہو تو وہ عبادت قابل تعریف نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رجوع الی اللہ ان تمام ملاوٹوں سے پاک تھا۔

(معارف القرآن سورہ صٰفّٰت ۴۴۷/۷)

قلائد کی تعریف

قلائد قلادہ کی جمع ہے، گلے کے ہار کو کہا جاتا ہے، جاہلیت عرب کی رسم یہ تھی کہ جو شخص حج کے لئے نکلتا تو اپنے گلے میں ایک ہار بطور علامت کے ڈال لیتا تھا، تاکہ

اس کو دیکھ کر لوگ سمجھ لیں کہ یہ حج کے لئے جارہا ہے، کوئی تکلیف نہ پہنچائیں، اسی طرح قربانی کے جانوروں کے گلے میں بھی اس طرح کے ہار ڈالے جاتے تھے، ان کو بھی قلائد کہتے ہیں۔ (معارف القرآن ۲۴۰، ج ۳، مائدہ، پ ۷)

قمار اور میسر واز لام کی تعریف

ہر وہ معاملہ جو نفع اور نقصان کے درمیان دائر اور مبہم ہو اصطلاح شرع میں قمار اور میسر کہلاتا ہے، اردو زبان میں اس کو ''جوا'' کہا جاتا ہے جیسے دو شخص آپس میں بازی لگائیں کہ تم آگے بڑھ گئے تو میں تم کو ایک ہزار روپیہ دوں گا، اور میں بڑھ گیا تو تمہیں ایک ہزار دینے پڑیں گے یا اس طرح کہ اگر آج بارش ہوگئی تو تم ایک ہزار روپیہ مجھے دینا اور اگر نہ ہوئی تو میں تم کو دوں گا۔

یا بند ڈبے ایک مقررہ قیمت مثلاً چار آنہ فی ڈبہ کے حساب سے فروخت کئے جائیں کسی ڈبہ میں پانچ روپیہ کی چیزیں ہوں اور کسی میں دو پیسے کی تو اس ابہام اور دائر بین النفع والضرر کی صورت میں اس کی خریداری قمار ہے، اس کی مختلف لاتعداد صورتیں ہوسکتی ہیں اور ہر زمانہ میں ہر خطہ میں مختلف طریقوں سے قمار کھیلا جاتا رہا ہے۔

عرب میں اس کا ایک خاص طریق تھا کہ قمار کے لیے دس تیر دس ناموں سے متعلق تھے اور تیر کے نام پر کچھ حصے ایک یا دو یا تین یا زیادہ مقرر تھے، بعض تیر بے نصیب جن پر کوئی حصہ مقرر نہ تھا ان تیروں کو رِلا ملا کر ایک ایک شخص کے نام سے ایک تیر کسی شخص سے اٹھواتے تھے، جس شخص کے نام پر جس قسم کا تیر نکل آیا، وہ ہی اس کا نصیب ہوتا تھا، اور اس تیر پر جتنے حصے مقرر تھے وہ ان کا مالک سمجھا جاتا تھا، اور جس شخص کے نام پر بے نصیب تیر نکلتا وہ بالکل محروم رہتا تھا، اس کے ساتھ عادت یہ تھی کہ ایک اونٹ ذبح کرکے اس کو ان تیروں کے مقررہ حصوں کے موافق تقسیم کرتے تھے اور جس شخص کے نام بے نصیب نکلتا ایک طرف تو وہ اونٹ کے گوشت

سے محروم رہتا تھا، دوسری طرف اونٹ کی قیمت بھی اسی کو ادا کرنا پڑتی تھی، اس خاص قسم کے قمار کو قرآن میں میسر اور ازلام کے نام سے موسوم فرمایا ہے، ''میسر'' وہ اونٹ جو قمار کے لیے ذبح کر کے تقسیم کیا جائے اور ''ازلام'' وہ تیر جن کے ذریعہ قمار کے حصوں کی مقدار متعین کی جائے، اس کے علاوہ خرید و فروخت میں بھی مختلف صورتیں قمار کی رائج تھیں جن کو بیع ملامسہ یا منابذہ وغیرہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور احادیث نبویہ میں ان کی حرمت وارد ہوئی ہے۔

اسلام سے پہلے قمار نہ صرف رائج بلکہ شرافت وعزت اور مایۂ تفاخر سمجھا جاتا تھا اور مزید تفاخر کے لیے یہ لوگ جو حصے قمار میں جیت لیتے تھے ان کو نہ کھاتے بلکہ فقراء پر تقسیم کر دیتے تھے۔ (تفسیر کبیر للرازی ۲/۲۳۱، جواہر الفقہ ۴/ ۵۵۷، احکام القمار)

قولِ زور (جھوٹ) کے معنی

وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ: قول زور سے مراد جھوٹ ہے، حق کے خلاف جو کچھ ہے وہ باطل اور جھوٹ میں داخل ہے، خواہ عقائد فاسدہ شرک وکفر ہوں یا معاملات میں، اور شہادت میں جھوٹ بولنا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب کبیرہ گناہوں میں سے بڑے کبیرہ گناہ یہ ہیں:

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا اور عام باتوں میں جھوٹ بولنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری لفظ وقول الزور کو بار بار فرمایا۔ (رواہ البخاری، معارف القرآن ۶/ ۲۶۳، سورۂ حج پ ۱۷)

قول سدید کی تعریف

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا۔ (پ ۲۲، سورہ احزاب)

قول سدید کی تفسیر بعض نے صدق کے ساتھ کی، بعض نے مستقیم، اور بعض نے

صواب وغیرہ سے کی۔

ابن کثیر نے سب کو نقل کر کے فرمایا کہ سب حق ہیں، کاشفی نے روح البیان میں فرمایا کہ قول سدید وہ قول ہے جو سچا ہو، جھوٹ کا اس میں شائبہ نہ ہو، صواب ہو جس میں خطا کا شائبہ نہ ہو، ٹھیک بات ہو، ہزل یعنی مذاق ودل لگی نہ ہو، نرم کلام ہو، دلخراش نہ ہو۔

(معارف القرآن سورہ احزاب ۲۴۰/۷)

قیاس کی تعریف

''اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ'' (سورہ نساء، پ۵)

اس آیت سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی مسئلہ کی تصریح قرآن وسنت میں نہ ملے تو انہی میں غور وفکر کر کے اس کا حل نکالنے کی کوشش کی جائے، اور اسی عمل کو اصطلاح میں قیاس کہتے ہیں۔ (قرطبی)

(معارف القرآن ۴۹۰/۲، نساء)

ک

کاہن کی تعریف

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (سورہ الحاقّہ، پ۲۹)

کاہن وہ شخص ہوتا ہے جو کچھ شیاطین سے خبریں پا کر کچھ نجوم کے اثرات سے معلوم کر کے آنے والے واقعات میں اٹکل پچو باتیں کیا کرتے تھے، غرض آپ کو شاعر یا کاہن کہنے والوں کے الزام کا حاصل یہ تھا کہ آپ جو کلام سناتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے خیالات سے یا کاہنوں کی طرح شیاطین سے کچھ کلمات جمع کر لئے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

(معارف القرآن، ج۸، ص، ۵۴۷ سورہ الحاقّہ)

کبائر (گناہ صغیرہ وکبیرہ) کی تعریف

آیت میں کبائر کا لفظ آیا ہے اس لیے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گناہ کبیرہ کسے کہتے ہیں اور وہ کل کتنے ہیں، اور صغیرہ گناہ کی کیا تعریف ہے اور اس کی تعداد کیا ہے؟

علمائے امت نے اس مسئلہ پر مختلف انداز میں مستقل مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

گناہ کبیرہ اور صغیرہ کی تقسیم اور ان کی تعریفات سے پہلے یہ خوب سمجھ لیجئے کہ مطلق گناہ نام ہے ہر ایسے کام کا جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور مرضی کے خلاف ہو، اسی سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ اصطلاح میں جس گناہ کو صغیرہ یعنی چھوٹا کہا جاتا ہے در حقیقت وہ بھی چھوٹا نہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی مرضی کی مخالفت ہر حالت میں نہایت سخت وشدید جرم ہے، اسی حیثیت سے امام الحرمین اور بہت سے

علمائے امت نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی اور اس کی مرضی کی مخالفت کبیرہ ہی ہے .... کبیرہ اور صغیرہ کا فرق صرف گناہوں کے باہمی مقابلہ اور موازنہ کی وجہ سے کیا جاتا ہے، اسی معنی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ **کل ما نہی عنہ فھو کبیرۃ** یعنی جس کام سے شریعت اسلام میں منع کیا گیا ہے وہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس گناہ کو اصطلاح میں صغیرہ یا چھوٹا کہا جاتا ہے، اس کے یہ معنی کسی کے نزدیک نہیں ہیں کہ ایسے گناہوں کے ارتکاب میں غفلت یا سستی برتی جائے، اور ان کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کیا جائے، بلکہ صغیرہ گناہ کو بے باکی اور بے پرواہی کے ساتھ کیا جائے تو وہ صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے۔

کسی بزرگ نے فرمایا کہ چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے چھوٹا بچھو اور بڑا بچھو، یا آگ کے بڑے انگارے اور چھوٹی چنگاری کہ انسان ان دونوں میں سے کسی کی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، اسی لیے محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ گناہوں کو ترک کیا جائے جو لوگ نماز، تسبیح کے ساتھ گناہوں کو نہیں چھوڑتے ان کی عبادت مقبول نہیں اور حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا کہ تم جس قدر کسی گناہ کو ہلکا سمجھو گے اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک بڑا جرم ہو جائے گا، اور سلف صالحین نے فرمایا کہ ہر گناہ کفر کا قاصد ہے، جو انسان کو کافرانہ اعمال واخلاق کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں لکھا کہ بندہ جب خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے مداح بھی مذمت کرنے لگتے ہیں اور دوست بھی دشمن ہو جاتے ہیں، گناہوں سے بے پرواہی انسان کے لیے دائمی تباہی کا سبب ہے صحیح حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ

نقطہ لگ جاتا ہے، پھر اگر توبہ اور استغفار کرلیا تو یہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور اگر توبہ نہ کی تو یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے پورے دل پر چھاجاتا ہے، اور اس کا نام قرآن میں رین ہے "كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" یعنی ان کے دلوں پر زنگ لگادیا ان کے اعمالِ بد نے .... البتہ گناہوں کے مفاسد اور نتائج بد اور مضر ثمرات کے اعتبار سے ان کے آپس میں فرق ضروری ہے، اس فرق کی وجہ سے کسی گناہ کو کبیرہ اور کسی کو صغیرہ کہا جاتا ہے۔

گناہ کبیرہ کی تعریف

گناہ کبیرہ کی تعریف قرآن وحدیث اور اقوال سلف کی تشریحات کے ماتحت یہ ہے کہ جس گناہ پر قرآن میں کوئی شرعی حد یعنی سزا دنیا میں مقرر کی گئی ہے یا جس پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید آئی ہے وہ سب گناہ کبیرہ ہیں، اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور نتائج بد کسی کبیرہ گناہ کے برابر یا اس سے زائد ہوں، اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرأت و بے باکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہوجاتا ہے۔

ابن عباسؓ کے سامنے کسی نے کبیرہ گناہوں کی تعداد سات بتلائی تو آپ نے فرمایا سات نہیں سات سو کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

امام ابن حجر مکی نے اپنی کتاب الزواجر میں ان تمام گناہوں کی فہرست اور ہر ایک کی مکمل تشریح بیان فرمائی ہے جو مذکور الصدر تعریف کی رُو سے کبائر میں داخل ہیں، ان کی اس کتاب میں کبائر کی تعداد چار سو سڑسٹھ تک پہنچی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ بعض نے بڑے بڑے ابواب معصیت کو شمار کرنے پر اکتفا کیا ہے تو تعداد کم لکھی ہے، بعض نے ان کی تفصیلات اور انواع واقسام کو پورا لکھا تو تعداد زیادہ ہوگئی، اس لیے یہ کوئی تعارض واختلاف نہیں ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات میں بہت سے گناہوں کا کبیرہ ہونا بیان فرمایا، اور حالات کی مناسبت سے کہیں تین کہیں چھ کہیں سات کہیں اس سے بھی زیادہ بیان فرمائے ہیں، اسی سے علماء امت نے یہ سمجھا کہ کسی عدد میں انحصار کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مواقع اور حالات کے مناسب جتنا سمجھا گیا، اتنا بیان کر دیا گیا۔

بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں بھی جو سب سے بڑے ہیں میں تمہیں ان سے باخبر کرتا ہوں وہ تین ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک ساجھی ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی اور جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹ بولنا۔

اسی طرح بخاری ومسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ تو فرمایا کہ تم اپنے بچہ کو اس خطرہ سے مار ڈالو کہ یہ تمہارے کھانے میں شریک ہوگا تمہیں اس کو کھلانا پڑے گا، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرنا، بدکاری خود ہی بڑا جرم ہے، اور پڑوسی کے اہل وعیال کی حفاظت بھی چونکہ اپنے اہل وعیال کی طرح انسان کے ذمہ لازم ہے اس لیے یہ جرم دوگنا ہو گیا۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالیاں دے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ہی ماں باپ کو گالی دینے لگے؟ فرمایا کہ ہاں: جو شخص کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے

خود اپنے ماں باپ کو گالیاں دی ہوں، کیونکہ یہی ان گالیوں کا سبب بنا ہے۔

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک اور قتل ناحق اور یتیم کا مال ناجائز طریقہ پر کھانے اور سود کی آمدنی کھانے اور میدان جہاد سے بھاگنے اور پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے اور بیت اللہ کی بے حرمتی کرنے کو کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے۔

بعض روایات حدیث میں اس کو بھی کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے کہ کوئی شخص دارالکفر سے ہجرت کرنے کے بعد پھر دارالہجرۃ کو چھوڑ کر دارالکفر میں دوبارہ چلا جائے۔

دوسری روایات حدیث میں ان صورتوں کو بھی گناہ کبیرہ کی فہرست میں داخل کیا گیا ہے، مثلاً جھوٹی قسم کھانا، اپنی ضرورت سے زائد پانی کو روک کر رکھنا، دوسرے ضرورت والوں کو نہ دینا، جادو سیکھنا، جادو کا عمل کرنا، اور فرمایا کہ شراب پینا اکبرالکبائر ہے، اور فرمایا کہ شراب پینا ام الفواحش ہے، کیونکہ شراب میں مست ہو کر آدمی ہر برے سے برا کام کر سکتا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ سب سے بڑا کبیرہ گناہ یہ ہے کہ انسان اپنے مسلمان بھائی پر ایسے عیب لگائے جس سے اس کی آبروریزی ہوتی ہو۔

ایک حدیث میں ہے جس شخص نے بغیر کسی عذر شرعی کے دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کر دیا تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا، مطلب یہ ہے کہ کسی نماز کو اپنے وقت میں نہ پڑھا، بلکہ قضا کر کے دوسری نماز کے ساتھ پڑھا۔

بعض روایات حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا بھی کبیرہ گناہ ہے اور اس کے عذاب وسزا سے بےفکر و بےخوف ہو جانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ وارث کو نقصان پہنچانے اور اس کا حصۂ میراث کم

کرنے کے لیے کوئی وصیت کرنا بھی کبائر میں سے ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ خائب وخاسر ہوئے اور تباہ ہو گئے اور تین دفعہ اس کلمہ کو دہرایا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ محروم القسمۃ اور تباہ و برباد کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا ایک وہ شخص جو تکبر کے ساتھ پاجامہ یا تہبند یا کرتہ اور عباء کو ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے، دوسرے وہ آدمی جو اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کر کے احسان جتلائے، تیسرے وہ آدمی جو بوڑھا ہونے کے باوجود بدکاری میں مبتلا ہو، چوتھے وہ آدمی جو بادشاہ یا افسر ہونے کے باوجود جھوٹ بولے، پانچویں وہ آدمی جو عیال دار ہونے کے باوجود تکبر کرے، چھٹے وہ آدمی جو کسی امام کے ہاتھ پر محض دنیا کی خاطر بیعت کرے۔

اور صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ چغلی کھانے والا جنت میں نہ جائے گا۔

اور نسائی ومسند احمد وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے کہ چند آدمی جنت میں نہ جائیں گے شرابی، ماں باپ کا نافرمان، رشتہ داروں سے بلا وجہ قطع تعلق کرنے والا، احسان جتلانے والا، جنات وشیاطین یا دوسرے ذرائع سے غیب کی خبریں بتانے والا، دیوث، یعنی اپنے اہل وعیال کو بے حیائی سے نہ روکنے والا۔

مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اس شخص پر جو کسی جانور کو اللہ کے سوا کسی کے لیے قربان کرے۔

(معارف القرآن ۲/ ۳۸۷، سورہ نساء پ ۵)

چند اور گناہ کبیرہ

مشہور ومعروف روایات حدیث میں کبائر یعنی بڑے گناہ ان چیزوں کو بتلایا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک یا برابر قرار دینا، قصداً کسی فرض نماز

کا چھوڑنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، حرام کاری، چوری، شراب نوشی، ماں باپ کی نافرمانی، جھوٹی قسم، جھوٹی گواہی، جادو کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال ناجائز طور پر لے لینا، میدان جہاد سے بھاگنا، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا، کسی کا مال ناجائز طور پر غصب کرنا، عہد شکنی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، کسی کو گالی دینا، کسی شخص کو ناحق مجرم قرار دینا، وغیرہ .... کبیرہ اور صغیرہ یعنی بڑے اور چھوٹے گناہوں کی تفصیل مستقل رسالوں میں علماء نے لکھ دی ہیں، میرے رسالہ ''گناہ بے لذت'' میں بھی مذکور ہے وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

بہر حال آیت مذکور سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نیک کام کرنے سے بھی گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برے کام کے بعد نیک کام کرلو تو وہ اس کی برائی کو مٹادے گا، اور فرمایا کہ لوگوں سے خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرو۔ (ابن کثیر بحوالہ مسند احمد)

حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرمایئے آپ نے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی گناہ ہوجائے تو اس کے بعد کوئی نیک کام کرو تاکہ وہ اس کو مٹادے۔

درحقیقت ان احادیث میں گناہ سے توبہ کرنے کا مسنون و محمود طریقہ بتلایا گیا ہے جیسا کہ مسند احمد میں بروایت صدیق اکبرؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اس کو چاہئے کہ وضو کرکے دو رکعت نماز نفل ادا کرلے، تو اس گناہ کی معافی ہوجائے گی۔ (الروایات کلہا من ابن کثیر) اس نماز کو نماز توبہ کہا جاتا ہے۔ (معارف القرآن ۴/۶۷۸، سورہ ہود پ۱۲)

کعبہ کی تعریف

لفظ کعبہ عربی زبان میں ایسے مقام کو کہتے ہیں جو مربّع یعنی چوکور ہو، عرب میں

قبیلۂ خشعم کا بنایا ہوا ایک اور مکان بھی اسی نام سے موسوم تھا جس کو کعبۂ یمانیہ کہا جاتا تھا، اسی لئے بیت اللہ کو اس کعبہ سے ممتاز کرنے کے لئے لفظ کعبہ کے ساتھ البیت الحرام کا لفظ بڑھایا گیا۔ (معارف القرآن سورہ مائدہ پ ۷،ص ۲۳۷ ج ۳)

کفر کی تعریف

جن امور کی تصدیق ایمان میں ضروری ہے ان میں سے کسی امر کی تکذیب وانکار۔ (جواہر الفقہ ،کفر وایمان ۵۸/۷)

کلالہ کی تعریف

''کلالہ'' کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں جو علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں بھی نقل کی ہیں، مشہور تعریف یہی ہے جو خلاصہ تفسیر میں مذکور ہے کہ جس مرنے والے کے اصول اور فروع نہ ہوں وہ کلالہ ہے۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ کلالہ اصل میں مصدر ہے جو کلال کے معنی میں ہے اور کلال کے معنی ہیں تھک جانا، جو ضعف پر دلالت کرتا ہے، باپ بیٹے والی قرابت کے سوا قرابت کو کلالہ کہا گیا، اس لیے کہ وہ قرابت باپ بیٹے کی قرابت کی نسبت سے کمزور ہے۔

پھر کلالہ کا اطلاق اس مرنے والے پر بھی کیا گیا جس نے نہ اولاد چھوڑی اور نہ والد اور اس وارث پر بھی اطلاق کیا گیا جو مرنے والے کا ولد اور والد نہ ہو، لغت کے اعتبار سے جو اشتقاق بتلایا اس کا تقاضا ہے کہ لفظ ''ذو'' مقدر ہو اور کلالہ بمعنی ''ذو کلالہ'' ہو گیا، یعنی ضعیف رشتہ والا، پھر اس مال موروث پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا جو ایسے میت نے چھوڑا ہو جس کا کوئی ولد اور والد نہ ہو۔

حاصل کلام یہ کہ اگر کوئی شخص مرد یا عورت وفات پا جائے اور اس کے نہ باپ

ہوں نہ دادا، اور نہ اولاد ہو، اور اس نے ایک بھائی یا بہن ماں شریک چھوڑے ہوں تو ان میں سے اگر بھائی ہے تو اس کو چھٹا حصہ ملے گا اور نہیں ہے تو بہن کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر ایک سے زیادہ ہوں مثلاً ایک بھائی ایک بہن ہو یا دو بھائی دو بہن ہوں تو یہ سب مرنے والے کے کل مال کے تہائی حصے میں شریک ہوں گے، اور اس میں مذکر کو مؤنث سے دوہرا نہیں ملے گا، علامہ قرطبی فرماتے ہیں **وَلَيْسَ فِي الْفَرَائِضِ مَوْضِعٍ يَكُوْنُ فِيْهِ الذَّكَرُ وَالانْثٰى سَوَاءٌ اِلَّا فِي مِيْرَاثِ الْاخوةِ لِلْاَمِّ۔**

(معارف القرآن ۳۲۸/۲، سورۂ نساء پ ۶)

کلمۃ التقویٰ کی تعریف

وَاَلْزَمَهُم كَلِمَةَ التَّقوىٰ وَكَانُوا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَها (سورہ فتح، پ ۲۶)

کلمہء تقویٰ سے مراد اہل تقویٰ کا کلمہ ہے، یعنی کلمہء توحید و رسالت، اس کو کلمہء تقویٰ اس لئے کہا گیا یہ کلمہ ہی تقویٰ کی بنیاد ہے، اور صحابہ کرام کو اس کلمہ کا احق اور اہل فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی رسوائی واضح کر دی جو ان حضرات پر کفر و نفاق کا الزام لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو ان کو کلمہء اسلام کا اہل احق فرمائے اور یہ بد بخت ان پر تبرّا کریں۔ (معارف القرآن سورہ فتح، پ ۲۶، ص ۸۷، ج ۸)

کنز و کنوز کی تعریف

کنوز کنز کی جمع ہے، مدفون خزانہ کو کہا جاتا ہے اور اصطلاح شرع میں کنز وہ خزانہ ہے جس کی زکوٰۃ نہ دی گئی ہو۔ (معارف القرآن سورہ قصص پ ۲۰، ص ۶۶۵ ج ۶)

کہف، غار اور رقیم کی تعریف

''کہف'' پہاڑی، غار جو وسیع ہو اس کو کہف کہتے ہیں، جو وسیع نہ ہو اس کو غار کہا جاتا جاہے،

رقیمٌ لفظی اعتبار سے بمعنیٰ المرقوم ہے، یعنی لکھی ہوئی چیز، ابن عباسؓ اس کے معنیٰ ایک لکھی ہوئی تختی کے قرار دیتے ہیں، جس پر باشاہ وقت نے اصحاب کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دروازے پر لگا دیا تھا، اسی وجہ سے اصحاب کہف کو اصحابُ الرقیم بھی کہا جاتا ہے، قتادہ، عطیہ، عوفی، مجاہد کا قول یہ ہے کہ رقیم اس پہاڑ کے نیچے وادی کا نام ہے، جس میں اصحاب کہف کا غار تھا، بعض نے خود اس پہاڑ کو رقیم کہا ہے، حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ رقیم کسی لکھی ہوئی تختی کا نام ہے، یا کسی بستی کا، کعب احبار، وہب بن منبّہ، حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رقیم اَیلہ یعنی عقبہ کے قریب ایک شہر کا نام ہے، جو بلا د روم میں واقع ہے۔

(معارف القرآن ۵۵۰، ج ۵، سورہ کہف پ ۱۵)

ل

لعان کی تعریف

لعان اور ملاعنت کے معنیٰ ایک دوسرے پر لعنت اور غضبِ الٰہی کی بددعا کرنے کے ہیں، اصطلاح شرع میں میاں بیوی دونوں کو چند خاص قسمیں دینے کو کہا جاتا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے، یا اپنے بچے کو کہے کہ یہ میرے نطفہ سے نہیں ہے، اور یہ عورت جس پر الزام لگایا گیا ہے اس کو جھوٹا بتلادے اور اس کا مطالبہ کرے کہ مجھ پر جھوٹی تہمت لگائی ہے، اس لئے شوہر پر تہمت زنا کی سزا اَسّی کوڑے جاری کی جائے، تو اس وقت شوہر سے مطالبہ کیا جائے گا الزام زنا پر چار گواہ پیش کرے، اگر اس نے گواہ پیش کردیئے تو عورت پر حدّ زنا جاری کی جائے گی، اور اگر وہ چار گواہ نہ لاسکا تو ان دونوں میں لعان کرایا جائے گا، یعنی اول مرد سے کہا جائے گا کہ وہ چار مرتبہ ان الفاظ سے جو قرآن میں مذکور ہیں یہ شہادت دے کہ میں اس الزام میں سچا، اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔

اگر شوہر ان الفاظ کے کہنے سے رکے تو اس کو قید کردیا جائے گا کہ یا تو اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کرو، یا مذکورہ الفاظ کے ساتھ پانچ مرتبہ یہ قسمیں کھاؤ اور جب تک وہ ان دونوں میں سے کوئی کام نہ کرے اس کو قید رکھا جائے گا، اگر اس نے اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کرلیا تو اس پر حد قذف، یعنی تہمت زنا کی شرعی سزا جاری ہوگی اور اگر الفاظ مذکورہ کے ساتھ پانچ مرتبہ قسمیں کھالیں، تو پھر اس کے بعد

عورت سے ان الفاظ میں پانچ قسمیں لی جائیں گی جو قرآن میں عورت کے لئے مذکور ہیں، اگر وہ قسم کھانے سے انکار کرے تو اس کو اس وقت تک قید رکھا جائے گا جب تک کہ وہ یا تو شوہر کی تصدیق کرے اور اپنے جرم زنا کا اقرار کرے تو اس پر حد زنا جاری کردی جائے، اور پھر الفاظ مذکورہ کے ساتھ پانچ قسمیں کھائے، اگر وہ ان الفاظ مذکورہ سے قسمیں کھانے پر راضی ہوجائے اور قسمیں کھالے تو اب لعان پورا ہوگیا، جس کے نتیجہ میں دنیا کی سزا سے دونوں بچ گئے، آخرت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہی ہے کہ ان میں سے کون جھوٹا ہے، جھوٹے کو آخرت میں سزا ملے گی، لیکن دنیا میں بھی جب دو میاں بیوی میں لعان کا معاملہ ہوگیا تو یہ ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتے ہیں، شوہر کو چاہئے کہ اس کو طلاق دے کر آزاد کردے، اگر وہ طلاق نہ دے تو حاکم ان دونوں میں تفریق کرسکتا ہے جو بحکم طلاق ہوگی، بہرحال اب ان دونوں کا آپس میں دوبارہ نکاح بھی کبھی نہیں ہوسکتا، معاملہ لعان کی یہ تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

(معارف القرآن ج۶/ ۳۵۷، نور: پ۱۸)

لعنت کی تعریف

لغۃً لعنت کے معنیٰ اللہ کی رحمت سے دور ہونے کے ہوتے ہیں، شرعاً کفار کے حق میں اس کے معنیٰ اللہ کی رحمت سے بعید ہونے کے ہیں، اور مؤمنین کے حق میں ابرار (صلحاء) کے درجہ سے نیچے گرنے کے ہیں۔

(نقلہ الشامی عن القہستانی، ص۸۳۶ ج۲)

اس لئے کسی مسلمان کے لئے اس کے نیک عمل کم ہوجانے کی دعا بھی جائز نہیں۔

(معارف القرآن سورہ نساء پ۵، ص۴۳۷ ج۲)

لغو اور فضول کی تعریف

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (مومنون پ ۱۸)

''لغو'' کے معنی فضول کلام یا وہ کام جس میں کوئی دینی فائدہ نہ ہو، لغو کا اعلیٰ درجہ معصیت اور گناہ ہے، جس میں فائدہ دینی نہ ہونے کے ساتھ دینی ضرر ونقصان ہے، اس سے پرہیز واجب ہے، اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ نہ مفید ہو نہ مضر، اس کا ترک کم از کم اولیٰ اور موجب مدح ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه، یعنی انسان کا اسلام جب اچھا ہوسکتا ہے جب کہ وہ بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دے، اسی لیے آیت میں اس کو مؤمن کامل کی خاص صفت قرار دیا ہے۔　(معارف القرآن ۲۹۶/۶، سورۂ مومنون پ ۱۸)

لُقطہ اور لقیط کی تعریف

لفظ ''التقاط'' لقطہ سے بنا ہے ''لُقطہ'' اس گری پڑی چیز کو کہتے ہیں جو کسی کو بغیر طلب مل جائے، غیر جاندار چیز ہو تو اس کو لقطہ اور جاندار کو فقہاء کی اصطلاح میں لقیط کہا جاتا ہے، انسان کو لقیط اسی وقت کہا جائے گا جب کہ وہ بچہ ہو، عاقل بالغ نہ ہو، قرطبی نے اسی لفظ سے استدلال کیا ہے کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا تھا اس وقت وہ نابالغ بچے تھے۔　(معارف القرآن ص ۳۰، ج ۵، سورہ یوسف، پ ۱۲)

لمز و ہمز اور غیبت کی تعریف

''لـمـز'' کے معنی کسی میں عیب نکالنے اور عیب ظاہر کرنے یا عیب پر طعنہ زنی کرنے کے ہیں، آیت میں ارشاد فرمایا لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَکُمْ یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو، یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں ہے لَاتَقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ جس کے معنی یہ ہیں

کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، دونوں جگہ اپنے آپ کو قتل کرنے یا اپنے عیب نکالنے سے مراد یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو۔

تیسری چیز جس کو اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے وہ کسی کی غیبت کرنا ہے، یعنی اس کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو وہ سنتا تو اس کو ایذاء ہوتی اگرچہ وہ سچی بات ہی ہو، کیونکہ جو غلط الزام لگائے وہ تہمت ہے جس کی حرمت الگ قرآن کریم سے ثابت ہے۔

اور غیبت کی تعریف میں اس شخص کی غیر موجودگی کی قید سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موجودگی کی حالت میں ایسی رنج دہ بات کہنا جائز ہے کیونکہ وہ غیبت تو نہیں مگر لمز میں داخل ہے، جس کی حرمت اس سے پہلی آیت میں آچکی ہے۔

أَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ أَن يأكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ الخ، اس آیت میں کسی مسلمان کی آبروریزی اور توہین و تحقیر کو اس کا گوشت کھانے کے مثل و مشابہ قرار دیا ہے، اگر اس کے وہ شخص سامنے ہو تو ایسا ہے جیسے کسی زندہ انسان کا گوشت نوچ کر کھایا جائے، اس کو قرآن میں بلفظ **لمز** تعبیر کر کے حرام قرار دیا ہے، جیسا کہ ابھی گذرا، **لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ** اور آگے آئے گا **وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ**۔

اور (اگر) وہ آدمی غائب ہو اس کے پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہنا جس سے اس کی آبرو میں خلل آئے، اور اس کی تحقیر ہو، یہ ایسا ہے جیسے کسی مردہ انسان کا گوشت کھایا جائے، کہ جیسے مردہ کا گوشت کھانے سے مردہ کو کوئی جسمانی اذیت نہیں ہوتی، ایسے ہی اس غائب کو جب تک غیبت کی خبر نہیں ہوتی اس کو بھی کوئی اذیت نہیں ہوتی، مگر جیسا کہ مردہ مسلمان کا گوشت کھانا حرام اور بڑی خِسّت و دنائت کا کام ہے اسی طرح غیبت حرام بھی اور خست و دناءت بھی کہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہنا کوئی بہادری کا کام نہیں۔

(معارف القرآن ۱۱۶/۸-۱۲۱، سورۂ حجرات، پ ۲۶)

لمز وھمز اور غیبت کی تعریف اور ان کا باہمی فرق

’’ھمز‘‘اور’’لمز‘‘ چند معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اکثر مفسرین نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ: ’’ھمز‘‘ کے معنی غیبت یعنی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کے عیوب کا تذکرہ کرنا، اور’’لمز‘‘ کے معنی آمنے سامنے کسی کو طعنہ دینے اور بُرا کہنے کے ہیں۔ یہ دونوں ہی چیزیں سخت گناہ ہیں، غیبت کی وعیدیں قرآن وحدیث میں زیادہ ہیں، جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس گناہ کے اشتغال میں کوئی رکاوٹ سامنے نہیں ہوتی، جو اس میں مشغول ہوا تو بڑھتا چڑھتا چلا جاتا ہے اس لیے گناہ بڑے سے بڑا اور زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے، بخلاف آمنے سامنے کہنے کے کہ وہاں دوسرا بھی مدافعت کے لیے تیار ہوتا ہے اس لیے گناہ میں امتداد نہیں ہوتا، (یعنی سلسلہ آگے نہیں بڑھتا) اس کے علاوہ کسی کے پیچھے اس کے عیوب کا تذکرہ اس لیے بھی بڑا ظلم ہے کہ اس کو خبر بھی نہیں کہ مجھ پر کیا الزام لگایا جارہا ہے کہ اپنی صفائی پیش کرسکے۔

اور ایک حیثیت سے لمز زیادہ شدید ہے، کسی کے روبرو اس کو برا کہنا اس کی توہین وتذلیل بھی ہے، اور اس کی ایذاء بھی اشد ہے، اسی اعتبار سے اس کا عذاب بھی اشد ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **شرار عباد اللہ تعالیٰ المشّاؤن بالنميمة، المفرقون بين الأحبة، الباغون البراء العنت**، یعنی اللہ کے بندوں میں بدترین وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کرتے ہیں اور دوستوں کے درمیان فساد ڈلواتے ہیں، اور بے گناہ لوگوں کے عیب تلاش کرتے رہتے ہیں۔

(معارف القرآن ۸/۸۱۵، سورۂ ہمزہ پ ۳۰)

لہوالحدیث کی تعریف

لہوالحدیث میں لفظ حدیث تو باتوں اور قصے کہانیوں کے معنی میں ہے اور لہو کے لفظی معنی غفلت میں پڑنے کے ہیں، جو چیزیں انسان کو ضروری کاموں سے غفلت میں ڈالیں وہ لہو کہلاتی ہیں، اور بعض اوقات ایسے کاموں کو بھی لہو کہا جاتا ہے جن کا کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو، محض وقت گذاری کا مشغلہ یا دل بہلانے کا سامان ہو۔

آیت مذکورہ میں لہوالحدیث کے معنی اور تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، حضرت ابن مسعود، ابن عباس و جابر رضی اللہ عنہم کی ایک روایت میں اس کی تفسیر گانے بجانے سے کی گئی ہے۔ (رواہ الحاکم وصححہ والبیہقی فی الشعب وغیرہ)

اور جمہور صحابہ و تابعین اور عام مفسرین کے نزدیک لہوالحدیث عام ہے تمام ان چیزوں کے لیے جو انسان کو اللہ کی عبادت اور یاد سے غفلت میں ڈالے، اس میں غناء مزامیر بھی داخل ہے اور بیہودہ قصے کہانیاں بھی، امام بخاری نے اپنی کتاب الادب المفرد میں اور بیہقی نے اپنی سنن میں لہوالحدیث کی یہی تفسیر اختیار کی ہے، اس میں فرمایا ہے کہ **لھو الحدیث ھو الغناء و أشباھه**، یعنی لہوالحدیث سے مراد گانا اور اس کے مشابہ دوسری چیزیں ہیں، (یعنی جو اللہ کی عبادت سے غافل کر دیں)۔

اور سنن بیہقی میں ہے کہ اشتراء لہوالحدیث سے مراد گانے بجانے والے مرد یا عورت کو خریدنا یا اس کے امثال ایسی بیہودہ چیزوں کو خریدنا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل کریں، ابن جریر نے بھی اسی عام معنی کو اختیار فرمایا ہے، (روح ملخصاً) اور ترمذی کی ایک روایت سے بھی یہی عموم ثابت ہوتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ گانے والی لونڈیوں کی تجارت نہ کرو۔ اور پھر فرمایا وفی مثل ھذا أنزلت ھٰذہ الآیۃ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَّشْتَرِیْ الخ۔

(معارف القرآن ۲۱/۷، سورہ لقمان پ ۲۱)

لہو ولعب اور زینت کی تعریف

دنیا کی زندگی کا خلاصہ بترتیب چند چیزیں اور چند حالات ہیں، پہلے لعب پھر لہو پھر زینت پھر تفاخر پھر مال واولاد کی کثرت پر ناز وفخر۔

لعب وہ کھیل ہے جس میں فائدہ مطلق پیش نظر نہ ہو، جیسے بہت چھوٹے بچوں کی حرکتیں، اور لہو وہ کھیل ہے جس کا اصل مقصد تو تفریح ہے اور دل بہلانا اور وقت گزاری کا مشغلہ ہوتا ہے ضمنی طور پر کوئی ورزش یا دوسرا فائدہ بھی اس میں حاصل ہو جاتا ہے جیسے بڑے بچوں کے کھیل، گیند شناوری یا نشانہ بازی وغیرہ حدیث میں نشانہ بازی اور تیرنے کی مشق کو اچھا کھیل فرمایا ہے، زینت بدن اور لباس وغیرہ کی معروف ہے، اور انسان اس دور سے گزرتا ہے کہ عمر کا بالکل ابتدائی حصہ تو خالص کھیل یعنی لعب میں گزرتا ہے اس کے بعد لہو شروع ہوتا ہے، اس کے بعد اس کو اپنے تن وبدن اور لباس کی زینت کی فکر ہونے لگتی ہے، اس کے بعد ہم عصروں اور ہم عمروں سے آگے بڑھنے اور ان پر فخر جتلانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

(معارف القرآن ص ۳۱۴، ج ۸، سورہ حدید پ، ۲۷)

لیلۃ القدر اور لیلۃ البرأۃ کی تعریف

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ۔ (سورہ قدر پ ۳۰)

قدر کے ایک معنی عظمت وشرف کے ہیں، زہری وغیرہ حضرات علماء نے اس جگہ یہی معنی مراد لیے ہیں، اور اس رات کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ اس رات کی عظمت وشرف ہے۔

اور ابو بکر ورّاق نے فرمایا کہ اس رات کو لیلۃ القدر اس وجہ سے کہا گیا کہ جس آدمی کی اس سے پہلے اپنی بے عملی کے سبب کوئی قدر وقیمت نہ تھی اس رات میں توبہ واستغفار اور عبادت کے ذریعہ وہ صاحب قدر وشرف بن جاتا ہے۔

قدر کے دوسرے معنی تقدیر وحکم کے بھی آتے ہیں، اس معنی کے اعتبار سے لیلۃ

القدر کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس رات میں تمام مخلوقات کے لیے جو کچھ تقدیر ازلی میں لکھا ہے اس کا جو حصہ اس سال میں رمضان سے اگلے رمضان تک پیش آنے والا ہے وہ ان فرشتوں کے حوالے کردیا جاتا ہے جو کائنات کی تدبیر اور تنفیذ امور کے لیے مامور ہیں، اس میں ہر انسان کی عمر اور موت اور رزق اور بارش وغیرہ کی مقداریں مقرر فرشتوں کو لکھوادی جاتی ہیں، یہاں تک کہ جس شخص کو اس سال میں حج نصیب ہوگا وہ بھی لکھ دیا جاتا ہے، اور یہ فرشتے جن کو یہ امور سپرد کئے جاتے ہیں بقول ابن عباسؓ چار ہیں اسرافیل، میکائیل، عزرائیل، جبرئیل علیہم السلام۔ (قرطبی)

سورہ دخان (پ۲۵) کی آیت ''اِنَّا اَنۡزَلۡنَاہ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُبَارَکَة ''میں جمہور مفسرین کے نزدیک لیلۃ مبارکہ سے مراد بھی لیلۃ القدر ہی ہے۔

(معارف القرآن ۷/۹۱/۸، سورہ قدر پ:۳۰)

مالک کی تعریف

''مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ''۔(سورہ فاتحہ،پ۱)

''مالک'' ملک سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں تصرف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو۔(قاموس)(معارف القرآن سورہ فاتحہ پ:۱، ۱/۲۷)

مبارک کی تعریف

لفظ مبارک برکت سے مشتق ہے، برکت کے معنی ہیں بڑھنا اور ثابت رہنا پھر کسی چیز کا بڑھنا اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا وجود کھلے طور پر مقدار میں بڑھ جائے اور اس طرح بھی کہ اگر چہ اس کی مقدار میں کوئی خاص اضافہ نہ ہو لیکن اس سے کام اتنے نکلیں جتنے عامۃً اس سے زائد سے نکلا کرتے ہیں اس کو بھی معنوی طور پر زیادتی کہا جاسکتا ہے۔ (معارف آل عمران ۲/۱۱۷)

مباہلہ کی تعریف

فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَ نَاوَ اَبْنَاءَ کُمْ الاٰیة (سورہ آل عمران،پ۳)

اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مباہلہ کرنے کا حکم دیا ہے، جس کی تعریف یہ ہے کہ اگر کسی امر کے حق و باطل میں فریقین میں نزاع ہو جائے اور دلائل سے نزاع ختم نہ ہو تو پھر ان کو یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ سب مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو اس امر میں باطل پر ہو اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے

وبال اور ہلاکت پڑے، کیونکہ لعنت کے معنی رحمتِ حق سے بعید ہو جانا ہے، اور رحمت سے بعید ہونا قہر سے قریب ہونا ہے، پس حاصل معنی اس کے یہ ہوئے کہ جھوٹے پر قہر نازل ہو، سو جو شخص جھوٹا ہوگا وہ اس کا خمیازہ بھگتے گا، اس وقت پوری تعیین صادق و کاذب کی منکرین کے نزدیک بھی واضح ہو جائے گی، اس طور پر دعا کرنے کو ''مباہلہ'' کہتے ہیں، اور اس میں اصل خود مباحثہ کرنے والوں کا جمع ہو کر دعا کرنا ہے اپنے اعزہ و اقارب کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر جمع کیا جائے تو اس سے اور اہتمام بڑھ جاتا ہے۔ (معارف القرآن ۸۵/۲، سورۂ آل عمران پ ۳)

مُتعہ کی تعریف

متعہ اصطلاحی جس کے جواز کا ایک فرقہ مدعی ہے یہ ہے کہ ایک مرد کسی عورت سے یوں کہے کہ اتنے دن کے لئے اتنے پیسے یا فلاں جنس کے عوض میں تم سے متعہ کرتا ہوں۔ (معارف القرآن ۳۶۶، ج ۲، سورہ نساء)

مجادلۂ حسنہ کی تعریف

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَن، (سورہ نحل پ ۱۵) لفظ **جادل** مجادلہ سے مشتق ہے، اس جگہ مجادلہ سے مراد بحث و مناظرہ ہے، اور بِالَّتِي هِيَ أَحْسَن سے مراد یہ ہے کہ اگر دعوت میں کہیں بحث و مناظرہ کی ضرورت پیش آجائے تو وہ مباحثہ بھی اچھے طریقہ سے ہونا چاہئے، روح المعانی میں ہے کہ اچھے طریقہ سے مراد یہ ہے کہ گفتگو میں لطف اور نرمی اختیار کی جائے، دلائل ایسے پیش کئے جائیں، جو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے، دلیل میں وہ مقدمات پیش کئے جائیں جو مشہور و معروف ہوں، تاکہ مخاطب کے شکوک دور ہوں، اور وہ ہٹ دھرمی کے راستہ پر نہ پڑ جائے، اور قرآن کریم کی دوسری آیات اس پر شاہد ہیں کہ یہ احسان فی المجادلہ صرف مسلمانوں

کے ساتھ مخصوص نہیں، اہل کتاب کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ قرآن کا ارشاد ہے: وَلَاتُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ اِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَن ،اوردوسری آیت میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو: قُوْلَا لَهُ قَولاً لَيِّناً ، کی ہدایت دے کر یہ بھی بتلا دیا کہ فرعون جیسے سرکش کافر کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنا چاہئے۔

(معارف القرآن ج۵/۴۲۱ نحل: پ۱۵)

مجتہد کی تعریف اور اس کے شرائط

(مجتہد کی تعریف اور اس کے شرائط کا تذکرہ کرتے ہوئے) حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ محدث دہلوی اپنی کتاب عقدالجید میں فرماتے ہیں:

ولا بأس أن يورد كلام البغوى فى هذا الموضع قال البغوى والمجتهد من جمع خمسة أنواع من العلم علم كتاب الله عزوجل وعلم سنة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وعلم أقاويل علماء السلف من اجماعهم واختلافهم وعلم اللغة وعلم القياس وهو طريق استنباط الحكم عن الكتاب والسنة إذا لم يجده صريحا فى نص كتاب او سنةاو اجماع الخ

ترجمہ: اور کچھ مضائقہ نہیں کہ بغوی کا قول اس مقام میں یعنی بیان شرط اجتہاد میں ذکر کیا جائے، بغوی نے کہا ہے کہ مجتہد وہ عالم ہے کہ پانچ طرح کے علم کا حاوی ہو۔

اول: علم کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کا۔

دوم: علم حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

سوم: علم علماء سلف کے اقوال کا کہ ان کا اتفاق کس قول پر ہے اور اختلاف کس قول میں۔

چہارم علم لغۃ عربی کا۔

پنجم: علم قیاس کا اور قیاس طریقہ حکم کے نکالنے کا قرآن وحدیث سے ہے، جس صورت میں کہ حکم مذکور صریح قرآن یا حدیث یا اجماع کے نصوص میں مجتہد نہ پائے۔

(اب ان پانچوں علموں کی مقدار مفصل معلوم کرنی چاہئے کہ مجتہد کو ہر ایک علم کتنا سیکھنا چاہئے) تو قرآن کے علم میں سے اس پر ان باتوں کا جاننا واجب ہے، ناسخ ومنسوخ، مجمل اور مفسّر، خاص اور عام، محکم اور متشابہ، کراہت اور تحریم، اباحت اور استحباب اور وجوب کا جاننا۔

اور حدیث میں سے ان اشیاء مذکورہ کا جاننا، اور نیز صحیح حدیث اور ضعیف اور مسند اور مرسل کا جاننا، اور حدیث کا مرتب کرنا قرآن پر اور قرآن کا حدیث پر جاننا حتیٰ کہ اگر کوئی ایسی حدیث پاوے جس کا ظاہر موافق قرآن کے نہ ہو تو اس کی مطابقت کی صورت کا سراغ لگا سکے، کیونکہ حدیث بیان قرآن مجید کا ہے، مخالف قرآن نہیں کہ مطابقت نہ ہو سکے۔

اور احادیث میں سے صرف ان حدیثوں کا جاننا واجب ہے جو شرعی احکام کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، نہ ان کے سوا اور حدیثوں کا جاننا جن میں حکایات اور اخبار اور نصائح مذکور ہیں۔

اسی طرح زبانِ عربی کے ان الفاظ کا جاننا واجب ہے جو قرآن وحدیث کے احکامی امور میں واقع ہوئے ہیں نہ یہ کہ سب لغت عربی کو جانے۔

اور اقوال صحابہ اور تابعین میں سے اس قدر جانے جو در بابِ احکام منقول ہیں اور بڑا حصہ ان فتووں کا جانے جو امت کے فقہاء نے دیئے ہیں، تا کہ اس کا حکم مخالف سلف کے اقوال نہ پڑے، ورنہ اس صورت میں اجماع کی مخالفت ہوگی، اور جب ان پانچوں اقسام کے علموں میں سے بڑا حصہ جانتا ہوگا تو وہ شخص اس وقت

مجتہد ہوگا، اور اگر ان علوم پنجگانہ میں سے ایک قسم سے بھی ناواقف ہو تو اس کی سبیل دوسرے کی تقلید کرنا ہے، اگرچہ وہ شخص ایک مذہب میں کسی کے ائمہ سلف میں سے ماہر کامل ہو۔

اور اس شخص پر جو ان شرطوں کا جامع نہیں، تقلید کرنی شخصِ جامع کی واجب ہے ان حادثوں میں کہ اس کو پیش آویں۔ تمام ہوا کلام بغوی کا۔

(عقد الجید، مسئلہ تقلید شخصی، جواہر الفقہ ص ۲۱، ۲۲، ج ۱)

محراب کی تعریف

محراب دراصل بالاخانہ یا کسی مکان کے سامنے کے حصہ کو کہتے ہیں، پھر خاص طور سے مسجد یا عبادت خانہ کے سامنے کے حصہ کو کہا جانے لگا قرآن کریم میں یہ لفظ عبادت گاہ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ مسجد کے دائرہ نما محرابیں جیسی آج کل معروف ہیں یہ عہد نبوی میں موجود نہیں تھیں۔ (روح المعانی)

(معارف القرآن ۵۰۳، ج ۷، سورہ ص)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد تک امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو ایک علاحدہ مکان کی حیثیت سے بنانے کا رواج نہیں تھا، قرون اولیٰ کے بعد سلاطین نے اس کا رواج اپنے تحفظ کے لئے دیا اور عام مسلمانوں میں اس کا رواج اس مصلحت سے بھی ہوا کہ امام جس جگہ کھڑا ہوتا ہے وہ پوری صف خالی رہتی ہے، نمازیوں کی کثرت اور مساجد کی تنگی کے پیش نظر صرف امام کے کھڑے ہونے کی جگہ دیوار قبلہ میں گہری کر کے بنادی جاتی ہے تاکہ اس کے پیچھے پوری صفوف کھڑی ہوسکے، چونکہ یہ طریقہ قرون اولی میں نہ تھا اس لئے بعض علماء نے اس کو بدعت کہہ دیا ہے اور تحقیق اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر اس طرح کی محرابیں نمازیوں کی سہولت اور مسجد کے مصالح کے پیش نظر بنائی جائیں اور ان کو سنت مقصودہ نہ سمجھا جائے تو ان کو

بدعت کہنے کی کوئی وجہ نہیں، ہاں اس کو سنت مقصودہ بنالیا جائے اس کے خلاف کرنے والے پر نکیر ہونے لگے تو اس غلو سے یہ عمل بدعت میں داخل ہوسکتا ہے۔

(معارف القرآن ص ۲۶۸، ج ۷، سورہ سبا پ ۲۲)

مُحصَرعن الحج والعمرہ کی تعریف

محصر عن الحج والعمرہ یعنی جس کو احرام باندھنے کے بعد کسی وجہ سے دخول مکہ سے روک دیا گیا ہو اس پر باتفاق یہ تو لازم ہے کہ قربانی کرکے احرام سے حلال ہو لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ قربانی اسی جگہ ہوسکتی ہے جہاں وہ روک دیا گیا ہے یا دوسری قربانیوں کی طرح اس کے لئے بھی حدود حرم کے اندر ہونا شرط ہے، حنفیہ کے نزدیک اس کے لئے بھی حدود حرم شرط ہیں (معارف القرآن ص ۸۶، ج ۸، فتح، پ ۲۶)

مُحصَن کی تعریف

مُحصَن کی شرعی تعریف اصل میں یہ ہے کہ جس شخص نے نکاح صحیح کے ساتھ اپنی زوجہ سے مباشرت کرلی ہو اور وہ عاقل بھی ہو، مراد احکام میں سب جگہ یہی مفہوم ہے، تعبیر کی سہولت کے لئے شادی شدہ کا لفظ لکھا جاتا ہے، اس مقام پر جہاں جہاں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے الفاظ احقر نے لکھے ہیں ان الفاظ کو ایک آسان تعبیر کی حیثیت سے لکھا گیا ہے، اصل الفاظ ''مُحصَن'' اور ''غیر محصن'' یا ثیّب اور بکر کے حدیث میں آئے ہیں۔ (معارف القرآن سورہ نور پ ۱۸، ص ۳۴۸ ج ۶)

محکمات اور متشابہات کی تعریف

قرآن مجید میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہے، ایک قسم کو محکمات کہتے ہیں اور دوسری کو متشابہات، محکمات ان آیات کو کہتے ہیں جن کی مراد ایسے شخص پر بالکل ظاہر

اور بیّن ہو جو قواعد عربیہ کو اچھی طرح جاننے والا ہو، اور جن آیات کی تفسیر اور معانی ایسے شخص پر ظاہر نہ ہوں ان کو متشابہات کہتے ہیں۔ (مظہری)

(معارف القرآن سورہ آل عمران پ ۳، ص ۲۰ ج ۲)

مُخبِت کی تعریف

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ (سورہ حج، پ ۱۷)

لفظ "خبـــــــت" عربی زبان میں پست زمین کے معنی میں آتا ہے، اسی لیے "خبیــت" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنے آپ کو حقیر سمجھے، اسی لیے حضرت قتادہ ومجاہد نے مخبتین کا ترجمہ مواضعین سے کیا ہے، عمرو بن اوس فرماتے ہیں کہ مخبتین وہ لوگ ہیں جو لوگوں پر ظلم نہیں کرتے، اور اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو اس سے بدلہ نہیں لیتے۔ سفیان نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی قضاء وتقدیر پر راحت وکلفت فراخی اور تنگی ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔ (معارف القرآن ۲۶۶/۶، حج پ ۱۷)

مدارات، مواساۃ، موالات کی تعریف

دو شخصوں یا دو جماعتوں میں تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں، ایک درجہ تعلق کا قلبی موالات یا دلی مؤدت ومحبت ہے، یہ صرف مومنین کے ساتھ مخصوص ہے غیر مومن کے ساتھ مومن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔

دوسرا درجہ مواسات کا ہے جس کے معنی ہیں ہمدردی وخیر خواہی اور نفع رسانی کے، یہ بجز کفار اہل حرب کے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہیں، باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ سورہ ممتحنہ کی آٹھویں آیت میں اس کی تفصیل بیان کی گئی جس میں ارشاد ہے: لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ.

یعنی اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا ان سے جو لڑتے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ احسان اور انصاف کا سلوک کرو۔

تیسرا درجہ مدارات کا ہے جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ کے، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جب کہ اس سے مقصود ان کو دینی نفع پہنچانا ہو، یا وہ اپنے مہمان ہوں یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو، سورہ آل عمران کی آیت مذکورہ میں **اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقَاة**، سے یہی درجہ مدارات کا مراد ہے، یعنی کافروں سے موالات جائز نہیں، مگر ایسی حالت میں جب کہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو، اور چونکہ مدارات میں بھی صورت موالات کی ہوتی ہے، اس لیے اس کو موالات سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ (بیان القرآن)

اس تفصیل سے آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ قلبی اور دلی دوستی و محبت تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں جائز نہیں، اور احسان و ہمدردی و نفع رسانی بجز اہل حرب کے اور سب کے ساتھ جائز ہے، اسی طرح ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ بھی سب کے ساتھ جائز ہے، جب کہ اس کا مقصد مہمان کی خاطر داری یا غیر مسلموں کو اسلامی معلومات اور دینی نفع پہنچانا یا اپنے آپ کو ان کے کسی نقصان و ضرر سے بچانا ہو۔

(معارف القرآن ۲/۵۰، سورۂ آل عمران پ ۳)

مدعی اور مدعیٰ علیہ کی تعریف

نزاع میں جو امر زائد کا مُثبِت ہو وہ ''مدعی'' اور دوسرا ''مدعیٰ علیہ'' کہلاتا ہے۔

(معارف القرآن ۳/۲۵۷، سورہ پ:۷)

مداہنت کی تعریف

وَدُّوا لَو تُدهِنُ فَيُدهِنُونَ (سورہ القلم، پ ۲۹)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار و فجّار کے ساتھ یہ سودا کرلینا کہ ہم تمہیں کچھ

نہیں کہتے تم ہمیں کچھ نہ کہو، یہ مداہنے فی الدین اور حرام ہے۔(مظہری)

یعنی بلا کسی اضطرار و مجبوری کے ایسا معاہدہ جائز نہیں۔

(معارف القرآن ص ۵۳۳، ج ۸ سورہ القلم، پ ۲۹)

مُرتد کی تعریف

جب کوئی مسلمان احکام اسلام کی کھلی مخالفت اور انکار کرنے لگے تو وہ اصطلاح شرع میں مُرتد کہلاتا ہے، اس کے ساتھ شریعت اسلام میں کوئی مصالحت نہیں، بجز اس کے کہ وہ تائب ہو کر پھر مسلمان ہو جائے، اور احکامِ اسلام کو قولاً و عملاً تسلیم کرلے ورنہ پھر اس کو قتل کیا جائے گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات اور صحابہ کرام کے اجماعی تعامل سے ثابت ہے، مسیلمہ کذاب اور اس کی جماعت کے خلاف باجماع صحابہ جنگ و جہاد اور مسیلمہ کا قتل اس کی کافی شہادت ہے۔

(معارف القرآن ۲۳۵، ج ۷، سورہ احزاب، پ ۲۲)

مرض الموت کی تعریف

اگر کسی شخص کا مرض عادتاً مہلک سمجھا جاتا ہو تب تو باوجود کاروبار کر لینے کے بھی یہ شخص مریض کہا جائے گا، اور اگر مرض مہلک نہ ہو تو پھر یہ تفصیل ہے کہ اگر گھر سے باہر کے کاروبار کرنے سے عاجز نہ تھا تو تندرست سمجھا جائے گا ورنہ مریض۔ واللہ اعلم

(امداد المفتین ص ۸۶۴، ج ۲)

مسافر شرعی کی تعریف

سفر شرعی جس کے لیے احکام مخصوص ہیں تین شرطوں پر موقوف ہے، اول یہ کہ سفر کم از کم اتنی دور کا ہو جس کو پیادہ چلنے والے بسہولت تین دن میں قطع کر سکیں خواہ ریل وغیرہ کے ذریعہ ایک دو گھنٹہ میں قطع ہو سکتا ہو، جس کی مقدار آج کل تقریباً ۴۸

میل (یعنی ۸ے کلومیٹر) ہے مگر پہاڑ اور دریا میں یہ تعداد معتبر نہ ہوگی، بلکہ تجربہ سے جو مقدار تین روز کی مسافت ثابت ہو وہی ٹھیک سمجھی جاوے گی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ابتداء سفر ہی سے اتنی دور جانے کا قصد ہو، اور اگر ابتداء سے دس بیس میل کے سفر کا قصد کر کے گھر سے نکلا اور وہاں پہنچ کر پھر آگے جانے کی ضرورت پیش آ گئی اور یہاں سے تیس میل اور آگے چلا گیا اور وہاں پہنچ کر پھر آگے جانے کی ضرورت ہوئی تو یہ شخص اس وقت تک شرعی مسافر نہ کہلائے گا جب تک کہ ایک دفعہ ۴۸ میل (۸ے کلومیٹر) کا قصد نہ کرے، خواہ ساری عمر پھرتا رہے اور ساری دنیا میں پھر آئے۔ (شامی)

تیسری شرط یہ ہے کہ سفر کا قصد کر کے اپنی جائے اقامت کی آبادی سے باہر نکل جائے، محض قصد کر لینے سے مسافر نہ ہوگا۔ اپنی بستی سے باہر نکلتے ہی اس پر مسافر کے احکام جاری ہو جائیں گے، اگر چہ اپنی بستی کے باغات یا ریلوے اسٹیشن کے حدود میں ہو جب کہ اسٹیشن آبادی سے باہر ہو ورنہ اگر اسٹیشن آبادی کے اندر یا اس سے ملا ہوا ہے، تو اسٹیشن پر وہ مسافر شرعی نہ ہوگا۔

(جواہر الفقہ، احکام السفر جدید ۳/۴ے)

مسبوق، مدرک، لاحق، مؤتم کی تعریف

''مدرک'' وہ شخص ہے جس نے پوری نماز امام کی اقتداء میں پڑھی ہو۔

''لاحق'' وہ شخص ہے جو ابتداءً امام کے سات شریک نماز ہوا، مگر بعد میں کسی عذر سے یا بلا عذر اس کی تمام رکعتیں یا بعض رکعتیں رہ گئیں۔

''مسبوق'' جو ابتداء میں امام کے ساتھ شریک نماز نہ تھا ایک یا چند رکعتیں گزرنے کے بعد شریک ہوا۔

مسبوق اور لاحق کے احکام میں اہم فرق یہ ہے کہ لاحق اپنی تمام نماز میں

مقتدی کا حکم رکھتا ہے، اسی لئے فوت شدہ رکعات میں بھی قرأت نہ کرے گا، اور مسبوق اپنی فوت شدہ رکعات میں منفرد کا حکم رکھتا ہے، اسی لئے ان رکعتوں میں اس کو قرأت کرنا چاہئے۔

''مؤتم'' کا لفظ کبھی تو مطلق مقتدی کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے اور اس اطلاق میں یہ لفظ مدرک اور لاحق اور مسبوق سب کو شامل ہے، اور کبھی لفظ مؤتم خاص مدرک کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے تو اب یہ مسبوق اور لاحق کے مقابل ہو جائے گا۔

(امداد المفتین، ص ۲۹۵، ج ۲

مسجد کی تعریف

وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلاَ تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا، (سورہ جن، پ ۲۹)

''مساجد'' جمع مسجد ہے، یہاں اس کے معروف و مشہور معنیٰ بھی لئے جا سکتے ہیں جو عبادت کے لئے وقف کی جاتی ہیں، اور مسجد کہلاتی ہیں، اس صورت میں معنیٰ آیت کے یہ ہوں گے کہ جب سب مساجد صرف اللہ کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں تو تم مسجدوں میں جا کر اللہ کے سوا کسی اور کو مدد کے لئے نہ پکارو۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسجَد بفتح الجیم کی جمع ہو جو مصدر میمی بمعنیٰ سجدہ آتا ہے تو معنیٰ آیت کے یہ ہوں گے کہ سب سجدے صرف اللہ کے لئے مخصوص ہیں اور جو شخص غیر اللہ کو اعانت کے لئے پکارتا ہے گویا وہ اس کو سجدہ کرتا ہے، غیر اللہ کے سجدہ سے اجتناب کرو، باجماع امت غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام ہے، اور بعض علماء کے نزدیک کفر ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ ص ۵۸۱ سورہ جن پ ۲۹)

مسجد شرعی کی تعریف

مسجد شرعی وہ ہے کہ کوئی ایک شخص یا چند اشخاص اپنی مملوکہ زمین کو مسجد کے نام سے

اپنی ملک سے جُدا کردیں، اور اس کا راستہ شاہِ راہ عام کی طرف کھول کر عام مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دیں، جب ایک مرتبہ اذان و جماعت کے ساتھ اس جگہ میں نماز پڑھ لی جائے تو یہ جگہ مسجد ہو جائے گی۔ (امداد المفتین ص ۶۳۵، ج ۲)

مسجد اور صومعہ اور بِیعہ کی تعریف

مسجد مسلمانوں کی عبادت گاہوں کا نام ہے، ''صوامع'' صومعہ کی جمع ہے، جو نصاریٰ کے تارک الدنیا راہبوں کی مخصوص عبادت گاہوں کو کہا جاتا ہے، اور ''بِیَع'' بیعۃ کی جمع ہے، جو نصاریٰ کے عام کنیسہ کا نام ہے، اور ''صلوات'' صلوٰت کی جمع ہے جو یہود کے عبادت خانے کا نام ہے۔ (معارف القرآن سورہ حج پ ۱۷، ص ۲۵۸ ج ۶)

مسجد اقصیٰ کی تعریف

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے تو آپ نے فرمایا کہ مسجد حرام ہے، پھر میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد کون سی؟ تو آپ نے فرمایا ''مسجد اقصیٰ'' میں نے دریافت کیا کہ ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا چالیس سال، پھر فرمایا کہ (مسجدوں کی ترتیب تو یہ ہے) لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ساری زمین کو مسجد بنادیا ہے جس جگہ نماز کا وقت آجائے وہیں نماز ادا کرلیا کرو۔ (رواہ مسلم)

اور مسجد اقصیٰ کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے۔

(رواہ النسائی باسناد صحیح عن عبداللہ بن عمرؓ تفسیر قرطبی ص ۱۳۷، ج ۴) (معارف القرآن ج ۵، ص ۴۴۳)

مسجد حرام کی تعریف

مسجد حرام کا لفظ عام طور پر تو اس جگہ کے لیے بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کے گرد

چہار دیواری سے گھری ہوئی ہے، لیکن قرآن وحدیث میں بعض اوقات یہ لفظ پورے حرم مکہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جو کئی میل مربع کا رقبہ اور چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل علیہ الصلوۃ والسلام کی قائم کردہ حدود سے گھرا ہوا ہے، جیسا کہ واقعہ معراج میں من المسجد الحرام سے باتفاق یہی معنی مراد لیے گئے ہیں، کیونکہ واقعۂ معراج معروف مسجد حرام کے اندر سے نہیں بلکہ حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان سے ہوا ہے، اسی طرح آیت کریمہ **اِلَّا الَّذِیْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** میں مسجد حرام سے پورا حرم ہی مراد ہے کیونکہ جس واقعۂ صلح کا اس میں ذکر ہے وہ مقام حدیبیہ پر ہوا ہے، جو حدود حرم سے باہر اس کے متصل واقع ہے۔

(معارف القرآن سورہ توبہ ۳۵۴/۴)

مسجد حرام اس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنی ہوئی ہے اور بعض اوقات پورے حرم کو بھی مسجد حرام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے دو روایتوں کا یہ تعارض بھی رفع ہو جاتا ہے کہ بعض روایات میں آپ کا اسراء کے لئے تشریف لے جانا حضرت اُمّ ہانی کے مکان سے منقول ہے اور بعض میں حطیم بیت اللہ سے، اگر مسجد حرام کے عام معنیٰ لئے جائیں تو یہ کچھ مستبعد نہیں کہ پہلے اُمّ ہانیؓ کے مکان میں ہو، وہاں سے چل کر حطیم کعبہ میں تشریف لائے پھر وہاں سے سفر اسراء کی ابتدا ہوئی۔ واللہ اعلم (معارف القرآن ۴۴۳، ج ۵، بنی اسرائیل پ ۱۵)

مسجد ضرار کی تعریف

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا، (سورہ توبہ پ ۱۱)

یعنی جس طرح اوپر دوسرے منافقین کے عذاب اور ذلت و رسوائی کا ذکر ہوا ہے یہ منافقین بھی ان میں شامل ہیں جنہوں نے مسجد کا نام رکھ کر ایک ایسی عمارت بنائی جس کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔

اس آیت میں مسجد مذکور کے بنانے کی تین غرضیں ذکر کی گئی ہیں۔

اوّل ضِـرَاراً یعنی مسلمانوں کونقصان پہنچانے کے لیے، لفظ ''ضرر'' اور ''ضرار'' دونوں عربی زبان میں نقصان پہنچانے کے معنی میں مستعمل ہوتے ہیں، بعض حضرات نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ ''ضرر'' تو اس نقصان کو کہا جاتا ہے جس میں اس کے کرنے والے کا اپنا تو فائدہ ہو دوسروں کونقصان پہنچے، اور ''ضرار'' دوسروں کو وہ نقصان پہنچانا ہے جس میں اس پہنچانے والے کا اپنا کوئی فائدہ بھی نہیں، چونکہ اس مسجد کا انجام یہی ہونے والا تھا کہ بنانے والوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے، اس لیے یہاں لفظ ضرار استعمال کیا گیا۔

دوسری غرض اس مسجد کی تَـفْـرِيْـقًـا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْن بتلائی گئی ہے، یعنی ان کا مقصد اس مسجد کے بنانے سے یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی جماعت کے دو ٹکڑے ہوجاویں، ایک ٹکڑا اس مسجد میں نماز پڑھنے والوں کا الگ ہوجائے اور یہ کہ قدیم مسجد قباء کے نمازی گھٹ جائیں، اور کچھ لوگ یہاں نماز پڑھا کریں۔

تیسری غرض اِرْصَاداً لِمَنْ حَارَبَ الله بتلائی گئی جس کا حاصل یہ ہے کہ اس مسجد سے یہ کام بھی لینا تھا کہ یہاں اللہ اور رسول کے دشمنوں کو پناہ ملے اور وہ یہاں مسلمانوں کے خلاف سازش کیا کریں۔

اس مجموعہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ جس مسجد کو قرآن کریم نے مسجد ضرار قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو ڈھایا گیا اور آگ لگائی گئی، درحقیقت نہ وہ مسجد تھی نہ اس کا مقصد نماز پڑھنے کے لیے تھا، بلکہ مقاصد وہ تین تھے جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ آج کل اگر کسی مسجد کے مقابلہ میں اس کے قریب کوئی دوسری مسجد کچھ مسلمان بنالیں اور بنانے کا مقصد یہی باہمی تفرقہ اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ اغراض فاسدہ ہوں تو اگرچہ ایسی مسجد بنانے والے کو

ثواب تو نہ ملے گا بلکہ تفریق بین المومنین کی وجہ سے گناہگار ہوگا، لیکن بایں ہمہ اس جگہ کو شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا، اور تمام آداب اور احکام مساجد کے اس پر جاری ہوں گے، اس کا ڈھانا آگ لگانا جائز نہیں ہوگا، اور جو لوگ اس میں نماز پڑھیں گے ان کی نماز بھی ادا ہو جائے گی، اگرچہ ایسا کرنا فی نفسہ گناہ رہے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس طرح ریا و نمود کے لیے یا ضد و عناد کی وجہ سے جو مسلمان کوئی مسجد بنالے اگرچہ بنانے والے کو مسجد کا ثواب نہ ملے گا بلکہ گناہ ہوگا، مگر اس کو اصطلاح قرآن والی مسجد ضرار نہیں کہا جائے گا، بعض لوگ جو اس طرح کی مسجد کو مسجد ضرار کہہ دیتے ہیں یہ درست نہیں، البتہ اس کو مسجد ضرار کے مشابہ کہہ سکتے ہیں، اس لیے اس کے بنانے کو روکا بھی جاسکتا ہے، جیسا کہ حضرت فاروقؓ نے ایک فرمان جاری فرمایا تھا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد نہ بنائی جائے جس سے پہلی مسجد کی جماعت اور رونق متاثر ہو۔ (تفسیر کشاف)

اس مسجد ضرار کے متعلق دوسری آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے **لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا**، اس میں قیام سے مراد نماز کے لیے قیام ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ اس نام کی مسجد میں ہرگز نماز نہ پڑھیں۔

اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی اگر کوئی نئی مسجد پہلی مسجد کے متصل بلا کسی ضرورت کے محض ریا و نمود کے لیے یا ضد و عناد کی وجہ سے بنائی جائے تو اس میں نماز پڑھنا بہتر نہیں اگرچہ نماز ہو جاتی ہے۔ (معارف القرآن ۴/۴۶۴، سورۂ توبہ پ ۱۱)

مسجد ضرار کی تعریف اور اس کا حکم

مسجد ضرار اصل میں وہ مسجد تھی جس کو منافقین نے اس غرض سے بنایا تھا کہ مسجد قبا کی جماعت میں تفریق پیدا ہو، اور مسلمانوں میں اس تفریق سے آپس میں الفت کم ہو۔

نیز منافقین اس میں جمع ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن وتشنیع وغیرہ کیا کریں۔

قرآن مجید نے اس مسجد کے متعلق حکم فرمایا ''لا تقم فیہ ابداً '' آپ اس مسجد میں کبھی کھڑے نہ ہوں جس کا یہ مطلب ہے کہ اس مسجد میں ہرگز نماز نہ پڑھیں اس لیے مسلمانوں پر واجب ہے کہ جب مسجد بنائیں اس کا خیال رکھیں کہ اس کی غرض کسی اور مسجد کی جماعت کم کرنا یا مسلمانوں میں تفریق ڈالنا یا فخر ومباہات ہرگز نہ ہو، ورنہ نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق ہوگا اور یہ مسجد ضرار کے مشابہ ہوگی۔

(جواہر الفقہ جدید ۱۲۵/۳)

مسکین کی تعریف

مسکین کی تعریف بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو، مگر اس آیت (اَمَّا السَّفِیْنَةُ فَکَانَتْ لِمَسَاکِیْنَ) سے معلوم ہوا کہ مسکین کی صحیح تعریف یہ ہے کہ جس کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ اس کی حاجات اصلیہ ضروریہ سے زائد بقدر نصاب ہوجائے، کیونکہ جن لوگوں کو اس آیت میں مساکین کہا گیا ہے ان کے پاس کم از کم ایک کشتی تو تھی جس کی قیمت مقدار نصاب سے کم نہیں ہوتی، مگر چونکہ وہ حاجات اصلیہ ضروریہ میں مشغول تھی اس لیے ان کو مساکین ہی کہا گیا۔ (مظہری)

(معارف القرآن ۶۲۰/۵، سورہ کہف پ:۱۶)

مسلم کی تعریف

مسلمین، مسلم کی جمع ہے، جس کے لغوی معنیٰ مطیع وفرمانبردار کے ہیں، اصطلاح شرع میں مومن کو مسلم کہا جاتا ہے۔

(معارف القرآن ج۶/ ۵۸۵، نمل: پ۱۹)

مسلم اور اسلام کی تعریف

اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ (قصص: پ ۲۰) یعنی ان حضرات اہل کتاب نے کہا کہ ہم قرآن کے نازل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے، یہاں لفظ مسلم اگر اپنے لغوی معنیٰ میں لیا جائے، یعنی مطیع وفرمانبردار تو بات صاف ہے کہ ان کو جو یقین قرآن اور نبی آخرالزماں پر اپنی کتابوں کی وجہ سے حاصل تھا اس یقین کو اسلام اور مسلمین سے تعبیر فرمایا کہ ہم تو پہلے ہی سے اس کو مانتے تھے، اور اگر لفظ مسلمین اس جگہ اس معنیٰ میں لیا جائے جس کے لحاظ سے امت محمدیہ کا لقب مسلمین ہے تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اسلام اور مسلمین کا لفظ امت محمدیہ کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین اسلام ہی تھا، اور وہ سب مسلمین ہی تھے، مگر قرآن کریم کی بعض آیات سے اسلام اور مسلمین کا اس امت کے لئے مخصوص لقب ہونا معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول خود قرآن نے نقل کیا ہے، هُوَ سَمَّاکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ، اور علامہ سیوطی اسی خصوصیت کے قائل ہیں، اور اس مضمون پر ان کا ایک مستقل رسالہ ہے، ان کے نزدیک اس آیت میں مسلمین سے مراد یہ ہے کہ ہم تو پہلے ہی سے اسلام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ اور تیار تھے، اور اگر غور کیا جائے تو ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کے دین کا مشترک نام بھی ہو اور اس امت کے لئے مخصوص لقب بھی، کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اسلام اپنے معنیٰ وصفی کے اعتبار سے سب میں مشترک ہو، مگر مسلم کا لقب صرف اس امت کے لئے مخصوص ہو، جیسے صدیق اور فاروق وغیرہ کے القاب ہیں جن کا مصداق خاص اس امت میں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہیں، حالانکہ اپنے معنیٰ وصفی کے اعتبار سے دوسرے حضرات بھی صدیق اور فاروق ہوسکتے ہیں۔

(معارف القرآن ج ۶/ ۶۴۵، قصص: پ ۲۰)

مسلمان اور کافر کی تعریف

مسلمان وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری کا اقرار کرے، بشرطیکہ دل میں بھی ان کی تصدیق رکھتا ہو۔

کافر وہ شخص ہے جو ان میں سے کسی ایک چیز کا دل سے انکار یا زبان سے تکذیب کردے۔ (جواہر الفقہ ۱/۵۸)

مشعر حرام کی تعریف

''مشعر حرام'' ایک پہاڑ کا نام ہے جو مزدلفہ میں واقع ہے، مشعر کے معنیٰ شعار اور علامت کے ہیں، اور حرام بمعنیٰ محترم ومقدس کے ہے، معنیٰ یہ ہے کہ پہاڑ شعار اسلام کے اظہار کے لئے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں، اس میدان میں رات گذارنا اور مغرب وعشاء دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مزدلفہ میں پڑھنا واجب ہے، دونوں نمازوں کو ایک وقت یعنی مغرب کو عشاء کے ساتھ ادا کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے۔

(معارف القرآن ج۱ ص ۴۸۸ سورہ بقرہ پ۲)

مضطر کی تعریف

مضطر شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی جان خطرہ میں ہو، معمولی تکلیف یا ضرورت سے مضطر نہیں کہا جاسکتا، تو جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچ گیا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو جان جاتی رہے گی، اس کے لیے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیزیں (خنزیر، مردار، شراب وغیرہ) کھالینے کی گنجائش دی گئی ہے، ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو، کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لیے کافی ہو، پیٹ بھر کر کھانا یا قدر

ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔ (معارف القرآن سورہ بقرہ ۱؍۴۲۵)

مضطر اضطرار سے مشتق ہے، کسی ضرورت سے مجبور و بے قرار ہونے کو اضطرار کہا جاتا ہے، اور وہ جبھی ہوتا ہے جب اس کا کوئی یار و مددگار اور سہارا نہ ہو، اسی لئے مضطر وہ شخص ہے جو سب دنیا کے سہاروں سے مایوس ہو کر خالص اللہ تعالیٰ ہی کو فریاد رس سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہو۔ مضطر کی یہ تفسیر سدّی، ذوالنون مصری سہل بن عبداللہ وغیرہ سے منقول ہے۔ (قرطبی) (معارف القرآن ۶،۵۹۵ سورہ نمل پ ۲۰)

معاہدہ کی تعریف، معاہدہ کی دو قسمیں اور وعدہ و معاہدہ کا فرق

عہد دو طرح کے ہیں ایک وہ جو بندہ اور اللہ کے درمیان ہیں، جیسے ازل میں بندہ کا یہ عہد کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے، اس عہد کا لازمی اثر اس کے احکام کی اطاعت اور اس کی رضا جوئی ہوتا ہے، یہ عہد تو ہر انسان نے ازل میں کیا ہے خواہ دنیا میں وہ مومن ہو یا کافر۔ دوسرا عہد مومن کا ہے جو شہادت ان لا الہ الا اللہ کے ذریعہ کیا گیا ہے، جس کا حاصل احکام الٰہیہ کا مکمل اتباع اور اس کی رضا جوئی ہے۔

دوسری قسم عہد کی وہ ہے جو انسان کسی انسان سے کرتا ہے جس میں تمام معاہدات سیاسی، تجارتی، معاملاتی شامل ہیں، جو افراد یا جماعتوں کے درمیان دنیا میں ہوتے ہیں۔

پہلی قسم کے تمام معاہدات کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے اور دوسری قسم میں جو معاہدات خلاف شرع نہ ہوں ان کا پورا کرنا واجب اور جو خلاف شرع ہوں ان کو اطلاع کر کے ختم کر دینا واجب ہے، جس معاہدہ کا پورا کرنا واجب ہے اگر کوئی فریق پورا نہ کرے تو دوسرے کو حق ہے کہ عدالت میں مرافعہ کر کے اس کو پورا کرنے پر مجبور کرے، معاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ دو فریق کے درمیان کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد ہو اور جو کوئی شخص کسی سے یک طرفہ وعدہ کر لیتا ہے کہ میں آپ کو فلاں چیز دوں گا یا فلاں وقت

آپ سے ملوں گا یا آپ کا فلاں کام کردوں گا، اس کا پورا کرنا بھی واجب ہے، اور بعض حضرات نے اس کو بھی عہد کے اس مفہوم میں داخل کیا ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ معاہدہ پر مجبور کرسکتا ہے مگر یک طرفہ وعدہ کو عدالت کے ذریعہ جبراً پورا نہیں کرا سکتا، ہاں بلا عذر شرعی کے کسی سے وعدہ کرکے جو خلاف ورزی کرے گا وہ شرعاً گناہ گار ہوگا، حدیث میں اس کو عمل نفاق قرار دیا گیا ہے۔

(معارف القرآن، ۴۶۸، ج ۵، سورہ بنی اسرائیل، پ ۱۵)

معجزہ اور کرامت کی تعریف

انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بہت سے ایسے کام وجود میں آتے ہیں جو عام انسانوں کی قدرت سے خارج ہیں جن کو معجزات کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ کے ذریعہ بھی ایسے ہی بہت سے کام وجود میں آتے ہیں جن کو کرامات کہا جاتا ہے۔

(معارف القرآن ج ۱ ص ۱۰۰ سورہ فاتحہ، پ ۱)

معجزہ اور کرامت کا فرق

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ وہ براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى، اسی طرح کرامت میں بھی اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہوجاتا ہے، اور معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحب معجزہ وکرامت کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے، ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارق عادت کام اگر کسی صاحب وحی نبی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے، غیر نبی کے ذریعہ اس کا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے، اس واقعہ میں اگر یہ روایت صحیح ہے کہ یہ عمل حضرت سلیمان علیہ السلام کے

اصحاب میں سے آصف بن برخیا کے ذریعہ ہوا تو یہ ان کی کرامت کہلائے گی، اور ہر ولی کے کمالات چونکہ ان کے رسول وپیغمبر کے کمالات کا عکس اور انہی سے مستفاد ہوتے ہیں، اس لئے امت کے اولیاء اللہ کے ہاتھوں جتنی کراماتوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے، یہ سب رسول کے معجزات میں شمار ہوتے ہیں۔

(معارف القرآن ج۶/ ۵۸۵)

معجزہ اور جادو کا فرق

اللہ تعالیٰ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو اسی انداز سے ظاہر فرماتے ہیں کہ اگر دیکھنے والے ذرا بھی غور کریں اور ہٹ دھرمی اختیار نہ کریں تو معجزہ اور سحر کا فرق خود بخود سمجھ لیں، سحر کرنے والے عموماً ناپاکی اور گندگی میں رہتے ہیں اور جتنی زیادہ گندگی اور ناپاکی میں ہوں اتنا ہی ان کا جادو زیادہ کامیاب ہوتا ہے، بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ طہارت ونظافت ان کی طبیعتِ ثانیہ ہوتی ہے، اور یہ بھی کھلا ہوا فرق منجانب اللہ ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرنے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا بھی نہیں۔

اور اہل بصیرت تو اصل حقیقت کو جانتے ہیں کہ جادو سے جو چیزیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ سب دائرہ اسباب طبعیہ کے اندر ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اسباب عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ مخفی اسباب ہوتے ہیں، اس لئے وہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ یہ کام بغیر کسی ظاہری سبب کے ہوگیا، بخلاف معجزہ کے کہ اسباب طبعیہ کا مطلق کوئی دخل نہیں ہوتا وہ براہِ راست قدرت حق کا فعل ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ معجزہ اور سحر کی حقیقتیں بالکل مختلف اور متباین ہیں، حقیقت شناس کے لئے تو کوئی التباس کی وجہ ہی نہیں، عوام کو التباس ہوسکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس التباس کو دور کرنے کے لئے بھی ایسے امتیازات رکھ دئے ہیں کہ جس کی وجہ سے لوگ دھوکہ سے بچ جائیں۔ (معارف القرآن ص۲۶، ج۴، اعرف، پ۹)

معروف و منکر کی تعریف

معروف کے لفظی معنی جانا پہچانا ہوا، اور منکر کے لغوی معنی اوپرا، اجنبی جو پہچانا نہ جائے، اس جگہ معروف سے وہ نیک کام مراد ہیں جو شریعت اسلام میں جانے پہچانے ہوئے ہیں، اور منکر سے وہ برے کام جو دین و شریعت سے اجنبی ہیں۔

اس جگہ اچھے کاموں کو معروف کے لفظ سے اور برے کاموں کو منکر کے لفظ سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ دین میں نیک کام صرف اس کو سمجھا جائے گا جو قرن اوّل کے مسلمانوں میں رائج ہوا اور جانا پہچانا گیا، اور جو ایسا نہ ہو وہ منکر کہلائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ و تابعین نے جس کام کو نیک نہیں سمجھا وہ خواہ کتنا ہی بھلا معلوم ہو، از روئے شریعت وہ بھلا نہیں، احادیث صحیحہ میں اسی لیے ان کاموں کو جن کی تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کی طرف سے نہیں پائی جاتی ان کو محدثات الامور اور بدعت فرما کر گمراہی قرار دیا ہے، معنی آیت کے اس جملہ کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کریں گے اور برے کاموں سے منع فرمادیں گے۔ (معارف القرآن ۸۴/۴، سورہ اعراف پ ۹)

لفظ معروف معرفہ سے اور منکر انکار سے ماخوذ ہے معرفہ کہتے ہیں کسی چیز کو غور و فکر کر کے سمجھنے یا پہچاننے کو، اس کے بالمقابل انکار کہتے ہیں نہ سمجھنے یا نہ پہچاننے کو، یہ دونوں لفظ متقابل سمجھے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے: ''یَعْرِفُوْنَ نِعْمَۃَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَہَا''، یعنی اللہ کی قدرت کاملہ کے مظاہر دیکھ کر اس کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں، مگر پھر از روئے عناد انکار کرتے ہیں، گویا ان نعمتوں کو جانتے نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لغوی معنی کے اعتبار سے معروف کے معنی پہچانی ہوئی چیز کے ہیں۔ اور منکر کے معنی ناپہچانی ہوئی چیز کے، امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اسی کی

مناسبت سے اصطلاح شرع میں معروف ومنکر کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ:

''معروف ہر اس فعل کو کہا جاتا ہے جس کا مستحسن یعنی اچھا ہونا عقل یا شرع سے پہچانا ہوا ہو، اور منکر ہر اس فعل کا نام ہے جو از روئے عقل وشرع اوپرا اور نہ پہچانا ہوا ہو، یعنی برا سمجھا جاتا ہو، اس لیے امر بالمعروف کے معنی اچھے کام کی طرف بلانے کے اور نہی عن المنکر کے معنی برے کام سے روکنے کے ہوگئے''۔

(معارف القرآن ۲۵۲/۳، پ۵، سورہ مائدہ)

ائمہ مجتہدین کے مختلف اقوال میں کوئی منکر شرعی نہیں ہوتا

لیکن اس جگہ گناہ وثواب یا طاعت ومعصیت کے بجائے معروف ومنکر کا لفظ استعمال کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ وہ دقیق اور اجتہادی مسائل جن میں قرآن وسنت کے اجمال یا ابہام کی وجہ سے دو رائیں ہوسکتی ہیں، اور اسی بنا پر ان میں فقہاء امت کے اقوال مختلف ہیں، وہ اس دائرہ سے خارج ہیں، ائمہ مجتہدین جن کی شانِ اجتہاد علماء امت میں مسلّم ہے اگر کسی مسئلہ میں ان کے دو مختلف قول ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی منکر شرعی نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس کی دونوں جانبیں معروف میں داخل ہیں، ایسے مسائل میں ایک رائے کو راجح سمجھنے والے کے لیے یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے پر ایسا انکار کرے جیسا کہ گناہ پر کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ وتابعین میں بہت سے اجتہادی اختلافات اور متضاد اقوال کے باوجود یہ کہیں منقول نہیں کہ وہ ایک دوسرے پر فاسق یا گنہگار ہونے کا فتویٰ لگاتے ہوں، بحث وتمحیص اور مناظرے و مکالمے سب کچھ ہوتے تھے، اور ہر ایک اپنی رائے کی ترجیح کی وجوہ بیان کرتا، اور دوسرے پر اعتراض کرتا تھا لیکن کوئی کسی کو اس اختلاف کی وجہ سے گنہگار نہ سمجھتا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجتہادی اختلاف کے موقع پر یہ تو ہر ذی علم کو اختیار ہے کہ جس

جانب کو راجح سمجھے اسے اختیار کرے، لیکن دوسرے کے فعل کو منکر سمجھ کر اس پر انکار کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، اس سے واضح ہوا کہ اجتہادی مسائل میں جنگ وجدل یا منافرت پھیلانے والے مقالات ومضامین امر بالمعروف یا نہی عن المنکر میں داخل نہیں ان مسائل کو محاذ جنگ بنانا صرف ناواقفیت یا جہالت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

(معارف القرآن ۲۵۲/۳، سورہ مائدہ پ:۵)

مقام ابراہیم

وَاتَّخِذُوا مِن مقام اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى.(بقرہ پ۱)

مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر فرماتے تھے، اور بعض روایات میں ہے کہ پتھر تعمیر کی بلندی کے ساتھ ساتھ خود بلند ہوجاتا تھا اور نیچے اترنے کے وقت نیچا ہوجاتا تھا، اس پتھر کے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا گہرا نشان آج تک موجود ہے، ظاہر ہے کہ ایک بے حس و بے شعور پتھر میں یہ ادراک کہ ضرورت کے موافق بلند یا پست ہوجائے، اور یہ تأثر کہ موم کی طرح نرم ہو کر قدمین کا مکمل نقش اپنے اندر لے لے، یہ سب آیاتِ قدرت ہیں جو بیت اللہ کی اعلیٰ فضیلت ہی سے متعلق ہیں، یہ پتھر بیت اللہ کے نیچے دروازے کے قریب تھا، جب قرآن کا یہ حکم نازل ہوا کہ مقام ابراہیم پر نماز پڑھو، وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى، اس وقت طواف کرنے والوں کی مصلحت سے اس کو اٹھا کر بیت اللہ کے سامنے ذرا فاصلہ پر مطاف سے باہر بئر زمزم کے قریب رکھ دیا گیا، اور آج کل اس کو اسی جگہ ایک محفوظ مکان میں مقفل کیا ہوا ہے، طواف کے بعد کی دو رکعتیں اسی مکان کے پیچھے پڑھی جاتی ہیں، حال میں یہ ترمیم ہوئی کہ وہ مکان تو ہٹا دیا گیا اور مقام ابراہیم کو ایک بلّورِی خول کے اندر محفوظ کردیا گیا، مقام ابراہیم اصل میں اس خاص پتھر کا نام ہے اور طواف کے بعد کی

رکعتیں اس کے اوپر یا اس کے پاس پڑھنا افضل ہے، لیکن مقام ابراہیم کے لفظی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ تمام مسجد حرام کو حاوی ہے، اسی لیے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ مسجد حرام کے اندر جس جگہ بھی طواف کی رکعتیں پڑھ لے واجب ادا ہو جائے گا۔

وَاتَّخِذُوا مِن مقام اِبْرَاهِيمَ مُصَلّٰى .اس میں مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے قدم مبارک کا بطور معجزہ نشان پڑ گیا تھا، اور جس کو تعمیر بیت اللہ کے وقت آپ نے استعمال کیا تھا (صحیح بخاری)

حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں نے اس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نقش دیکھا ہے، مگر لوگوں کے بکثرت چھونے اور ہاتھ لگانے سے اب وہ نشان ہلکا پڑ گیا ہے۔ (قرطبی)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مقام ابراہیم کی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ پورا حرم مقام ابراہیم ہے، ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں جن کو مقام ابراہیم پر پڑھنے کا حکم اس آیت میں ہے، اس حکم کی تعمیل پورے حرم میں کسی جگہ بھی یہ رکعتیں پڑھنے سے ہو جائے گی، اس پر اکثر فقہاء امت متفق ہیں۔

(معارف القرآن ۱/۱۲۰ پ۱، ۱/۳۲۲ سورہ بقرہ پ۲)

مقام محمود کی تعریف

عَسٰی اَن یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَاماً مَّحۡمُوۡداً۔ (پ۱۵، بنی اسرائیل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت میں مقام محمود کا وعدہ کیا گیا ہے اور یہ مقام تمام انبیاء میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہے۔

اس کی تفسیر میں اقوال مختلف ہیں مگر صحیح وہ ہے جو احادیث صحیحہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، یہ مقام شفاعت کبریٰ کا ہے کہ میدان حشر میں جس وقت تمام بنی آدم جمع ہوں گے، اور ہر نبی و پیغمبر سے شفاعت کی درخواست کریں

گے تو تمام انبیاء علیہم السلام عذر کر دیں گے، صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف عطا ہوگا کہ تمام بنی آدم کی شفاعت فرماویں گے، تفصیل اس کی روایات حدیث میں طویل ہے۔

ابن ماجہ اور بیہقی میں بروایت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ منقول ہے کہ آنحضرت صلی علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اول انبیاء علیہم السلام گناہگاروں کی شفاعت کریں گے، پھر علماء، پھر شہداء۔

اور دیلمی نے بروایت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم سے کہا جائے گا کہ آپ اپنے شاگردوں کی شفاعت کر سکتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر ہو۔

ابو داؤد اور ابن حبان نے بروایت ابی الدرداء مرفوعاً نقل کیا ہے کہ شہید کی شفاعت اس کے خاندان کے ستر آدمیوں کے متعلق قبول کی جائے گی۔

(معارف القرآن بنی اسرائیل ۵۰۷/۵)

مکر کی تعریف

عربی لغت کے اعتبار سے لفظ ''مکر'' خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں جو اچھی بھی ہوسکتی ہے، بری بھی، اردو زبان کے محاورہ سے دھوکہ نہ کھائیں کہ لفظ مکر اردو میں دھوکہ فریب کے لئے استعمال ہوتا ہے، جس سے حق تعالیٰ بری ہے۔

(معارف القرآن سورہ یونس پ ۱۱، ص ۵۲۵ ج ۴)

لفظ ''مکر'' کے معنیٰ عربی لغت میں یہ ہیں کہ حیلہ وتدبیر کے ذریعہ اپنے مقابل شخص کو اس کے ارادہ سے روک دیا جائے، پھر اگر یہ کام کسی نیک مقصد سے کیا جائے تو یہ مکر محمود اور اچھا ہے، اور اگر کسی برے مقصد سے کیا جائے تو مذموم اور برا ہے، اس لئے یہ لفظ انسان کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے بھی، مگر اللہ تعالیٰ

کے لئے بھی صرف ایسے ماحول میں استعمال ہوتا ہے جہاں کلام کے سیاق اور تقابل کے ذریعہ مکر مذموم کا شبہ ہو سکے۔ (معارف القرآن سورہ انفال پ ۹ ص ۲۲۲ ج ۴)

''مکر'' عربی زبان میں لطیف وخفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اگر وہ اچھی مقصد کے لئے ہو تو اچھا ہے، اور برائی کے لئے ہو تو برا ہے، اسی لئے: **لَایَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ**. (۳۵:۴۳) میں مکر کے ساتھ ''سیئ'' کی قید لگائی، اردو زبان کے محاورات میں مکر صرف سازش اور بری تدبیر اور حیلہ کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے عربی محاورات پر شبہ نہ کیا جائے، اسی لئے یہاں خدا کو ''خیر الماکرین'' کہا گیا۔

(معارف القرآن ج ۲/۳۷، آل عمران: پ ۳)

ملحد وزندیق کی تعریف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انقطاع وحی کے سبب ان کے پہچاننے کی پہلی صورت تو باقی نہ رہی، مگر دوسری صورت اب بھی موجود ہے جس شخص کے کسی قول وفعل سے اسلامی قطعی عقائد کی مخالفت یا ان پر استہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے مگر وہ اپنے ایمان واسلام کا مدعی بنے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام قرآن کی اصطلاح میں ملحد ہے ''اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اٰیَاتِنَا'' اور حدیث میں اس کو زندیق کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کا کفر دلیل سے ثابت اور واضح ہو گیا، اس لیے اس کا حکم سب کفار جیسا ہو گیا الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے۔ اسی لیے علماء امت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قضیہ ختم ہو گیا، اب جو مؤمن نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت امام مالکؒ سے ''عمدہ'' شرح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زمانۂ نبوت کے نفاق کی یہی صورت ہے جس کو پہچانا جاسکتا ہے اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔ (معارف القرآن ۱/ ۱۲۸، سورۂ بقرہ)

مَلَکُ الموت کی تعریف

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (سجدہ، پ۲۱)

بلفظ مفرد ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد عزرائیل علیہ السلام ہیں، اور ایک دوسری آیت میں فرمایا ہے اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اس میں ملائکہ بلفظ جمع لایا گیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ عزرائیل علیہ السلام تنہا یہ کام انجام نہیں دیتے ان کے ماتحت بہت سے فرشتے اس میں شریک ہوتے ہیں۔

امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ ساری دنیا ملک الموت کے سامنے ایسی ہے جیسے کسی انسان کے سامنے ایک کھلے طشت میں دانے پڑے ہوں وہ جس کو چاہے اٹھالے یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے۔ (معارف القرآن ص ۶۷، ج ۷، سجدہ پ۲۱)

مِلک اور ملوک کی تعریف

لفظ ''ملوک'' ملِک کی جمع ہے، جس کے معنیٰ عرف عام میں بادشاہ کے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ جس طرح پوری قوم نبی اور پیغمبر نہیں ہوتی اسی طرح کسی ملک میں پوری قوم بادشاہ بھی نہیں ہوتی، بلکہ قوم کا ایک فرد یا چند افراد حکمراں ہوتے ہیں، باقی قوم ان کے تابع ہوتی ہے، لیکن قرآنی الفاظ میں ان سب کو ملوک قرار دیا، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عرف عام میں جس قوم کا بادشاہ ہوتا ہے اس کی سلطنت وحکومت کو اسی پوری قوم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

(معارف القرآن سورہ مائدہ پ۶، ص ۹۷ ج ۳)

منازل شمسی وقمری کی تعریف

منازل منزل کی جمع ہے جس کے اصلی معنی جائے نزول کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے

شمس وقمر دونوں کی رفتار کے لیے خاص حدود مقرر فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک کو منزل کہا جاتا ہے، چاند چونکہ اپنا دورہ ہر مہینہ میں پورا کر لیتا ہے، اس لیے اس کی منزلیں تیس یا ۲۹ ہوتی ہیں، مگر چونکہ ہر مہینہ میں چاند کم از کم ایک دن غائب رہتا ہے اس لیے عموماً چاند کی منزلیں اٹھائیس کہی جاتی ہیں، اور آفتاب کا دورہ سال بھر میں پورا ہوتا ہے اس کی منزلیں تین سو ساٹھ یا پینسٹھ ہوتی ہیں، قدیم جاہلیت عرب میں بھی اور اہل ہئیت وریاضی کے نزدیک بھی ان منزلوں کے خاص خاص نام ان ستاروں کی مناسبت سے رکھ دیئے گئے ہیں جو ان منازل کی محاذات میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو شمس وقمر خاص خاص دنوں میں طے کرتے ہیں۔ (معارف القرآن ۴/۵۰۵، سورہ یونس پ ۱۱)

مناسک کی تعریف

''مناسک'' منسک کی جمع ہے اعمال حج کو بھی مناسک کہا جاتا ہے، اور مقامات حج عرفہ، مزدلفہ کو بھی، یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں، اور دعا کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں اعمال حج اور مقامات حج پوری طرح سمجھا دیجئے۔ اس لیے لفظ ''ارنا'' استعمال فرمایا جس کے معنی ہیں ہمیں دکھلا دیجئے، وہ دیکھنا آنکھوں سے بھی ہو سکتا ہے اور قلب سے بھی، چنانچہ مقامات حج کو بذریعہ جبرئیل امین دکھلا کر متعین کر دیا گیا، اور احکام حج کی واضح تلقین وتعلیم فرما دی گئی۔ (معارف القرآن ۱/۳۲۹، بقرہ پ ۱)

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا (حج پ ۱۷) لفظ منسک اور نسک عربی زبان کے اعتبار سے کئی معنی کے لیے بولا جاتا ہے، ایک معنی جانور کی قربانی کے دوسرے معنی تمام افعال حج کے اور تیسرے معنی مطلقاً عبادت کے ہیں قرآن کریم میں مختلف مواقع پر یہ لفظ ان تین معنی میں استعمال ہوا ہے، یہاں تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، اسی لیے

ائمہ تفسیر میں مجاہد وغیرہ نے اس جگہ منسک کو قربانی کے معنی میں لیا ہے، اس پر معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ قربانی کا حکم جو اس امت کے لوگوں کو دیا گیا ہے کوئی نیا حکم نہیں، پچھلی سب امتوں کے بھی ذمہ قربانی کی عبادت لگائی گئی تھی۔ اور قتادہؒ نے دوسرے معنی میں لیا ہے، جس پر مراد آیت کی یہ ہوگی کہ افعال حج جیسے اس امت پر عائد کئے گئے ہیں، پچھلی امتوں پر بھی حج فرض کیا گیا تھا، ابن عرفہ نے تیسرے معنی لیے ہیں، اس اعتبار سے مراد آیت کی یہ ہوگی کہ ہم نے اللہ کی عبادت گزاری سب پچھلی امتوں پر بھی فرض کی تھی، بقیہ عبادت میں کچھ کچھ فرق سب امتوں میں رہا ہے مگر اصل عبادت سب میں مشترک رہی ہے۔ (معارف القرآن ۲۶۶/۶، حج پ ۱۷)

مناظرہ کی تعریف

دو مختلف الخیال شخصوں اور جماعتوں میں نظریاتی بحث ومباحثہ جس کو اصطلاح میں مناظرہ کہا جاتا ہے، زمانۂ قدیم سے رائج ہے مگر عام طور پر مناظرہ ایک ہار جیت کا کھیل ہو کر رہ گیا ہے، لوگوں کی نظر میں مناظرہ کا حاصل اتنا ہی ہے کہ اپنی بات اونچی ہو، چاہے اس کی غلطی خود بھی معلوم ہو چکی ہو، اس کو صحیح اور قوی ثابت کرنے کے لئے دلائل اور ذہانت کا سارا زور خرچ کیا جائے، اسی طرح مخالف کی کوئی بات سچی اور صحیح بھی ہو تو بہر حال رد ہی کرنا اور اس کی تردید میں پوری توانائی صرف کرنا ہے، اسلام ہی نے اس کام میں خاص اعتدال پیدا کیا ہے اس کے اصول وقواعد اور حدود متعین کر کے اس کو ایک مفید ومؤثر آلۂ تبلیغ واصلاح بنایا ہے۔

(معارف القرآن ۵۱۸، ج ۶، سورہ شوریٰ پ ۱۹)

منفعت کی تعریف

منفعت یہ ہے کہ کسی چیز کے استعمال سے اس کے بدن کو فائدہ پہنچے گا لیکن نہ

کرنے سے کوئی سخت تکلیف یا ہلاکت کا خطرہ نہیں، جیسے عمدہ قسم کے کھانے اور مقوی غذائیں، اس حالت کے لیے نہ کوئی حرام حلال ہوتا ہے، نہ روزہ کا افطار جائز ہوتا ہے، مباح اور جائز طریقوں سے یہ چیزیں حاصل ہوسکیں تو استعمال کرے اور نہ حاصل ہوسکیں تو صبر کرے۔ (جواہر الفقہ ۳۵/۷، اعضاء انسان کی پیوندکاری)

منیب کی تعریف

ابوبکر ورّاقؒ فرماتے ہیں کہ منیب کی علامت یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ جلّ شانہ کے ادب کو ہر وقت مستحضر رکھے اور اس کے سامنے تواضع اور عاجزی سے رہے اور اپنے نفس کی خواہشات کو چھوڑ دے۔ (معارف القرآن ۱۴۷/۸، سورہ ق پ:۲۶)

موت کی تعریف

اموات میت کی جمع ہے، مردہ اور بے جان چیز کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ انسان اپنی اصل حقیقت پر غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کے وجود کی ابتداء وہ بے جان ذرات ہیں جو کچھ منجمد چیزوں کی شکل میں کچھ بہنے والی چیزوں میں کچھ غذاؤں کی صورت میں تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان بے جان ذرات کو کہاں کہاں سے جمع فرمایا، پھر ان میں جان ڈالی ان کو زندہ انسان بنادیا، یہ اس کی ابتداءِ پیدائش کا ذکر ہے۔

(معارف القرآن ج۱ ص۱۷۲ سورہ بقرہ پ۲)

موت عدم محض کا نام نہیں، بلکہ روح اور بدن کا تعلق منقطع کرکے روح کو ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کرنے کا نام ہے، اور یہ ایک وجودی چیز ہے، غرض جس طرح حیات ایک حال ہے جو جسم انسانی پر طاری ہوتا ہے، اسی طرح موت بھی ایک ایسا ہی حال ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض دوسرے ائمہؒ

تفسیر سے جو یہ منقول ہے کہ موت وحیات دو مجسم مخلوق ہیں، موت ایک مینڈھے کی شکل میں اور حیات ایک گھوڑی کی شکل میں ہے، اس سے مراد بظاہر اس صحیح حدیث کا بیان ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ جب قیامت میں اہل جنت جنت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں داخل ہوچکیں گے تو موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، اور پل صراط کے پاس اس کو ذبح کر کے اعلان کر دیا جائے گا کہ اب جو جس حالت میں ہے وہ دائمی اور ابدی ہے، اب کسی کو موت نہیں آئے گی، مگر اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ دنیا میں موت کوئی جسم ہو، بلکہ جس طرح دنیا کے بہت سے احوال واعمال قیامت میں مجسم اور متشکل ہوجائیں گے جو بہت سی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اسی طرح موت جو انسان کو پیش آنے والی ایک حالت ہے وہ بھی قیامت میں مجسم ہوکر مینڈھے کی شکل میں ذبح کر دی جائے گی۔ (قرطبی)

اور تفسیر مظہری میں فرمایا کہ موت اگرچہ عدمی چیز ہے مگر عدم محض نہیں، بلکہ ایسی چیز کا عدم ہے جس کو وجود میں کسی وقت آنا ہے اور ایسے تمام معدومات کی شکلیں عالم مثال میں قبل از وجود ناسوتی موجود ہوتی ہیں، جن کو اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے، ان اشکال کی وجہ سے ان کو قبل الوجود بھی ایک قسم کا وجود حاصل ہے، اور عالم مثال کے موجود ہونے پر بہت سی روایات حدیث سے استدلال فرمایا ہے۔ واللہ اعلم

(معارف القرآن ج ۸ ص ۵۱۵ سورہ ملک پ ۲۹)

موت، قبضِ روح اور وفات کی حقیقت

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (زمر، پ ۲۴)

توفی کے لفظی معنیٰ لینے اور قبض کر لینے کے ہیں اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ بتلایا کہ جانداروں کی ارواح ہر حال، ہر وقت اللہ تعالیٰ کے زیر تصرف ہیں، وہ جب چاہے ان کو قبض کرسکتا ہے، اور واپس لے سکتا ہے، اور اس تصرف خداوندی کا ایک

مظاہرہ تو ہر جاندار روزانہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ نیند کے وقت اس کی روح ایک حیثیت سے قبض ہو جاتی ہے پھر بیداری کے بعد واپس مل جاتی ہے، اور آخر کار ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ بالکل قبض ہو جائے گی پھر واپس نہ ملے گی۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ قبض روح کے معنیٰ اس کا تعلق بدن انسانی سے قطع کر دینے کے ہیں، کبھی یہ ظاہراً و باطناً منقطع کر دیا جاتا ہے اسی کا نام موت ہے، اور کبھی صرف ظاہراً منقطع کیا جاتا ہے باطناً باقی رہتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ حسّ اور حرکتِ ارادیہ جو ظاہری علامتِ زندگی ہو وہ منقطع کر دی جاتی ہے، اور باطناً تعلق روح کا جسم کے ساتھ باقی رہتا ہے، جس سے وہ سانس لیتا ہے، اور زندہ رہتا ہے، اور صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ روح انسانی کو عالمِ مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ کر کے اس عالَم سے غافل اور معطّل کر دیا جاتا ہے، تا کہ انسان مکمل آرام پا سکے، اور کبھی یہ باطنی تعلق بھی منقطع کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے جسم کی حیات بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

(معارف القرآن ۵۶۳، ج ۷، سورہ زمر پ ۲۴)

مؤلّفۃ القلوب کی تعریف

مؤلفۃ القلوب وہ لوگ ہیں جن کی دل جوئی کے لیے ان کو صدقات دیئے جاتے تھے، عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان میں تین چار قسم کے لوگ شامل تھے، کچھ مسلمان، کچھ غیر مسلم، پھر مسلمانوں میں بعض تو وہ لوگ تھے جو غریب حاجت مند بھی تھے، اور نو مسلم بھی، ان کی دل جوئی اس لیے کی جاتی تھی کہ اسلام پر پختہ ہو جائیں، اور بعض وہ تھے جو مال دار بھی تھے، اور مسلمان ہو گئے تھے، مگر ابھی تک ایمان کا رنگ ان کے دلوں میں رچا نہیں تھا، اور بعض وہ لوگ تھے جو خود تو سچے مسلمان تھے مگر ان کی قوم کو ان کے ذریعہ ہدایت پر لانا اور پختہ کرنا مقصود تھا، اور غیر مسلموں میں بھی کچھ وہ لوگ تھے جن کے شر سے بچنے کے لیے ان کی دل جوئی کی

جاتی تھی، اور بعض وہ تھے جن کے بارے میں یہ تجربہ تھا کہ نہ تبلیغ و تعلیم سے اثر پذیر ہوتے ہیں، نہ جنگ و تشدد سے بلکہ احسان و حسن سلوک سے متاثر ہوتے ہیں، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ چاہتے تھے کہ خلق خدا کو کفر کی ظلمت سے نکال کر نور ایمان میں لے آئیں، اس کے لیے ہر وہ جائز تدبیر کرتے تھے جس سے یہ لوگ متاثر ہوسکیں، یہ سب قسمیں عام طور پر مؤلفۃ القلوب میں داخل سمجھی جاتی ہیں، جن کو صدقات کا چوتھا مصرف اس آیت میں قرار دیا ہے۔

چوتھا مصرف مؤلفۃ القلوب ہیں، ان کے متعلق گذشتہ صفحات میں یہ بتلایا جاچکا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دل جوئی کے لیے ان کو صدقات سے حصہ دیا جاتا تھا، عام خیال کے مطابق ان میں مسلم و غیر مسلم دونوں طرح کے لوگ تھے، غیر مسلموں کی دل جوئی اسلام کی ترغیب کے لیے اور نومسلموں کی دل جوئی اسلام کے عہد مبارک میں ایک خاص علت اور مصلحت کے لیے جس کا ذکر ابھی آچکا ہے۔ صدقات دیئے جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب کہ اسلام کو مادی قوت بھی حاصل ہوگئی اور کفار کے شر سے بچنے یا نومسلموں کو اسلام پر پختہ کرنے کے لیے اس طرح کی تدبیروں کی ضرورت نہ رہی تو وہ علت اور مصلحت ختم ہوگئی، اس لیے ان کا حصہ بھی ختم ہوگیا، جس کو بعض فقہاء نے منسوخ ہوجانے سے تعبیر فرمایا ہے، فاروق اعظم، حسن بصریؒ، شعبیؒ، ابوحنیفہؒ، مالکؒ بن انس کی طرف یہی قول منسوب ہے۔

اور بہت سے حضرات نے فرمایا کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ منسوخ نہیں بلکہ صدیق اکبر اور فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں اس کو ساقط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت نہ رہنے کی وجہ سے ان کا حصہ ساقط کردیا گیا، آئندہ کسی زمانہ میں پھر ایسی ضرورت پیش آجائے تو پھر دیا جاسکتا ہے، امام زہریؒ، قاضی عبدالوہاب ابن عربی،

امام شافعیؒ، اور امام احمدؒ کا یہی مذہب ہے، لیکن تحقیقی اور صحیح بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کو صدقات وغیرہ سے کسی وقت کسی زمانہ میں حصہ نہیں دیا گیا، اور نہ وہ مؤلفۃ القلوب میں داخل ہیں، جن کا ذکر مصارف صدقات میں آیا ہے۔

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ان سب لوگوں کے نام تفصیل کے ساتھ شمار کئے ہیں جن کی دل جوئی کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مد صدقات سے حصہ دیا اور یہ سب شمار کرنے کے بعد فرمایا: وَبِالْجُمْلَةِ فَكُلُّهُمْ مُؤمِنٌ وَلَمْ يكنْ فِيهِم كَافِرٌ ، یعنی خلاصہ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب سب کے سب مسلمان ہی تھے، ان میں کوئی کافر شامل نہیں تھا۔

اسی طرح تفسیر مظہری میں ہے، لَمْ يَثْبُتْ اَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم اَعْطٰى اَحَدًا مِّنَ الْكُفَّارِ لِلْاِيْلَافِ شَيْئًا مِّنَ الزَّكٰوةِ ، یعنی یہ بات کسی روایت سے ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کافر کو مالِ زکوۃ میں سے اس کی دلجوئی کے لیے حصہ دیا ہو۔ (معارف القرآن ۴/۴۰۰، سورۂ توبہ پ ۱۰)

مؤمن کی تعریف

وہ شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کرے ہر اس امر میں جس کا ثبوت آپ سے قطعی اور بدیہی طور پر ہو چکا ہو، بشرطیکہ زبان سے بھی اس تصدیق کا اور اطاعت کا اقرار کرے۔ (جواہر الفقہ، کفر وایمان ۱/۵۸)

مہر شرعی کی تعریف

مہر عورت کا حقِّ مالی ہے جو خاوند کے ذمہ بوجہ عقد نکاح کے واجب ہوتا ہے اور مہر مسنون اور مہر محمدی اس مہر کو کہا جاتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً ثابت ہو۔

مہر کی تعداد کم از درہم دس ہے، جس کی مقدار وزن رائج الوقت کے اعتبار سے

دو تولہ گیارہ ماشے چاندی ہوتی ہے۔ اور زائد کے لئے کوئی حد ایسی مقرر نہیں کہ اس سے زائد مہر نہ ہو سکے یہ دوسری بات ہے کہ بہت زائد مقرر کرنا مکروہ وممنوع ہے
(امداد المفتین ص ۴۷۱، ج ۲)

مہر فاطمی ومہر محمدی کی تعریف

مہر فاطمی کی مقدار پانچ سو درہم ہے، جس کا وزن رائج الوقت ایک سو پینتالیس تولہ دس ماشہ ہوا اور آج کل جب کہ چاندی کا نرخ آٹھ تولہ ہے تو سکہ رائج الوقت کے اعتبار سے پانچ سو درہم کی قیمت تقریباً تہتّر (۷۳) روپے ہوتی ہے۔ (جو تقریباً آج کل ڈیڑھ کلو چاندی بنتی ہے)

حضرت امّ المومنین ام حبیبہ کا مہر چار ہزار درہم تھا اور حضرت فاطمہؓ اور عام ازواج مطہرات کا مہر پانچ سو درہم، حضرت ام حبیبہ اور حضرت فاطمہ دونوں کے مہروں سے قابل تقلید حضرت فاطمہ اور باقی ازواج مطہرات کا مہر ہے، کیونکہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا، بخلاف ام حبیبہ کے کہ ان کا مہر نجاشی بادشاہ نے مقرر کیا اور اسی نے ادا کیا تھا۔ (امداد المفتین ص ۴۷۲، ج ۲)

میّت کی تعریف

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَاِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ۔ (سورہ زمر پ ۲۳)

لفظ میّت بتشدید الیا اس کو کہتے ہیں جو زمانہ مستقبل میں مرنے والا ہو، اور میْت بسکون الیا اس کو کہتے ہیں جو مر چکا ہو۔ (معارف القرآن ص: ۵۵۵ ج ۷ سورہ زمر پ ۲۳)

میراث اور وراثت کی تعریف

وہ چیز جو مرنے والوں کے بعد زندہ رہنے والوں کو ملتی ہے اس کو میراث یا وراثت کہا جاتا ہے۔ (معارف القرآن سورہ اعراف پ ۹، ص ۱۰۳ ج ۴)

میراث اصل میں اس ملکیت کو کہا جاتا ہے جو پچھلے مالک کے انتقال کے بعد زندہ رہنے والے وارثوں کو ملا کرتی ہے، اور یہ مِلک جبری ہوتی ہے، مرنے والا چاہے یا نہ چاہے جو وارث ہوتا ہے ملکیت اس کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

(معارف القرآن سورہ حدید پ ۲۷، ص ۲۹۶ ج ۸)

میسِر (جوا) کی تعریف

میسر مصدر ہے اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، یاسر تقسیم کرنے والے کو کہا جاتا ہے، جاہلیت عرب میں مختلف قسم کے جوئے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جوا کھیلا جاتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے بعض محروم رہتے تھے، محروم رہنے والے کو پورے اونٹ کی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی، گوشت سب فقراء میں تقسیم کیا جاتا خود استعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جُوے میں چونکہ فقراء کا فائدہ اور جوا کھیلنے والوں کی سخاوت بھی تھی، اسی لیے اس کھیل کو باعث فخر سمجھتے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو کنجوس اور منحوس کہتے تھے۔

تقسیم کی مناسبت سے قمار کو میسر کہا جاتا ہے، تمام صحابہ و تابعین اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جُوے کی تمام صورتیں داخل ہیں اور سب حرام ہیں، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور قتادہؓ اور معاویہ بن صالحؒ اور عطاءؒ اور طاؤسؒ نے فرمایا:

المیسر القمار حتی لعب الصبیان بالکعاب و الجوز، یعنی ہر قسم کا قمار میسر ہے یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی سے گٹکوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔

اور ابن عباسؓ نے فرمایا اَلْمُخَاطَرَةُ مِنَ الْقِمَارِ یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے۔

(جصاص) ابن سیرین نے فرمایا جس کام میں مخاطرہ ہو وہ میسر میں داخل ہے۔

(روح البیان)

مخاطرہ کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع وضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے، اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، جیسے آج کل کی لاٹری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے، یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں، اس لیے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود وعدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں اور اسی بنا پر نفع خالص یا تاوان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں۔

(شامی ۳۵۵/۵، کتاب الحظر والاباحۃ)

مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید پر تاوان پڑ جائے، اور یہ بھی ہے کہ عمر پر پڑ جائے، اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں، یا آج رائج ہیں، یا آئندہ پیدا ہوں وہ سب میسر اور قمار اور جوا کہلائے گا، معمے حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لاٹری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں، ہاں اگر صرف ایک جانب سے انعام مقرر کیا جائے کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع وضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لیے احادیث صحیحہ میں شطرنج اور چوسر وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے جن میں مال کی ہار جیت پائی جاتی ہے، تاش پر اگر روپیہ کی ہار جیت ہو تو وہ میسر میں داخل ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت بریدہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نردشیر (چوسر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ

رنگتا ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شطرنج میسر یعنی جُوے میں داخل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا شطرنج تو نردشیر سے بھی زیادہ بُری ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، معارف القرآن ۱/۵۳۳، بقرہ پ۲)

میل، فرسخ، برید کی تعریف

میل کے بارے میں قول مختار فقہاء کرام کا یہ ہے کہ ۲۴ رانگشت کے گز سے ۴ ہزار گز کا ایک میل ہے، تو انگریزی گز سے دو ہزار گز کا ایک میل شرعی ہوا، کیونکہ ۲۴ رانگشت کا ذراع ایک ہاتھ یعنی ڈیڑھ فٹ یا اٹھارہ انچ کا ہے۔

انگریزی میل حسب تصریح چکرورتی آٹھ فرلانگ کا ہوتا ہے اور ہر فرلانگ دو سوبیس گز، تو انگریزی میل سترہ سو ساٹھ گز کا ہوگیا، معلوم ہوا کہ شرعی میل انگریزی میل سے دوسو چالیس گز بڑا ہے۔

فرسخ: بفتح خاء وسکون راء وفتح سین، تین میل کی مسافت کا نام ہے۔

برید: چار فرسخ یا بارہ میل کی مسافت کو کہا جاتا ہے۔ اور نہایہ میں ابن اثیر نے فرمایا ہے کہ یہ لفظ دراصل فارسی ''بریدہ دم'' کا مختصر ہے۔

(جواہر الفقہ اوزان شرعیہ ۳/۴۲۴)

ن

ناس کی تعریف

ناس لغت میں عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس جگہ قریب مقام کی وجہ سے خاص مکہ والے یا اہل عرب بھی مراد ہو سکتے ہیں، اور عام دنیا کے انسان بھی اور ظاہر یہی ہے کہ پورے عالم کے انسان اس میں داخل ہیں۔

(معارف القرآن سورہ مائدہ پ ۷، ص ۲۲۷ ج ۳)

الناس عربی زبان میں مطلق انسان کے معنیٰ میں آتا ہے۔

(معارف القرآن سورہ بقرہ پ ۱، ص ۱۳۲ ج ۱)

ناسخ اور منسوخ کی تعریف

چونکہ نسخ کے اصطلاحی معنی تبدیلِ حکم کے ہیں اور یہ تبدیلی جس طرح ایک حکم کو بالکلیہ منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لانے میں ہے، جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنا دینا، اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید و شرط کو بڑھا دینا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے۔ اسلاف امت نے نسخ کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے، جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے اور جزوی تبدیلی، قید و شرط یا استثناء وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے، اسی لیے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیات منسوخہ پانچ سو تک شمار کی گئی ہیں۔

حضرات متاخرین نے صرف اس تبدیلی کا نام نسخ رکھا ہے جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخہ کی تعداد

بہت گھٹ جائے گی، اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ متقدمین نے تقریباً پانچ سو آیاتِ قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا، جس میں معمولی سی تبدیلی قید وشرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا، اور حضرات متاخرین میں علامہ سیوطیؒ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ قرار دیا ہے۔ جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہوسکتی، یہ امر اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ احکام میں اصل بقاو حکم ہے نسخ خلاف اصل ہے۔ اس لیے جہاں آیت کے معمول بہا ہونے کی کوئی توجیہ ہوسکتی ہے اس میں ضرورت کے لیے نسخ ماننا درست نہیں۔

لیکن اس تفصیل کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہوسکتا کہ مسئلہ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا جس کے ازالہ کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی، آخری انکشاف حضرت شاہ ولی اللہ کو ہوا، جس میں گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئیں اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید تحقیق ان پانچ کا بھی خاتمہ کر کے بالکل صفر تک پہنچا دے۔

(معارف القرآن، ص: ۲۸۵، ج: ۱، سورۂ بقرہ، پ: ۱)

نسخ کی تحقیق میں ایسا رخ اختیار کرنا نہ اسلام اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت ہے اور نہ ایسا کرنے سے صحابہ و تابعین اور پھر چودہ سو برس کے علماء متقدمین و متاخرین کے مقالات وتحقیقات کو دھویا جاسکتا ہے۔ اور نہ مخالفین کی زبان طعن اس سے بند ہوسکتی ہے، بلکہ اس زمانہ کے ملحدین کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دینا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چودہ سو برس تک تمام علماء امت جو کچھ کہتے رہے ہوں اور آخر میں اس کا غلط ہونا ثابت ہوجائے۔ معاذ اللہ اگر یہ دروازہ کھلے گا تو قرآن اور شریعت سے امن اٹھ جائے گا۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ آج جو کسی نے تحقیق کی وہ کل کو غلط ثابت نہ ہوجائے گی۔

(معارف القرآن، ص: ۲۸۵، ج: ۱، سورۂ بقرہ، پ: ۱)

نبی ورسول کی تعریف اور دونوں کا باہمی فرق

رسول اور نبی کی تعریف میں متعدد اقوال ہیں، آیات مختلفہ میں غور کرنے سے جو بات احقر کے نزدیک محقق ہوئی وہ یہ ہے کہ ان دونوں کے مفہوم میں نسبت عموم وخصوص من وجہٍ کی ہے، رسول وہ ہے جو مخاطبین کو شریعت جدیدہ پہنچائے خواہ وہ شریعت خود اس رسول کے اعتبار سے بھی جدید ہو جیسے تورات وغیرہ یا صرف ان کی امت کے اعتبار سے جدید ہو، جیسے اسماعیل علیہ السلام کی شریعت وہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قدیم شریعت ہی تھی لیکن قوم جرہم جن کی طرف ان کو مبعوث فرمایا تھا ان کو اس شریعت کا علم پہلے سے نہ تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کے ذریعہ ہوا، اس معنی کے اعتبار سے رسول کے لیے نبی ہونا ضروری نہیں جیسے فرشتے کہ وہ رسول تو ہیں مگر نبی نہیں ہیں، یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ قاصد جس کو آیت قرآن اِذْ جَـاءَ هَـا الْمُرْسَلُوْن میں رسول کہا گیا ہے حالانکہ وہ انبیاء نہیں تھے۔

اور نبی وہ ہے جو صاحبِ وحی ہو خواہ شریعت جدیدہ کی تبلیغ کرے یا شریعت قدیمہ کی جیسے اکثر انبیاء بنی اسرائیل شریعت موسویہ کی تبلیغ کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک اعتبار سے لفظ رسول نبی سے عام ہے اور دوسرے اعتبار سے لفظ نبی بہ نسبت رسول کے عام ہے، جس جگہ یہ دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال کیئے گئے جیسا کہ آیات مذکورہ میں رسولًا نبیاً آیا ہے وہاں تو کوئی اشکال نہیں کہ خاص اور عام دونوں جمع ہوسکتے ہیں، کوئی تضاد نہیں لیکن جس جگہ یہ دو لفظ باہم متقابل آئے ہیں جیسے ''وَمَـا اَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍ'' میں تو اس جگہ بقرینہ مقام لفظ نبی کو خاص اس شخص کے معنی میں لیا جائے گا جو شریعت سابقہ کی تبلیغ کرتا ہے۔

(معارف القرآن ۶/۳۸، سورہ مریم پ:۱۶)

نجم کی تعریف

وَالنَّجمِ اِذَا ھَوٰی (سورہ نجم، پ ۲۷)

لفظ نجم ستارے کے معنیٰ میں آتا ہے، ہر ایک ستارے کو نجم اور جمع نجوم بولی جاتی ہے اور کبھی یہ لفظ خاص طور سے ثریّا ستارے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو چند ستاروں کا مجموعہ ہے، اس آیت میں بھی بعض حضرات نے نجم کی تفسیر ثریّا سے کی ہے، فرّاء اور حضرت حسن بصری نے پہلی تفسیر یعنی مطلق ستارے کو ترجیح دی ہے۔ (قرطبی)

نحل کی تعریف اور اس کی خصوصیت

اَلنَّحل: شہد کی مکھی اپنی عقل وفراست اور حسن تدبیر کے لحاظ سے تمام حیوانات میں ممتاز جانور ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو خطاب بھی امتیازی شان کا کیا ہے، باقی حیوانات کے بارے میں تو قانون کلی کے طریقہ پر اَعطیٰ کُلَّ شَیءٍ خَلقَهٗ ثُمَّ هَدیٰ فرمایا، لیکن اس ننھی سی مخلوق کے بارے میں خاص کر کے اَوحیٰ رَبُّکَ فرمایا جس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ یہ دوسرے حیوانات سے بہ نسبت عقل وشعور اور سوجھ بوجھ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

شہد کی مکھیوں کی فہم وفراست کا اندازہ ان کے نظام حکومت سے بخوبی ہوتا ہے، اس ضعیف جانور کا نظامِ زندگی انسانی سیاست وحکمرانی کے اصول پر چلتا ہے، تمام نظم ونسق ایک بڑی مکھی کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جو تمام مکھیوں کی حکمراں ہوتی ہے، اس کی تنظیم اور تقسیمِ کار کی وجہ سے پورا نظام صحیح سالم چلتا رہتا ہے، اس کے عجیب وغریب نظام اور مستحکم قوانین وضوابط کو دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، خود یہ "ملکہ" تین ہفتوں کے عرصے میں چھ ہزار سے بارہ ہزار تک انڈے دیتی ہے، یہ اپنی قد وقامت اور وضع وقطع کے لحاظ سے دوسری مکھیوں سے ممتاز ہوتی ہے، یہ ملکہ تقسیمِ کار کے اصول

پر اپنی رعایہ کو مختلف امور پر مامور کرتی ہے، ان میں سے بعض دربانی کے فرائض انجام دیتی ہیں، اور کسی نامعلوم اور خارجی فرد کو اندر داخل نہیں ہونے دیتیں، بعض انڈوں کی حفاظت کرتی ہیں، بعض نابالغ بچوں کی تربیت کرتی ہیں، بعض معماری اور انجینئر نگ کے فرائض ادا کرتی ہیں، ان کے تیار کردہ اکثر چھتّوں کے خانے بیس ہزار سے تیس ہزار تک ہوتے ہیں، بعض موم جمع کر کے معماروں کے پاس پہنچاتی رہتی ہیں جن سے وہ اپنے مکانات تعمیر کرتے ہیں، یہ موم نباتات پر جمع ہوئے سفید قسم کے سفوف سے حاصل کرتی ہیں، گنّے پر یہ مادّہ بکثرت نظر آتا ہے، ان میں سے بعض مختلف قسم کے پھولوں اور پھلوں پر بیٹھ کر اس کو چوستی ہیں جو ان کے پیٹ میں شہد میں تبدیل ہوجاتا ہے، یہ شہد ان کی اور ان کے بچوں کی غذا ہے، اور یہی ہم سب کے لئے بھی لذّت وغذا کا جوہر اور دوا وشفاء کا نسخہ ہے، یہ مختلف پارٹیاں نہایت سرگرمی سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہیں اور اپنی ''ملِکہ'' کے حکم کو دل وجان سے قبول کرتی ہیں، ان میں سے اگر کوئی گندگی پر بیٹھ جائے تو چھتہ کے دربان اسے باہر روک لیتے ہیں، اور ''ملِکہ'' اس کو قتل کر دیتی ہے، ان کے اس حیرت انگیز نظام اور حسنِ کارکردگی کو دیکھ کر انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے (ازالجواہر)

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہر جانور اپنے رہنے سہنے کے لئے گھر تو بناتا ہی ہے، پھر اس اہتمام سے گھروں کی تعمیر کا حکم مکھیوں کو دینے میں کیا خصوصیت ہے، پھر یہاں لفظ بھی ''بیوت'' کا استعمال فرمایا جو عموماً انسانی رہائش گاہوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے اشارہ ایک طرف تو اس طرف کر دیا کہ مکھیوں کو چونکہ شہد تیار کرنا ہے، اس کے لئے پہلے سے ایک محفوظ گھر بنالیں، دوسرا اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو گھر یہ بنائیں گی وہ عام جانوروں کے گھروں کی طرح نہیں ہوں گے، بلکہ ان کی ساخت وبناوٹ غیر معمولی قسم کی ہوگی، چنانچہ ان کے گھر عام جانوروں کے گھروں سے ممتاز

ہوتے ہیں، جن کو دیکھ کر انسانی عقل ششدر رہ جاتی ہے، اُن کے گھر مُسدّس شکل کے ہوتے ہیں، پرکار اور مسطر سے بھی اگر ان کی پیمائش کی جائے تو بال برابر بھی فرق نہیں رہتا، مسدس شکل کے علاوہ وہ دوسری کسی شکل مثلاً مربّع اور مخمّس وغیرہ کو اسی لئے اختیار نہیں کرتیں کہ ان کے بعض کونے بے کار رہ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مکھیوں کو محض گھر بنانے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کا محلّ وقوع بھی بتلا دیا کہ وہ کسی بلندی پر ہونا چاہئے کیونکہ ایسے مقامات پر شہد کو تازہ اور صاف چھنی ہوئی ہوا پہنچتی رہتی ہے وہ گندی ہوا سے بچا رہتا ہے اور توڑ پھوڑ سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

(معارف القرآن ص۳۶۲ ج ۵)

نذر اور منّت کی تعریف

وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ، (سورہ حج پ ۱۷) نذور، نذر کی جمع ہے جس کو اُردو میں منت کہا جاتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو کام شرعاً کسی شخص پر لازم، واجب نہیں تھا اگر وہ زبان سے یہ نذر کر لے اور منت مان لے کہ میں یہ کام کروں گا یا اللہ کے لیے مجھ پر لازم ہے کہ فلاں کام کروں تو یہ نذر ہو جاتی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، اگرچہ اصل سے واجب نہیں تھا، مگر اس کے واجب ہو جانے کے لیے یہ شرط تو باتفاق امت ہے کہ وہ کام شرعاً گناہ اور ناجائز نہ ہو، اگر کسی شخص نے گناہ کے کام کی نذر مان لی تو اس پر وہ گناہ کرنا اس سے لازم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ اس کے خلاف کرنا واجب ہے، البتہ اس پر کفارہ قسم لازم ہو جائے گا۔ اور ابو حنیفہؒ وغیرہ ائمہ فقہاء کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ وہ کام ایسا ہو جس کی جنس میں کوئی عبادت مقصودہ شرعیہ پائی جاتی ہو جیسے نماز، روزہ، صدقہ، قربانی وغیرہ کہ ان کی جنس میں کچھ شرعی واجبات اور عبادات مقصودہ ہیں تو اگر کوئی شخص نفل نماز روزے صدقہ وغیرہ کی نذر مان لے تو وہ نفل اس کے ذمہ واجب ہو جاتی ہے، اس کا پورا کرنا اس کے ذمہ لازم و واجب

ہے۔ آیت مذکورہ سے یہی حکم ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس میں نذر کے ایفاء یعنی پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ یاد رہے کہ صرف دل میں کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرنے سے نذر نہیں ہوتی جب تک زبان سے الفاظ نذر ادا نہ کرے، تفسیر مظہری میں ایک جگہ نذر اور منت کے احکام و مسائل بڑی تفصیل سے جمع کر دیئے ہیں جو بہت اہم ہیں۔

(معارف القرآن ۲۵۹/۶، سورۂ حج پ ۱۷)

نذیر و بشیر کی تعریف

قُمْ فَاَنْذِرْ (سورہ مدثر، پ ۲۹)

یعنی کھڑے ہو جائیے، اس کے معنیٰ حقیقی قیام کے بھی ہو سکتے ہیں، کہ آپ دو کپڑوں میں لپٹ کر لیٹ گئے ہیں اس کو چھوڑ کر کھڑے ہو جائیے اور یہ معنیٰ بھی بعید نہیں کہ قیام سے مراد کام کے لئے مستعد اور تیار ہونا ہو، اور مطلب یہ ہو کہ اب آپ ہمت کر کے خلق خدا کی اصلاح کی خدمت سنبھالیئے۔

فَانْذِر انذار سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ ڈرانے کے ہیں، مگر ایسا ڈرانا جو شفقت و محبت پر مبنی ہوتا ہے، جیسے باپ اپنے بچے کو سانپ، بچھو اور آگ سے ڈراتا ہے، انبیاء کی یہی شان ہوتی ہے اس لئے ان کا لقب نذیر اور بشیر ہوتا ہے، نذیر کے معنیٰ شفقت و ہمدردی کی بناء پر مضر چیزوں سے ڈرانے والا اور بشیر کے معنیٰ خوشخبری سُنانے والا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی دونوں لقب قرآن کریم میں جا بجا مذکور ہیں، مگر اس جگہ صرف انذار کے ذکر پر اکتفاء اس لئے کیا گیا کہ اس وقت مومن مسلمان تو گِنے چُنے چند ہی تھے باقی سب منکرین و کفار تھے جو کسی بشارت کے مستحق نہیں، بلکہ ڈرانے کے ہی مستحق تھے۔ (معارف القرآن ص ۶۱۰، ج ۸ مدثر، پ ۲۹)

نذیر کے معنی اردو میں ڈرانے والے کے کئے جاتے ہیں، درحقیقت نذیر وہ شخص ہے جو اپنی رحمت وشفقت کے سبب اپنے لوگوں کو ایسی چیزوں سے بچنے کی ہدایت کرے جو اس کو ہلاکت یا مضرت میں ڈالنے والی ہیں، اور ان چیزوں سے لوگوں کو ڈرائے، مراد اس سے معروف معنی کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء ہیں۔

اور حضرت ابن عباسؓ عکرمہ اور امام جعفر باقر سے منقول ہے کہ نذیر سے مراد بڑھاپے کے سفید بال ہیں کہ جب وہ ظاہر ہو جائیں تو وہ انسان کو اس کی ہدایت کرتے ہیں کہ اب رخصت کا وقت قریب آ گیا ہے، یہ قول بھی پہلے قول سے متعارض نہیں کہ سفید بال بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نذیر ہوں اور انبیاء وعلماء بھی۔

(معارف القرآن سورہ فاطر ۷/۳۵۷)

نسب وصہر کی تعریف

نسب اس رشتہ اور قرابت کو کہا جاتا ہے جو باپ یا ماں کی طرف سے ہو اور صہر وہ رشتہ وتعلق ہے جو بیوی کی طرف سے ہو جس کو عرف میں سسرال بولتے ہیں، یہ سب تعلقات اور قرابتیں اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں جو انسان کی خوشگوار زندگی کے لئے لازمی ہیں، اکیلا آدمی کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔

(معارف القرآن سورہ فرقان، پ ۱۹، ص ۴۷۴ ج ۶)

نسیان کی تعریف

نسیان کے معنیٰ مشہور ہیں بھول جانا، غفلت میں پڑ جانا۔

(معارف القرآن سورہ طٰہٰ پ ۱۶، ص ۱۴۳ ج ۶)

نفر کی تعریف

لفظ ''نفر'' تین سے دس تک عدد کے لئے بولا جاتا ہے۔

(معارف القرآن ج۸ص۵۷۴سورہ جن پ۲۹)

نفس اور روح کی تعریف

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ نے اس جگہ تحریر فرمائی ہے جس سے بہت سے اشکالات حل ہوجاتے ہیں وہ یہ ہے کہ حدیث مذکور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نفس انسانی ایک جسمِ لطیف ہے جو اس کے جسمِ کثیف کے اندر سمایا ہوا ہے اور وہ انہیں مادی عناصر اربعہ سے بنا ہے، فلاسفہ اور اطباء اسی کو روح کہتے ہیں مگر درحقیقت روح انسانی ایک جوہر مجرد اور لطیفۂ ربّانی ہے جو اس طبعی روح یعنی نفس کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتا ہے اور طبعی روح یعنی نفس کی حیات خود اس لطیفہ ربانی پر موقوف ہے گویا اس کو روح الروح کہہ سکتے ہیں کہ جسم کی زندگی نفس سے ہے اور نفس کی زندگی اس روح سے وابستہ ہے اس روح مجرد اور لطیفہ ربانیہ کا تعلق اسی جسم لطیف یعنی نفس کے ساتھ کیا اور کس طرح کا ہے اس کی حقیقت کا علم ان کے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں، اور یہ جسم لطیف جس کا نام نفس ہے اس کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ایک آئینہ کی مثال بنایا ہے جو آفتاب کے بالمقابل رکھ دیا گیا ہو تو آفتاب کی روشنی اس میں ایسی آجاتی ہے کہ یہ خود آفتاب کی طرح روشنی پھیلاتا ہے نفسِ انسانی اگر تعلیم وحی کے مطابق ریاضت و محنت کر لیتا ہے تو وہ بھی منور ہوجاتا ہے ورنہ جسمِ کثیف کے خراب اثرات میں ملوث ہوتا ہے یہی جسمِ لطیف ہے جس کو فرشتے اوپر لے جاتے ہیں اور پھر اعزاز کے ساتھ نیچے لاتے ہیں جب کہ وہ منور ہو چکا ہو، ورنہ آسمان کے دروازے اس کے لئے نہیں کھلتے، اوپر ہی سے نیچے پٹخ دیا جاتا ہے،

یہی جسم لطیف ہے جس کے بارے میں حدیث مذکور میں ہے کہ ہم نے اس کو زمین کی مٹی سے پیدا کیا، پھر اس میں لوٹائیں گے پھر اسی سے دوبارہ پیدا کریں گے، یہی جسمِ لطیف اعمالِ صالحہ سے منور اور خوشبودار بن جاتا ہے اور کفر وشرک سے بدبُو دار ہو جاتا ہے۔ باقی روحِ مجرد اس کا تعلق جسم کثیف کے ساتھ بواسطہ جسم لطیف یعنی نفس کے ہوتا ہے اُس پر موت طاری نہیں ہوتی، قبر کا عذاب وثواب بھی اسی جسمِ لطیف یعنی نفس سے وابستہ ہے اور اس نفس کا تعلق قبر سے ہی رہتا ہے اور روح مجرد علّیین میں ہوتی ہے، اور روح مجرد اس کے ثواب وعذاب سے بالواسطہ متاثر ہوتی ہے، اس طرح روح کا قبر میں ہونا بمعنیٰ نفس کے صحیح ہے اور اس کا عالمِ ارواح یا علّیین میں رہنا بمعنیٰ روح مجرد صحیح ہے اس سے ان روایات مختلفہ کی تطبیق بھی ہو جاتی ہے، واللہ اعلم۔ (معارف القرآن ص ۶۲۵، ج ۸)

نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنّہ کی تعریف

''لوّامہ'' لَوم بفتح اللام سے مشتق ہے جس کے معنی ملامت اور سرزنش کرنے کے ہیں، نفسِ لوّامہ سے مراد وہ نفس ہے جو خود اپنے اعمال کا محاسبہ کر کے اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اور اعمالِ خیر اور حسنات کے متعلق بھی اپنے آپ کو اس پر ملامت کرے کہ اس سے زیادہ نیک کام کر کے اعلیٰ درجات کیوں نہ حاصل کیئے، غرض مؤمن کامل اپنے ہر عمل خیر وشر اور حسنات وسیئات میں اپنے آپ کو ہمیشہ ملامت ہی کرتا ہے، گناہ یا واجب میں کوتاہی پر ملامت تو ظاہر ہے حسنات اور نیک کاموں میں ملامت کی وجہ یہ ہے کہ اے نفس! تو نیکی اس سے زیادہ بھی تو کر سکتا تھا اس زیادتی سے کیوں محروم رہا۔

یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے ائمہ تفسیر سے منقول ہے۔ (ابن کثیر وغیرہ)

اور اسی مفہوم کی وجہ سے حضرت حسن بصریؒ نے نفسِ لوّامہ کی تفسیر نفسِ مؤمنہ سے کی

ہے، اور فرمایا کہ واللہ مومن تو ہمیشہ ہر حال میں اپنے نفس کو ملامت ہی کرتا ہے، سیئات پر تو ظاہر ہی ہے اپنے حسنات اور نیک کاموں میں بھی وہ بمقابلے شانِ حق تعالیٰ کے کمی اور کوتاہی محسوس کرتا ہے کیونکہ حقِ عبادت کو پورا ادا کرنا تو کسی کے بس میں نہیں، اس لئے ادائے حق میں تقصیر اس کے سامنے رہتی ہے اس پر ملامت کرتا ہے۔

حضرت ابن عباس اور حضرت حسن بصریؒ وغیرہ کی اس تفسیر پر نفسِ لوّامہ کی قسم کھانا حق تعالیٰ کی طرف سے ایسے نفوس مومنہ کے اکرام و شرف کے اظہار کے لئے ہے جو خود اپنے اعمال کا محاسبہ کر کے کوتاہی پر نادم ہوتے اور اپنے کو ملامت کرتے ہیں۔

اور نفسِ لوّامہ کی اس تفسیر کے مطابق یہ نفسِ مطمئنّہ کو بھی شامل ہے، لوّامہ اور مطمئنہ دونوں نفسِ متقی کے لقب ہیں۔

نفسِ امّارہ، لوّامہ، مطمئنّہ

اور حضرات صوفیائے کرام نے اس میں یہ تفصیل کی ہے کہ نفس اپنی جبلت وفطرت کے اعتبار سے ''امّارۃ بالسوء'' ہوتا ہے، یعنی انسان کو برے کاموں کی طرف بلانے اور اس میں مبتلا کرنے کا داعی ہوتا ہے مگر ایمان اور عمل صالح اور ریاضت ومجاہدہ سے یہ نفسِ لوّامہ بن جاتا ہے کہ برائی اور کوتاہی پر نادم ہونے لگتا ہے مگر برائی سے بالکلیہ انقطاع اس کا نہیں ہوتا، آگے عمل صالح میں ترقی اور قربِ حق تعالیٰ کے حصول میں کوشش کرتے کرتے جب اس کا یہ حال ہو جائے کہ شریعت اس کی طبیعت بن جائے اور خلاف شرع کام سے طبعی نفرت بھی ہونے لگے تو اس نفس کا لقب مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم

(سورۃ القیٰمۃ: معارف القرآن ص ۶۲۲، ۶۲۳ ج ۸)

نفسِ مطمئنہ کی تعریف

یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ الخ (سورہ فجر، پ۳۰)

یہاں مومن کی روح کو نفسِ مطمئنہ کے لقب سے خطاب کیا گیا ہے، مطمئنہ کے لفظی معنی ساکنہ کے ہیں، مراد وہ نفس ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی اطاعت سے سکون وقرار پاتا ہے اس کے ترک سے بے چینی محسوس کرتا ہے اور یہ وہی نفس ہوسکتا ہے جو ریاضات ومجاہدات کر کے اپنی بری عادات اور اخلاقِ رذیلہ کو دور ہو چکا ہو، اطاعت حق اور ذکر اللہ اس کا مزاج اور شریعت اس کی طبیعت بن جاتی ہے، اس کو خطاب کر کے فرمایا گیا: ارجعی الیٰ ربک، یعنی لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف، لوٹنے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پہلا مقام بھی رب کے پاس تھا اب وہیں واپس جانے کا حکم ہو رہا ہے، اس سے روایت کی تقویت ہوتی ہے جس میں یہ ہے کہ مومنین کی ارواح ان کے اعمال ناموں کے ساتھ علیین میں رہیں گی، اور علیین ساتویں آسمان پر عرش رحمٰن کے سایہ میں کوئی مقام ہے، کُل ارواح انسان کا اصلی مستقر وہی ہے وہیں سے روح لاکر انسان کے جسم میں ڈالی جاتی ہے اور پھر موت کے بعد وہیں واپس جاتی ہے۔ (سورۃ الفجر: معارف القرآن ج۸ص۷۴۳،۷۴۴)

نفسِ امّارہ کی تعریف

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ (سورہ یوسف، پ۱۳)

اس آیت میں یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ اس میں ہر نفسِ انسانی کو ''امّارۃٌ بالسوء'' یعنی برے کاموں کا حکم کرنے والا فرمایا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال فرمایا کہ ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز واکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑے

پہناؤ تو وہ تمہیں بلا اور مصیبت میں ڈال دے، اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ برا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو نہیں سکتا، آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں وہ ایسا ہی ساتھی ہے۔ (قرطبی)

اور ایک حدیث میں ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہے جو تمہیں برے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل وخوار بھی کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں بھی گرفتار کردیتا ہے۔

بہرحال آیت مذکورہ اور ان روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس انسانی برے ہی کاموں کا تقاضا کرتا ہے، لیکن سورہ قیامۃ میں اسی نفس انسانی کو لوّامہ کا لقب دے کر اُس کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ رب العزت نے اس کی قسم کھائی ہے **لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ** اور سورہ والفجر میں اسی نفس انسانی کو نفس مطمئنہ کا لقب دے کر جنت کی بشارت دی ہے **يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىٓ اِلٰى رَبِّكِ**، اس طرح نفس انسانی کو ایک جگہ **اَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ** کہا گیا، دوسری جگہ لوّامہ، تیسری جگہ مطمئنہ۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر نفس انسانی اپنی ذات میں تو امارۃ بالسوء یعنی برے کاموں کا تقاضہ کرنے والا ہے، لیکن جب انسان خدا وآخرت کے خوف سے اس کے تقاضے کو پورا نہ کرے تو اس کا نفس لوّامہ بن جاتا ہے یعنی برے کاموں پر ملامت کرنے والا اور ان سے توبہ کرنے والا جیسے عام صلحاء اُمت کے نفوس ہیں۔ اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اپنے نفس کو اس حالت میں پہنچادے کہ برے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے تو وہ نفس مطمئنہ ہوجاتا ہے۔

صلحاء اُمت کو یہ حال مجاہدہ وریاضت سے حاصل ہوسکتا ہے، اور پھر بھی اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا اور انبیاء علیہم السلام کو خود بخود عطائے خداوندی سے ایسا ہی نفس مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے، اس طرح نفس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین طرح کے افعال اُس کی طرف منسوب کیئے گئے ہیں۔ (معارف القرآن ج ۵،ص ۸۶،۸۷،سورہ یوسف پ ۱۳)

نفقہ کی تعریف

قرطبی نے فرمایا کہ اسی آیت نے ہمیں یہ بھی بتلا دیا کہ عورت کا جو نفقہ مرد کے ذمہ ہے وہ صرف چار چیزیں ہیں، کھانا پینا اور لباس اور مسکن، اس سے زائد جو کچھ شوہر اپنی بیوی کو دیتا یا اس پر خرچ کرتا ہے وہ تبرع واحسان ہے، واجب ولازم نہیں، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوی کے علاوہ جس کسی کا نفقہ شریعت نے کسی شخص کے ذمہ عائد کیا ہے، اس میں بھی چار چیزیں اس کے ذمہ واجب ہوتی ہیں، جیسے ماں باپ کا نفقہ اولاد کے ذمہ جب کہ وہ محتاج اور معذور ہوں، وغیر ذلک جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔ (معارف القرآن ج ٦/ ۱۵۷،طٰہٰ: پ ۱٦)

نفل اور نافلہ کی تعریف

نَافِلَةً لَّکَ (پ ۱۵، بنی اسرائیل)

لفظ نفل اور نافلۃ کے لغوی معنی زائد کے ہیں، اسی لیے اس نماز اور صدقہ خیرات وغیرہ کو نفل کہتے ہیں جو شرعاً واجب اور ضروری نہ ہو جس کے کرنے میں ثواب ہے اور نہ کرنے میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کسی قسم کی برائی۔

(معارف القرآن، بنی اسرائیل ۵/۵۰۴)

نکاح متعہ اور نکاح موقّت کی تعریف

نکاح متعہ کی طرح نکاح موقّت بھی حرام اور باطل ہے، نکاح موقّت یہ ہے کہ ایک مقررہ مدت کے لئے نکاح کیا جائے اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ متعہ میں لفظ متعہ بولا جاتا ہے اور نکاح موقّت لفظ نکاح سے ہوتا ہے۔

(معارف القرآن ص ۳۶۸، ج ۲، نساء، پ ۵)

نکال کی تعریف

''جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللّٰهِ''۔ (پ ۶، مائدہ)

یعنی یہ سزا بدلہ ہے ان کی بدکرداری کا۔

''نَكَالًا مِنَ اللّٰهِ'' اس میں دو لفظ ہیں، نکال اور من اللہ، لفظ ''نکال'' کے معنی عربی لغت میں ایسی سزا کے ہیں جس کو دیکھ کر دوسروں کو بھی سبق ملے، اور اقدام جرم سے باز آجائے، اس لیے نکال کا ترجمہ ہمارے محاورہ کے موافق ''عبرت خیز سزا'' کا ہوگیا، اس میں اشارہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سخت سزا خاص حکمت پر مبنی ہے کہ ایک پر سزا جاری ہوجائے تو سب کے سب کانپ اٹھیں اور اس جرم قبیح کا انسداد ہوجائے۔

(معارف القرآن ۳/۱۳۱، سورہ مائدہ پ: ۶)

نور کی تعریف

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورہ نور، پ ۱۸)

نور کی تعریف امام غزالیؒ نے یہ فرمائی **الظاهر بنفسه والمظهر لغيره**، یعنی خود اپنی ذات سے ظاہر اور روشن ہو، اور دوسری چیزوں کو ظاہر و روشن کرنے والا ہو۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ نور دراصل اس کیفیت کا نام ہے جس کو انسان کی

قوت باصرہ پہلے ادراک کرتی ہے اور پھر اس کے ذریعہ ان تمام چیزوں کا ادراک کرتی ہے جو آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں، جیسے آفتاب اور چاند کی شعاعیں ان کے مقابل اجسام کثیفہ پر پڑکر اول اس چیز کو روشن کردیتی ہیں، پھر اس سے شعاعیں منعکس ہوکر دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ نور کا اپنے لغوی اور عرفی معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ جل شانہ کی ذات پر اطلاق نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ جسم اور جسمانیات سب سے بَری اور وراء الوریٰ ہے، اس لیے آیت مذکورہ میں جو حق تعالیٰ کے لیے لفظ نور کا اطلاق ہوا ہے اس کے معنی باتفاق ائمہ تفسیر منوّر یعنی روشن کرنے والے کے ہیں، یا پھر صیغۂ مبالغہ کی طرح صاحب نور کو نور سے تعبیر کردیا گیا جیسے صاحب کرم کو کرم اور صاحب عدل کو عدل کہہ دیا جاتا ہے، اور معنی آیت کے وہ ہیں جو خلاصہ تفسیر میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نور بخشنے والے ہیں، آسمان وزمین کو اور اس میں بسنے والی سب مخلوق کو، اور مراد اس نور سے نور ہدایت ہے۔ ابن کثیرؒ نے حضرت ابن عباس سے اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ **اللہ ھادی اھل السموات والارض۔**

(معارف القرآن ص۴۲۲، ج۶، سورہ نور، پ۱۸)

نوم ونشور کی تعریف

لَاتَاخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَانَوم (سورہ بقرہ، پ۳)

لفظ سِنہ سین کے زیر کے ساتھ، اونگھ کو کہتے ہیں جو نیند کے ابتدائی آثار ہوتے ہیں اور ''نوم'' مکمل نیند کو، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ اونگھ اور نیند سب سے بری اور بالا ہے۔ (معارف القرآن ص۶۱۳، ج۱، سورہ بقرہ، پ۳)

نیند کو اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز بنایا ہے کہ دن بھر کی محنتوں کا تھکان اور کمزوری اس سے قطع ہوجاتی ہے، افکار وخیالات منقطع ہوکر دماغ کو آرام ملتا ہے اس لئے سُبات

کا ترجمہ راحت کا کیا جاتا ہے، معنیٰ آیت کے یہ ہوگئے کہ ہم نے رات کو ایک چھپانے والی چیز بنایا پھر اس میں انسان اور سارے جانداروں پر نیند مسلط کردی جو ان کے آرام وراحت کا سامان ہے۔

اسی طرح وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوراً میں دن کونشور یعنی زندگی فرمایا کیوں کہ اس کا مقابل یعنی نیند ایک قسم کی موت ہے اور اس زندگی کے وقت کو بھی سارے انسانوں میں جبری طور پر ایک کردیا ہے، ورنہ کچھ کارخانے اور دُکانیں دن کو بند رہتی ہیں رات کو کھلتی ہیں، اور جب وہ کھلتیں تو دوسری بند ہوجاتیں اس لحاظ سے دونوں میں کاروباری مشکلات پیش آتیں۔ (معارف القرآن ص۴۷۲، ج۶، سورہ فرقان، پ۱۹)

نیوتہ اور رسمی لین دین کی تعریف

''وَمَا اٰتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَ فِيْ اَمْوَالِ النَّاس ''۔(پ۲۱، سورۂ روم)

اس آیت میں ایک بری رسم کی اصلاح کی گئی ہے جو عام خاندانوں اور اہل قرابت میں چلتی ہے، وہ یہ کہ عام طور پر کنبہ رشتہ کے لوگ جو کچھ دوسرے کو دیتے ہیں اس پر نظر رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے وقت میں کچھ دے گا بلکہ رسمی طور پر کچھ زیادہ دے گا، خصوصاً نکاح، شادی وغیرہ کی تقریبات میں جو کچھ دیا لیا جاتا ہے اس کی یہی حیثیت ہوتی ہے، جس کو عرف میں نیوتہ کہتے ہیں، اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ اہل قرابت کا جو حق ادا کرنے کا حکم پہلی آیت میں دیا گیا ہے ان کو یہ حق اس طرح دیا جائے کہ نہ ان پر احسان جتائے اور نہ کسی بدلے پر نظر رکھے، اور جس نے بدلے کی نیت سے دیا کہ ان کا مال دوسرے عزیز رشتہ دار کے مال میں شامل ہونے کے بعد کچھ زیادہ لے کر واپس کرے گا تو اللہ کے نزدیک اس کا کوئی درجہ اور ثواب نہیں اور قرآن کریم نے اس زیادتی کو لفظ ربوٰ سے تعبیر کرکے اس کی قباحت کی طرف اشارہ کردیا کہ یہ ایک صورت سود کی سی ہوگئی۔

مسئلہ: ہدیہ اور ہبہ دینے والے کو اس پر نظر رکھنا کہ اس کا بدلہ ملے گا یہ تو ایک بہت مذموم حرکت ہے، جس کو اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے لیکن بطور خود جس شخص کو کوئی ہبہ عطیہ کسی دوست عزیز کی طرف سے ملے اس کے لیے اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ وہ بھی جب اس کو موقع ملے اس کی مکافات کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جو شخص آپ کو کوئی ہدیہ پیش کرتا تو اپنے موقع پر آپ بھی اس کو ہدیہ دیتے تھے، (کذا روی عن عائشہؓ، قرطبی) ہاں اس مکافات کی صورت ایسی نہ بنائے کہ دوسرا آدمی یہ محسوس کرے کہ یہ میرے ہدیہ کا بدلہ دے رہا ہے۔

(معارف القرآن ۶/۳۸،۷ سورہ روم پ ۲۱)

وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ: (سورہ مدثر پ ۲۹)

یعنی کسی شخص پر احسان اس نیت سے نہ کیجئے کہ جو کچھ اس کو دیا ہے اس سے زیادہ وصول ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کو ہدیہ تحفہ اس نیت سے دینا کہ وہ اس کے معاوضہ میں اس سے زیادہ دے گا یہ مذموم و مکروہ ہے۔

قرآن کی دوسری آیت سے اگر چہ اس کا جواز عام لوگوں کے لیے معلوم ہوتا ہے مگر وہ بھی کراہت سے خالی نہیں، اور شریفانہ اخلاق کے منافی ہے، خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو اس کو حرام قرار دیا گیا، **قاله ابن عباس.**

(معارف القرآن ۸/۶۱۲، سورہ مدثر پ ۲۹)

و

وثن (بت) کی تعریف

اوثان وثن کی جمع ہے، بت کے معنیٰ میں، بتوں کو نجاست اس لئے قرار دیا کہ وہ انسان کے باطن کو شرک کی نجاست سے بھر دیتے ہیں۔

(معارف القرآن سورہ حج پ ۱۷، ص ۲۶۲ ج ۶)

وَجِل اور خوف کی تعریف

وَجِل کے اصلی معنیٰ اس خوف و ہیبت کے ہیں جو کسی عظمت کی بنا پر دل میں پیدا ہو، اللہ کے نیک بندوں اور صلحاء کا یہی حال ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نام سن کر ان کے دلوں پر اس کی عظمت اور بڑائی کے سبب ایک خاص ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ (معارف القرآن سورہ حج پ ۱۷، ص ۲۶۶ ج ۶)

وحی کی تعریف اور وحی والہام میں فرق

صحیح بات یہ ہے کہ لفظ وحی کے لغوی معنی ایسے خفیہ کلام کے ہیں جو صرف مخاطب کو معلوم ہو، دوسرے اس پر مطلع نہ ہوں، اس لغوی معنی کے اعتبار سے وحی کسی کے لیے مخصوص نہیں، نبی و رسول اور عام مخلوق بلکہ جانور تک اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ میں شہد کی مکھیوں کو بذریعہ وحی تلقین و تعلیم کرنے کا ذکر اسی معنی کے اعتبار سے ہے اور اس آیت میں اَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّکَ بھی اس معنی لغوی کے اعتبار سے ہے، اس سے ان کا نبی یا رسول ہونا لازم نہیں آتا، جیسے

حضرت مریم علیہا السلام کو ارشادات ربانی پہنچے، باوجودیکہ باتفاق جمہور امت وہ نبی یا رسول نہیں تھیں اس طرح کی لغوی وحی عموماً بطور الہام کے ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کسی کے قلب میں ایک مضمون ڈال دیں اور اس کو اس پر مطمئن کر دیں کہ اللہ کی طرف سے ہے جیسے عموماً اولیاء اللہ کو اس قسم کے الہامات ہوتے رہے ہیں، بلکہ ابو حیان اور بعض دوسرے علماء نے کہا ہے کہ اس طرح کی وحی بعض اوقات کسی فرشتے کے واسطے سے بھی ہو سکتی ہے جیسے حضرت مریم کے واقعہ میں اس کی تصریح ہے کہ جبرئیل امین نے بشکل انسانی متمثل ہو کر ان کو تلقین فرمائی مگر اس کا تعلق صرف اس شخص کی ذات سے ہوتا ہے جس کو یہ وحی الہام ہوتی ہے، اصلاح خلق اور تبلیغ و دعوت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، بخلاف وحی نبوت کے کہ اس کا منشاء ہی مخلوق کی اصلاح کے لیے کسی کو کھڑا کرنا اور تبلیغ و دعوت کے لیے مامور کرنا ہوتا ہے، اس کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ اپنی وحی پر خود بھی ایمان لائے اور دوسروں کو بھی اپنی نبوت کے ماننے اور اپنی وحی کے ماننے کا پابند بنائے جو اس کو نہ مانے اسے کافر قرار دے۔

وحی لغوی اور وحی نبوت کا فرق

یہی فرق ہے اس وحی الہام یعنی وحی لغوی میں اور وحی نبوت یعنی وحی اصطلاحی میں، وحی لغوی ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ رہے گی، اور نبوت اور وحی نبوت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے، بعض بزرگوں کے کلام میں اسی کو وحی تشریعی و غیر تشریعی کے عنوان سے تعبیر کر دیا ہے، جس کو مدعی نبوت قادیانی نے شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی بعض عبارتوں کے حوالہ سے اپنے دعوائے نبوت کے جواز کی دلیل بنایا ہے جو خود ابن عربیؒ کی تصریحات سے باطل ہے، اس مسئلہ کی مکمل بحث و توضیح میری کتاب ختم نبوت میں تفصیل سے مذکور ہے۔

(معارف القرآن ۶/۹۷، سورہ طٰہ)

وَسَطْ کی تعریف

لفظ وسط بفتح السین بمعنی اوسط ہے اور خیر الامور اور افضل اشیاء کو وسط کہا جاتا ہے، ترمذی میں بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے۔ (قرطبی)

(معارف سورہ بقرہ ۱/۳۶۵)

وسیلہ کی تعریف

لفظ وسیلہ کے معنیٰ ہیں ہر وہ چیز جس کو کسی دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا جائے، اور اللہ کے لئے وسیلہ یہ ہے کہ علم وعمل میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کی ہر وقت رعایت رکھے اور احکام شرعیہ کی پابندی کرے، مطلب یہ ہے کہ یہ سب حضرات اپنے عمل صالح کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے تقرّب کی طلب میں لگے ہوئے ہیں۔

(معارف القرآن سورہ بنی اسرائیل پ۱۵، ص۴۸۶ ج۵)

اِبْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ۔ (پ۶، مائدہ)

یعنی اللہ کا قرب تلاش کرو، لفظ وسیلہ وسلٌ مصدر سے مشتق ہے، جس کے معنی ملنے اور جڑنے کے ہیں، یہ لفظ سین اور صاد دونوں سے تقریباً ایک ہی معنی میں آتا ہے، فرق اتنا ہے کہ وصلٌ بالصاد مطلقاً ملنے اور جوڑنے کے معنی میں ہے، اور وسلٌ بالسین رغبت ومحبت کے ساتھ ملنے کے لیے مستعمل ہوتا ہے، صحاح جوہری اور مفردات القرآن راغب اصفہانی میں اس کی تصریح ہے، اس لیے صاد کے ساتھ وصلہ اور وصیلہ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دو چیزوں کے درمیان میل اور جوڑ پیدا کردے، خواہ وہ میل اور جوڑ رغبت ومحبت سے ہو یا کسی دوسری صورت سے، اور سین کے ساتھ لفظ وسیلہ کے معنی اس چیز کے ہیں جو کسی کو کسی دوسرے سے محبت ورغبت

کے ساتھ ملا دے۔ (لسان العرب، مفردات راغب)

اور ابن جریرؒ وغیرہ نے حضرت قتادہؓ سے اس آیت کی تفسیر یہ نقل کی ہے تَقَرَّبُوْا اِلَیْہِ بِطَاعَتِہٖ وَالْعَمَلِ بِمَا یُرْضِیْہِ، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب حاصل کرو اس کی فرمانبرداری اور رضامندی کے کام کر کے، اس لیے آیت کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب تلاش کرو، بذریعہ ایمان اور عمل صالح کے۔

اور مسند احمدؒ کی ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وسیلہ ایک اعلیٰ درجہ ہے جنت کا جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں، تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ درجہ مجھے عطا فرمادے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مؤذن کہے تو تم بھی وہی کلمات کہتے رہو جو مؤذن کہتا ہے، اس کے بعد مجھ پر درود پڑھو، اور میرے لیے وسیلہ کی دعا کرو۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ وسیلہ ایک خاص درجہ ہے جنت کا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے اور آیت مذکورہ میں ہر مومن کو وسیلہ طلب کرنے اور ڈھونڈنے کا حکم بظاہر اس خصوصیت کے منافی ہے، مگر جواب واضح ہے کہ جس طرح ہدایت کا اعلیٰ مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہے اور آپ ہمیشہ اس کے لیے دعا کیا کرتے تھے، مگر اس کے ابتدائی اور متوسط درجات تمام مؤمنین کے لیے عام ہیں، اسی طرح وسیلہ کا اعلیٰ درجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہے اور اس کے نیچے کے درجات سب مؤمنین کے لیے، آپ ہی کے واسطہ اور ذریعہ سے عام ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ لفظ وسیلہ میں محبت ورغبت کا مفہوم شامل ہونے سے اس طرف اشارہ ہے کہ وسیلہ کے درجات میں ترقی اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر موقوف ہے اور محبت پیدا ہوتی ہے اتباع سنت سے، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہ، اس لیے جتنا کوئی اپنی عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت اور زندگی کے تمام شعبوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اس کو حاصل ہوگی، اور وہ خود اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہو جائے گا، اور جتنی زیادہ محبت بڑھے گی اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔

لفظ ''وسیلہ'' کی لغوی تشریح اور صحابہ و تابعین کی تفسیر سے جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کا ذریعہ بنے وہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا وسیلہ ہے، اس میں جس طرح ایمان اور عمل صالح داخل ہیں اسی طرح انبیاء و صالحین علیہم السلام کی صحبت و محبت بھی داخل ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے اسباب میں سے ہے اور اسی لیے ان کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا درست ہوا، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانہ میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ اور ایک روایت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک نابینا صحابی کو اس طرح دعا مانگنے کی تلقین فرمائی ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّد نَبِیِّ الرَّحْمَةِ''۔ (منار، معارف القرآن ۱۲۸/۳، سورہ مائدہ پ ۶)

وصول الی اللہ کی تعریف

ذکر اللہ کی کثرت اور تعلقات دنیا کے ترک کے معاملے میں صوفیائے کرام سلفاً و خلفاً سب سے آگے رہے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ ہم جس مسافت کو طے کرنے اور راستہ قطع کرنے میں دن رات لگے ہوئے ہیں درحقیقت اس کے دو قدم

ہیں، پہلا قدم مخلوق سے انقطاع ہے، اور دوسرا قدم وصول الی اللہ ہے، اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، آیت مذکورہ میں انہی دو قدموں کو دو جملوں میں عطف کر کے بیان فرمایا گیا ہے ''وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا''

یہاں ذکر اللہ سے مراد اس پر ایسی مداومت ہے جس میں کبھی قصور وفتور نہ ہو اور کسی وقت اس سے ذہول نہ ہو، یہی وہ مقام ہے جس کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں وصول الی اللہ کہا جاتا ہے، اس طرح پہلے جملے میں آخری قدم کا ذکر فرمایا اور دوسرے جملے میں پہلے قدم کا، یہ ترتیب شاید اس لیے بدل گئی کہ اگرچہ عمل میں تبتل یعنی قطع تعلقات (بالمعنی المذکور) مقدم ہے اور وصول الی اللہ اس کے بعد اس پر مرتب ہوتا ہے مگر چونکہ مقصد سالک کا یہ دوسرا ہی قدم ہے اور یہی درحقیقت مقصود المقاصد ہے، اس کی اہمیت وافضلیت بتلانے کے لیے ترتیب طبعی وقوعی کو بدل کر ذکر اللہ کو مقدم بیان فرمایا گیا، شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے انہی دو قدموں کو خوب بیان فرمایا ہے ۔

تعلق حجاب است وبے حاصلی چو پیوندہا بگسلی واصلی

(معارف القرآن ۸/۵۹۴، سورہ مزمل پ ۲۹)

وصی کی تعریف

میت جس شخص کو مال سپرد کر کے اس کے متعلق کسی کو دینے دلانے کے لیے کہہ جاوے وہ وصی ہے اور وصی ایک شخص بھی ہوسکتا ہے اور زیادہ بھی، موصی کا مسلمان اور عادل ہونا خواہ حالت سفر ہو یا حضر افضل ہے، لازم نہیں۔

(معارف القرآن ۳/۲۵۷، سورہ مائدہ پ: ۷)

وصیت کی تعریف

وصیت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے خواہ زندگی میں یا

بعدالموت، لیکن عرف میں اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم بعدالموت ہو۔

(معارف ۱/۳۳۸، سورہ بقرہ)

وعدہ کی تعریف

واعدنا: وعدہ سے مشتق ہے، اور وعدہ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کو نفع پہونچانے سے پہلے اس کا اظہار کر دینا کہ ہم تمہارے لئے فلاں کام کریں گے "واعدنا" کے اصل معنیٰ دو طرف سے وعدے اور معاہدے کے آتے ہیں۔

(معارف القرآن سورہ اعراف پ۹، ص ۵۶ ج ۴)

وعظ اور موعظت حسنہ کی تعریف

موعظت اور وعظ کے اصلی معنیٰ ایسی چیزوں کا بیان کرنا ہے جن کو سن کر انسان کا دل نرم ہو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے، دنیا کی غفلت کا پردہ چاک ہو، آخرت کی فکر سامنے آجائے، قرآن کریم اول سے آخر تک اسی موعظۂ حسنہ کا نہایت بلیغ مبلّغ ہے، اس میں ہر جگہ وعدہ کے ساتھ وعید ثواب کے ساتھ عذاب، دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی کے ساتھ ناکامی اور گمراہی وغیرہ کا ایسا ملا جلا تذکرہ ہے جس کو سن کر پتھر بھی پانی ہو جائے، پھر اس پر قرآن کریم کا اعجاز بیان جو دلوں کی کایا پلٹنے میں بے نظیر ہے۔ (معارف القرآن سورہ یونس پ ۱۱، ص ۵۴۲ ج ۴)

اَلْمَوْعِظَة موعظہ اور وعظ کے لغوی معنیٰ یہ ہیں کہ کسی خیر خواہی کی بات کو اس طرح کہا جائے کہ اس سے مخاطب کا دل قبولیت کے لئے نرم ہو جائے، مثلاً اس کے ساتھ قبول کرنے کے ثواب و فوائد اور نہ کرنے کے عذاب و مفاسد ذکر کئے جائیں۔

(قاموس و مفردات راغب)

اَلْحَسَنَة کے معنیٰ یہ ہیں کہ بیان اور عنوان بھی ایسا ہو کہ جس سے مخاطب کا

قلب مطمئن ہو، اس کے شکوک وشبہات دور ہوں، اور مخاطب یہ محسوس کر لے کہ آپ کی اس میں کوئی غرض نہیں صرف اُس کی خیر خواہی کے لئے کہہ رہے ہیں۔

(معارف القرآن ج ۵/ ۴۲۱، نحل: پ ۱۴)

وفات اور متوفّیٰ کی تعریف

اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ (سورہ آل عمران: پ ۳)

لفظ ''مُتَوَفّٰی'' کا مصدر ''تُوُفِّیَ'' اور مادہ ''وَفْیٌ'' ہے، اس کے اصل معنیٰ عربی لغت کے اعتبار سے پورا پورا لینے کے ہیں، وفاء، ایفاء، استیفاء اسی معنیٰ کے لئے بولے جاتے ہیں، ''تُوُفِّیَ'' کے بھی اصلی معنیٰ پورا پورا لینے کے ہیں، تمام کتب لغت عربی زبان کی اس پر شاہد ہیں، اور چونکہ موت کے وقت انسان اپنی اجل مقدر پوری کرلیتا ہے، اور خدا کی دی ہوئی روح پوری لے لی جاتی ہے، اس کی مناسبت سے یہ لفظ بطور کنایہ موت کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور موت کا ایک ہلکا سا نمونہ روزانہ انسان کی نیند ہے، اس کے لئے بھی قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے:

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا. (۳۹:۴۲) جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

اللہ لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آتی ان کی نیند کے وقت۔

(معارف القرآن ج ۲/ ۷۳، آل عمران: پ ۳)

وکیل اور توکل کی تعریف

وکیل لغت میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو کوئی کام سپرد کیا جائے ''فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا'' کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنے سب کاروبار معاملات اور حالات کو اللہ کے سپرد کرو، اسی کا نام اصطلاح میں توکل ہے

(معارف القرآن ۸/ ۵۹۴، سورہ مزمل پ ۲۹)

ولی اور ولایت کی تعریف

مَالَکُم مِن وَلَایَتِھِم مِن شئی حَتّیٰ یُھَاجِرُوا (سورہ انفال، پ۱۱)

لفظ ولی اور ولایت استعمال فرمایا ہے جس کے اصل معنیٰ دوستی اور گہرے تعلق کے ہیں، حضرت ابن عباسؓ، حسنؒ، قتادہؒ، مجاہدؒ وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس جگہ ولایت سے مراد وراثت اور ولی سے مراد وارث ہے اور بعض حضرات نے ولایت کے لغوی معنیٰ یعنی دوستی اور امداد واعانت ہی مراد لئے۔

پہلی تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان مہاجر وانصار آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، ان کا تعلق وراثت نہ غیر مسلم کے ساتھ قائم رہے گا نہ ان مسلمانوں کے ساتھ جنہوں نے ہجرت نہیں کی، پہلا حکم یعنی اختلافِ دین کے بناء پر قطع وراثت تو دائمی اور باقی رہا مگر دوسرا حکم فتح مکہ کے بعد جب کہ ہجرت کی ضرورت ہی نہیں رہی تو مہاجر اور غیر مہاجر میں قطع وراثت کا حکم بھی باقی نہ رہا، اس سے بعض فقہاء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ جس طرح اختلاف دین قطع وراثت کا سبب ہے اسی طرح اختلاف دارین بھی قطع وراثت کا سبب ہے جس کی تفصیلی بحث کتب فقہ میں مذکور ہے۔

(معارف ۴/۲۹۷، سورہ انفال، پ۱۱)

وہن کی تعریف

وھنوا وھن سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ضعف وکمزوری۔

(معارف ۲/۲۰۰، سورہ آل عمران)

ھ

ہجرت کی تعریف اور اس کا حکم

لغت میں ''ہجرت'' ہجران اور ''ہجر'' کے معنی ہیں کسی چیز سے بیزار ہو کر اس کو چھوڑ دینا، اور محاورات عامہ میں ہجرت کا لفظ ترک وطن کرنے کے لیے بولا جاتا ہے، اصطلاحِ شرح میں دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام میں چلے جانے کو ہجرت کہتے ہیں۔ (روح المعانی)

اور ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوۃ میں فرمایا کہ کسی وطن کو دینی وجوہ کی بنا پر چھوڑ دینا بھی ہجرت میں داخل ہے۔ (مرقاۃ، ۱/۳۹)

سورۂ حشر کی آیت ''اَلَّذِیْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ '' جو مہاجرین صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ملک کے کفار مسلمانوں کو ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیں تو یہ بھی ہجرت میں داخل ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے پاکستان کی طرف منتقل ہونے والے مسلمان جو دارالکفر سے بیزاری کے سبب باختیار خود اس طرف آئے ہیں یا جن کو غیر مسلموں نے محض ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیا ہے یہ سب لوگ شرعی معنی کے اعتبار سے مہاجر ہیں، البتہ جو تجارتی ترقی یا ملازمت کی سہولتوں کی نیت سے منتقل ہوئے وہ شرعاً مہاجر کہلانے کے مستحق نہیں۔

اور صحیح بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

المھاجر من ھجر ما نھی اللہ عنہ ورسولہ۔

یعنی مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے۔

سو اس کا مطلب اسی حدیث کے پہلے جملے سے ظاہر ہو جاتا ہے جس میں یہ ارشاد ہے:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده۔

یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے سب مسلمان محفوظ اور سلامت رہتے ہوں۔

مراد اس کی ظاہر ہے کہ سچا اور پکا مسلمان وہی ہے جو دوسروں کو ایذاء نہ پہنچائے، اسی طرح سچا اور کامیاب مہاجر وہی ہے جو صرف ترک وطن کر کے فارغ نہ ہو جائے بلکہ جتنی چیزیں شریعت نے حرام و ناجائز قرار دی ہیں ان سب کو بھی چھوڑ دے۔

(معارف القرآن ص:۵۲۶، سورہ نساء پ ۵)

ہجرت کی تعریف اور اس کے اقسام

ہجرت کے لغوی معنیٰ ترک وطن کے ہیں، ترکِ وطن جو اللہ کے لئے کیا جائے وہ اسلام میں بڑی طاعت و عبادت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **اَلْھِجْرَۃُ تَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَھَا** یعنی ہجرت ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو انسان نے ہجرت سے پہلے کئے ہوں۔

یہ ہجرت بعض صورتوں میں فرض و واجب اور بعض صورتوں میں مستحب و افضل ہوتی ہے، اس کے مفصل احکام تو سورہ نساء کی آیت نمبر ۹۷ **اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا** کے تحت میں بیان ہو چکے ہیں۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جگہ ہجرت اور ترک وطن کی قسمیں اور ان کے کچھ احکام پر ایک مفید مضمون تحریر فرمایا ہے، اتمام فائدہ کیلئے اس کو نقل کرتا ہوں، قرطبی نے

بحوالۂ ابن عربی لکھا ہے کہ وطن سے نکلنا اور زمین میں سفر کرنا کبھی تو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہوتا ہے، اور کبھی کسی چیز کی طلب وجستجو کے لئے، پہلی قسم کا سفر جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہو اس کو ہجرت کہتے ہیں اور اس کے چھ قسمیں ہیں۔

اول: دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف جانا

یہ قسمِ سفر عہدِ رسالت میں بھی فرض تھی، اور قیامت تک بشرطِ استطاعت وقدرت فرض ہے (جب کہ دار الکفر میں اپنے جان ومال اور آبرو کا امن نہ ہو، یا دینی فرائض کی ادائیگی ممکن نہ ہو) اس کے باوجود دار الحرب میں مقیم رہا تو گنہگار ہوگا۔

دوسرا: دار البدعت سے نکل جانا

ابن قاسم کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ سے سنا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اس مقام میں قیام کرنا حلال نہیں جس میں سلف صالحین پر سبّ وشتم کیا جاتا ہو، ابن عربی یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ اگر تم کسی منکر کا ازالہ نہیں کر سکتے تو تم پر لازم ہے کہ خود وہاں سے زائل یعنی علاحدہ ہو جاؤ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْ اٰیَاتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ.

تیسرا سفر: وہ ہے کہ جس جگہ پر حرام کا غلبہ ہو وہاں سے نکل جانا کیونکہ طلبِ حلال ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چوتھا جسمانی اذیتوں سے بچنے کے لئے سفر:

یہ سفر جائز اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے کہ انسان جس جگہ دشمنوں سے جسمانی اذیت کا خطرہ محسوس کرے وہاں سے نکل جائے تاکہ اس خطرہ سے نجات ہو، یہ چوتھی قسم کا سفر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا، جب کہ قوم کی ایذاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے عراق سے ملک شام کی طرف روانہ ہوئے اور فرمایا: اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ، ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے ایک سفر مصر سے مدین کی طرف کیا، فَخَرَجَ مِنهَا خَائِفاً یَترَقَّبُ.

پانچواں سفر: آب وہوا کی خرابی اور امراض کے خطرہ سے بچنے کے لئے ہے

شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ چرواہوں کو مدینہ سے باہر جنگل میں قیام کرنے کا ارشاد فرمایا، کیونکہ شہری آب وہوا ان کو موافق نہ تھی، اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے ابوعبیدہ کو حکم بھیجا تھا کہ دارالخلافہ اُردُن سے منتقل کر کے کسی سطح مرتفع پر لے جائیں، جہاں آب وہوا خراب نہ ہو، لیکن یہ اس وقت میں جب کسی مقام پر طاعون یا وبائی امراض پھیلے ہوئے نہ ہو اور جس جگہ کوئی وبا پھیل جائے اس کے لئے حکم یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ پہلے سے موجود ہیں وہ تو وہاں سے بھاگے نہیں اور جو باہر ہیں وہ اس کے اندر نہ جائیں جیسا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو سفر شام کے وقت پیش آیا کہ سرحد شام پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے تو آپ کو اس ملک میں داخل ہونے میں تردد پیش آیا، صحابۂ کرام سے مسلسل مشوروں کے بعد آخر میں جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

اِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَاَنْتُمْ بِهَا فَلاَ تَخْرُجُوْا مِنْهَا وَاِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَلَسْتُمْ بِهَا فَلاَ تَهْبِطُوْا عَلَيْهَا (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

جب کسی خطہ میں طاعون پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو اب وہاں سے نہ نکلو اور جہاں تم پہلے سے موجود نہیں وہاں طاعون پھیلنے کی خبر سنو تو اس میں داخل نہ ہو۔

اس وقت فاروق اعظمؓ نے حکم حدیث کی تعمیل کرتے ہوئے پورے قافلہ کو لے کر واپسی کا اعلان کر دیا۔

چھٹا سفر: اپنے مال کی حفاظت کے لئے ہے

جب کوئی شخص کسی مقام میں چوروں ڈاکوؤں کا خطرہ محسوس کرے تو وہاں سے

منتقل ہو جائے، شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کیونکہ مسلمان کے مال کا بھی ایسا ہی احترام ہے جیسا اس کی جان کا ہے۔

یہ چھ قسمیں تو اُس ترک وطن کی ہیں جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے کیا گیا ہو، اور جو سفر کسی چیز کی طلب و جستجو کے لئے کیا جائے اس کی نو قسمیں ہیں۔

سفر کی نو قسمیں

(۱) سفرِ عبرت: یعنی دنیا کی سیاحت و سفر اس کام کے لئے کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور قدرت کاملہ کا اور اقوام سابقہ کا مشاہدہ کر کے عبرت حاصل کرے، قرآن کریم نے ایسے سفر کی ترغیب دی ہے: اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، حضرت ذی القرنین کے سفر کو بھی بعض علماء نے اسی قسم کا سفر قرار دیا ہے اور بعض نے فرمایا کہ ان کا سفر زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لئے تھا۔

(۲) سفرِ حج: اس کا چند شرائط کے ساتھ فرضِ اسلامی ہونا سب کو معلوم ہے۔

(۳) سفرِ جہاد: اس کا فرض یا واجب یا مستحب ہونا بھی سب مسلمانوں کو معلوم ہے۔

(۴) جب کسی شخص کو اپنے وطن میں ضرورت کے مطابق معاشی سامان حاصل نہ ہو سکے تو اس پر لازم ہے کہ یہاں سے سفر کر کے دوسری جگہ تلاش روزگار کرے۔

(۵) سفرِ تجارت یعنی قدرِ ضرورت سے زائد مال حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا، یہ بھی شرعاً جائز ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، ابتغاء فضل سے مراد اس آیت میں تجارت ہے، اللہ تعالیٰ نے سفرِ حج میں بھی تجارت کی اجازت دے دی ہے، تو تجارت کے لئے ہی سفر کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوا۔

(۶) طلب علم کے لئے سفر: اس کا بقدرِ ضرورتِ دین فرضِ عین ہونا، اور زائد از ضرورت کا فرضِ کفایہ ہونا معلوم و معروف ہے۔

(۷) کسی مقام کو مقدس اور متبرک سمجھ کر اس کی طرف سفر کرنا، یہ بجز تین مسجدوں کے درست نہیں، (۱) مسجد حرام (مکہ مکرمہ) (۲) مسجد نبوی (مدینہ طیبہ) (۳) مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) یہ قرطبی اور ابن عربی کی رائے ہے، دوسرے اکابر علماءِ سلف وخلف نے عام مقامات متبرکہ کی طرف سفر کرنے کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

(۸) اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے سفر: جس کو رباط کہا جاتا ہے، احادیث کثیرہ میں اس کی بڑی فضیلت مذکور ہے۔

(۹) عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کے لئے سفر: حدیث میں اس کو بھی باعث اجر وثواب قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں اقرباء واحباب کی ملاقات کے لئے سفر کرنے والوں کے لئے فرشتوں کی دعا کا ذکر فرمایا گیا ہے (یہ جب ہے کہ ان کی ملاقات سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو کوئی مادّی غرض نہ ہو) واللہ اعلم

(قرطبی ص ۳۴۹، تا ۳۵۱ جلد ۵، سورہ نساء، معارف القرآن ص ۳۳۹ تا ۳۴۳، جلد ۵)

ہدایت کی تعریف اور اس کے درجات

امام راغب اصفہانی نے لفظ ہدایت کی تشریح میں بڑی مفید اور اہم بات فرمائی ہے کہ ہدایت کا لفظ بہت عام ہے، اس کے درجات مختلف ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا راستہ ملنے کا نام ہے، اس لیے تقرب الی اللہ کے درجات بھی جتنے مختلف اور غیر متناہی ہیں، اسی طرح ہدایات کے درجات بھی بے حد متفاوت ہیں، ادنیٰ درجہ ہدایت کا کفر وشرک سے نجات اور ایمان ہے، جس سے انسان کا رُخ غلط راستہ سے پھر کر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتا ہے، پھر بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جس قدر فاصلہ ہے اس کو طے کرنے کے ہر درجہ کا نام ہدایت ہے، اس لیے ہدایت کی طلب سے کسی وقت کوئی انسان یہاں تک کہ انبیاء اور رسل بھی مستغنی نہیں ہیں، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر عمر تک اِھْدِنَا الصِّرَاطَ

الْمُسْتَقِيْم کی تعلیم جس طرح امت کو دی خود بھی اس دعا کا اہتمام جاری رکھا، کیونکہ تقرب الی اللہ کے درجات کی کوئی انتہا نہیں، یہاں تک کہ جنت کے داخلہ کو بھی اس آیت میں لفظ ہدایت سے تعبیر کیا گیا کہ یہ ہدایت کا آخری مقام ہے۔

(معارف القرآن ۵۶۲/۳، سورہ اعراف پ ۸)

لفظ ہدایت کئی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک معنیٰ صرف راستہ دکھا دینے کے ہیں، جس کے لئے ضروری نہیں کہ جس کو راستہ دکھایا گیا وہ منزل مقصود پر پہونچے اور ایک معنیٰ ہدایت کے یہ بھی آتے ہیں کہ کسی کو منزل مقصود پر پہونچا دیا جائے، پہلے معنیٰ کے اعتبار سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء کا ہادی ہونا اور یہ ہدایت ان کے اختیار میں ہونا ظاہر ہے، کیونکہ یہ ہدایت ہی ان کا فرض منصبی ہے، اگر اس کی ان کو قدرت نہ ہو تو فریضہ رسالت ونبوت کیسے ادا کریں، اس آیت میں جو آپ کا ہدایت پر قادر نہ ہونا بیان فرمایا ہے، اس سے مراد دوسرے معنیٰ کی ہدایت ہے، یعنی مقصود پر پہونچا دینا، اور مطلب یہ ہے کہ اپنی تبلیغ وتعلیم کے ذریعہ آپ کسی کے دل میں ایمان ڈال دیں اس کو مومن بنا دیں، یہ آپ کا کام نہیں، یہ تو براہ راست حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے، ہدایت کے معنیٰ اور اس کی اقسام کی مکمل تحقیق سورۂ بقرہ کے شروع میں گذر چکی ہے۔ (معارف القرآن ج۶/ ۶۴۸، قصص: پ۲۱)

(ہدایت ایک ایسا مفہوم عام ہے جس کے درجات غیر متناہی ہیں، وجہ یہ ہے کہ ہدایت کے معنیٰ منزل مقصود کا راستہ دکھلانا یا اس پر پہنچانا ہے اور اصل منزل مقصود ہر انسان کی حق تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل کرنا ہے، اور اس رضا وقرب کے متفاوت درجات بے شمار ہیں، ایک درجہ حاصل ہونے کے بعد دوسرے اور تیسرے درجہ کی ضرورت باقی رہتی ہے جس سے کوئی بڑے سے بڑا ولی بلکہ نبی ورسول بھی بے نیاز نہیں ہوسکتا اس لئے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم کی دعا نماز کی ہر رکعت میں کرنے کی تعلیم جیسے امت کو ہے

خود رسول کریم ﷺ کو بھی ہے جس کا حاصل صراط مستقیم کی ہدایت یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب ورضا کے درجات میں ترقی حاصل کرنا ہے۔ (معارف القرآن ص ۶۷، ج ۸، فتح، پ ۲۶)

ھُد ھُد کی تعریف

ھُد ھُد طیور میں چھوٹا اور کمزور اور جس کی تعداد بھی بہ نسبت دوسرے طیور کے کم ہے، اللہ تعالیٰ نے ہُد ہُد کو یہ خاصیت عطا فرمائی ہے کہ وہ زمین کے اندر کی چیزوں کو اور زمین کے اندر بہنے والے چشموں کو دیکھ لیتا ہے، مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ تھا کہ اس میدان میں پانی کتنی گہرائی میں ہے، اور کس جگہ زمین کھودنے سے پانی کافی مل سکتا ہے، ہُد ہُد کی اس نشاندہی کے بعد وہ جنات کو حکم دے دیتے کہ اس زمین کو کھود کر پانی نکالو وہ بڑی جلد کھود کر پانی نکال لیتے تھے۔

ہُد ہُد اپنی تیز نظر اور بصیرت کے باوجود شکاری کے جال میں پھنس جاتا ہے اس پر حضرت ابن عباس نے فرمایا: **قِفْ یَا وَقَّاف، کیف یری الهُدهُد باطن الارض وهو لایری الفخّ حین یقع فیه.** (قرطبی)

ترجمہ: جاننے والو اس حقیقت کو پہچانو کہ ہُد ہُد زمین کی گہرائی کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے مگر زمین کے اوپر پھیلا ہوا جال اُس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے جس میں پھنس جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جو امر تکلیف یا راحت کا کسی کے لئے مقدر کر دیا ہے تو تقدیر الٰہی نافذ ہو کر رہتی ہے کوئی شخص اپنی فہم و بصیرت یا زور وزر کی طاقت کے ذریعہ اُس سے نہیں بچ سکتا۔ (معارف القرآن ص ۵۷۱، ج ۶، سورہ نمل)

ہَدْی کی تعریف

”ہدی“ اس جانور کو کہا جاتا ہے، جس کی قربانی حرم شریف میں کی جائے، ایسے جانور

جس شخص کے ساتھ ہوں عام عرب کا معمول تھا کہ اس کو کچھ نہ کہتے تھے وہ امن واطمینان کے ساتھ سفر کرتا، اور اپنا مقصد پورا کرسکتا تھا۔ (معارف القرآن ص ۲۴۰، ج ۳، مائدہ، پ ۷)

ھَمّ (عزم وارادہ) اور وسوسہ کی تعریف اور ان کا حکم

وَلَقَدْ ھَمَّتْ بِهٖ وَھَمَّ بِھَا. (سورہ یوسف پ ۱۲)

عربی زبان میں لفظ ھَمّ دو معنیٰ کے لئے بولا جاتا ہے، ایک کسی کام کا قصد وارادہ اور عزم کرلینا، دوسرے محض دل میں وسوسہ اور غیر اختیاری خیال پیدا ہوجانا، پہلی صورت گناہ میں داخل اور قابل مواخذہ ہے، ہاں اگر قصد وارادہ کے بعد خالص اللہ تعالیٰ کے خوف سے کوئی شخص اس گناہ کو باختیار خود چھوڑ دے تو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کی جگہ اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی درج فرمادیتے ہیں۔

اور دوسری صورت کہ محض وسوسہ اور غیر اختیاری خیال آجائے اور فعل کا ارادہ بالکل نہ ہو جیسے گرمی کے روزہ میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعی میلان غیر اختیاری سب کو ہوجاتا ہے حالانکہ روزہ میں پینے کا ارادہ بالکل نہیں ہوتا، اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے نہ اس پر کوئی مواخذہ اور گناہ ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے گناہ کے وسوسہ اور خیال کو معاف کردیا ہے جب کہ وہ اس پر عمل نہ کرے۔

تفسیر قرطبی میں لفظ ھَـــمّ کو ان دونوں معنیٰ کے لئے استعمالِ عرب کے محاورات اور اشعار کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آیت میں لفظ ھَـــمّ زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کے لئے بولا گیا مگر ان دونوں کے ھَمّ یعنی خیال میں بڑا فرق ہے، پہلا گناہ میں داخل ہے اور دوسرا غیر اختیاری وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے جو گناہ میں داخل نہیں۔

(معارف القرآن ص: ۳۷ ج ۵ سورہ یوسف پ ۱۲)

(ی)

یاجوج ماجوج کی تعریف

قرآن وسنت کی تصریحات سے اتنی بات بلاشبہ ثابت ہے کہ یاجوج ماجوج انسان ہی کی قومیں ہیں عام انسانوں کی طرح نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، کیونکہ قرآن مجید کی نصِّ صریح ہے وَاجعلنا ذُرِّيَته هُمُ البَاقِينَ یعنی طوفان نوح علیہ السلام کے بعد جتنے انسان زمین پر باقی ہے اور باقی رہیں گے وہ سب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں ہوں گے، تاریخی روایات اس پر متفق ہے کہ وہ یافث کی اولاد میں ہیں، ایک ضعیف حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

مذکور الصدر احادیث میں یاجوج ماجوج کے متعلق جو باتیں رسول ﷺ کے بیان سے ثابت ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) یاجوج ماجوج عام انسانوں کی طرح انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں جمہور محدثین ومورخین ان کو یافث ابن نوح علیہ السلام کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے ذوالقرنین کے زمانے تک دور دور تک مختلف قبائل اور مختلف قوموں اور مختلف آبادیوں میں پھیل چکی تھی، یاجوج ماجوج جن قوموں کا نام ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب سدّ ذوالقرنین کے پیچھے محصور ہو گئے ہوں، ان کے کچھ قبائل اور قومیں سدّ ذوالقرنین کے اس طرف بھی ہوں گے، البتہ

ان میں سے جو قتل و غارت گری کرنے والی وحشی لوگ تھے وہ سدّ ذوالقرنین کے ذریعے روک دیئے گئے۔ مورخین عام طور سے ان کو ترک اور مغول یا مغولین لکھتے ہیں، مگر ان میں سے یاجوج ماجوج نام۔۔۔صرف ان وحشی غیر متمدن خونخوار ظالم لوگوں کا ہے جو تمدن سے آشنا نہ ہوئے۔ ان ہی کے برادری کے مغول و ترک یا مغولین جو متمدن ہو گئے وہ اس نام سے خارج ہیں۔

(۲) یاجوج ماجوج کی تعداد پوری دنیا کے انسانوں کی تعداد سے بدرجہا زائد، کم از کم ایک اور دس کی نسبت سے ہے۔

(۳) یاجوج ماجوج کی جو قومیں اور قبائل سدّ ذی القرنین کے ذریعے اس طرف آنے سے روک دیئے گئے ہیں وہ قیامت کے بالکل قریب تک اسی طرح محصور رہیں گے ان کے نکلنے کا وقت مقدر ظہور مہدیؑ پھر خروج دجال کے بعد وہ ہوگا جب عیسیٰؑ نازل ہو کر دجال کو قتل کر چکیں گے۔

(۴) یاجوج ماجوج کے نکلنے کے وقت سدّ ذوالقرنین منہدم ہو کر زمین کے برابر ہو جائے گی۔ (معارف القرآن ص ۶۴۶، ج ۵، کہف، پ ۱۵)

یتیم کی تعریف

وَآتُوا الْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ (سورۂ نساء پ۴)

یتیم کے لفظی معنیٰ اکیلے اور منفرد کے ہیں، اسی لیے جو موتی سیپ میں تنہا ایک ہو اس کو در یتیم کہا جاتا ہے، اصطلاح شرع میں اس بچہ کو یتیم کہا جاتا ہے جس کا باپ مرگیا ہو اور جانوروں میں اس کو یتیم کہا جاتا ہے جس کی ماں مرگئی ہو۔ (قاموس)

بالغ ہونے کے بعد شرعی اصطلاح میں اس کو یتیم نہیں کہا جائے گا جیسا کہ حدیث شریف میں تصریح ہے، **لایتم بعد احتلام** یعنی بلوغ کے بعد یتیمی باقی نہیں رہتی۔

(مشکوۃ شریف ۲/۲۸۴، معارف القرآن سورہ نساء ۲/۲۸)

یمین غموس ولغو کی تعریف

اگر کسی گذشتہ واقعہ پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے اس کو اصطلاح فقہاء میں یمین غموس کہتے ہیں، مثلاً ایک شخص نے کوئی کام کرلیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ میں نے یہ کام کیا ہے اور پھر جان بوجھ کر قسم کھالے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا، یہ جھوٹی قسم سخت گناہِ کبیرہ اور موجبِ وبال دنیا وآخرت ہے۔ مگر اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہوتا، توبہ استغفار لازم ہے، اس لئے اس کو اصطلاح فقہاء میں یمین غموس کہا جاتا ہے کیونکہ معنیٰ ڈوبادینے والے کے ہے یہ قسم انسان کو اور وبال میں اور غرق کردینے والی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی گذشتہ واقعہ پر اپنے نزدیک سچا سمجھ کر قسم کھائے اور واقعہ میں وہ غلط ہو، مثلاً کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ فلاں شخص آگیا ہے، اس پر اعتماد کرکے اس نے قسم کھالی کہ وہ آگیا ہے، پھر معلوم ہوا کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، اس کو یمین لغو کہتے ہیں، اسی طرح بلاقصد زبان سے لفظ قسم نکل جائے تو اس کو بھی یمین لغو کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ نہ اس پر کفارہ ہے اور نہ گناہ۔

تیسری صورت قسم کی یہ ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے اس کو یمین منعقدہ کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس قسم کو توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں اس پر گناہ بھی ہوتا ہے۔

(معارف القرآن ص ۲۲۳، ج ۳، مائدہ، پ ۷)

فائدہ: اگر کوئی شخص کسی حلال قطعی کو عقیدۃً حرام قرار دے تو یہ کفر اور گناہ عظیم ہے اور اگر عقیدۃً حرام نہ سمجھے مگر بلا کسی ضرورت ومصلحت کے قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کرلے تو یہ گناہ ہے، اس قسم کو توڑنا اور کفارہ ادا کرنا اس پر واجب ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے، اور کوئی ضرورت ومصلحت ہو تو جائز، مگر خلاف اولیٰ ہے۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ نہ عقیدۃً حرام سمجھے نہ قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کرے

مگر عملاً اس کو ہمیشہ ترک کرنے کا دل میں عزم کرلے یہ عزم اگر اس نیت سے کرے کہ اس کا دائمی ترک باعث ثواب ہے تب تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے جو شرعاً گناہ اور مذموم ہے اور اگر ترک دائمی کو ثواب سمجھ کر نہیں بلکہ اپنے کسی جسمانی یا روحانی مرض کے علاج کے طور پر کرتا ہے تو بلا کراہت جائز ہے۔ بعض صوفیائے کرام سے جو ترکِ لذائذ کی حکایتیں منقول ہیں وہ اسی صورت پر محمول ہیں۔

(معارف القرآن ص ۴۹۹، ج ۸، سورہ التحریم، پ ۲۸)

یوم الجمع ویوم التغابن کی تعریف

یَومَ یَجمَعُکُم لِیَومِ الجَمعِ ذٰلِکَ یَومُ التَّغَابُن (سورہ تغابن پ ۲۸)

جس روز تم کو اللہ تعالیٰ جمع کرے گا جمع کرنے کے دن میں یہ دن ہوگا تغابن کا یعنی خسارے کا۔

یوم الجمع اور یوم التغابن دونوں قیامت کے نام ہیں، یوم الجمع ہونا اس دن کا تو ظاہر ہے کہ تمام مخلوق اولین وآخرین کو اس روز حساب کتاب اور جزاوسزا کے لئے جمع کیا جائے گا، اور یوم التغابن اس لئے کہ تغابن غبن سے مشتق ہے جس کے معنیٰ خسارے اور نقصان کے ہیں، مالی نقصان اور خسارے کو بھی غبن کہا جاتا ہے اور رائے اور عقل کے نقصان کو بھی، امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ مالی خسارے کے لئے یہ لفظ بصیغہ مجہول غُبن فلان فھو مغبون استعمال کیا جاتا ہے، اور عقل ورائے کے نقصان کے لئے باب سمع سے غَبِن استعمال کیا جاتا ہے، لفظ تغابن اصل کے اعتبار سے دو طرفہ کام کے لئے بولا جاتا ہے، کہ ایک آدمی دوسرے کو اور دوسرا اس کو نقصان پہنچائے، یا اس کے نقصان وخسارے کو ظاہر کرے، یہاں مراد ایک طرفہ اظہار غبن ہے جیسا کہ یک طرفہ استعمال بھی اس لفظ کا معروف ومشہور ہے، قیامت کو یوم تغابن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

ہر انسان کے لئے آخرت میں دو گھر پیدا کئے ہیں ایک جہنم میں دوسرا جنت میں، اہل جنت کو جنت میں داخل کرنے سے پہلے ان کا وہ مقام بھی دکھلایا جائے گا جو ایمان اور عمل نہ ہونے کی صورت میں اس کے لئے مقرر تھا تاکہ اس کو دیکھنے کے بعد جنت کے مقام کی اور زیادہ قدر اس کے دل میں پیدا ہو، اور اللہ تعالیٰ کا مزید شکر گزار ہو، اسی طرح اہل جہنم کو جہنم میں داخل کرنے سے پہلے ان کا جنت کا وہ مقام دکھلایا جائے گا جو ایمان اور عمل صالح کی صورت میں ان کے لئے مقرر تھا تاکہ ان کو اور زیادہ حسرت ہو۔

(معارف القرآن ص ۴۶۵، ج ۸، سورہ تغابن پ ۲۸)

تمت

مختلف موضوعات سے متعلق مرتب کی دوسری کتابیں

۱- احکام الصلوٰۃ
۲- احکام الزکوٰۃ والصدقہ
۳- احکامِ رمضان المبارک
۴- احکامِ اعتکاف
۵- احکام التراویح (تحفۂ حفّاظ)
۶- احکام شب برأت وشب قدر
۷- احکام العیدین
۸- احکام المسجد
۹- احکام الدعا والوسیلہ
۱۰- احکام قربانی
۱۱- احکامِ پردہ
۱۲- احکام المال
۱۳- احکام الرّقیہ والتعویذ (غیر مطبوعہ)
۱۴- احکام صحافت وذرائع ابلاغ
۱۵- اسلامی تہذیب وآدابِ زندگی
۱۶- اسلامی شادی
۱۷- اصلاحِ معاشرہ
۱۸- اصلاحِ معیشت
۱۹- اصلاحِ نفس واصلاح معاشرہ
۲۰- اصلاح خواتین
۲۱- آداب افتاء واستفتاء
۲۲- استادو شاگرد کے حقوق
۲۳- اجتہاد وتقلید کا آخری فیصلہ
۲۴- ائمہ اربعہ کی اہمیت اور فقہ حنفی کی خصوصیت
۲۵- افاداتِ درس قرآن (مولانا صدیقؒ)
۲۶- افاداتِ درسِ بخاری (غیر مطبوعہ)
۲۷- افتتاحِ بخاری وختم بخاری
۲۸- اللہ کے راستہ میں نکلنے کی اہمیت
۲۹- اسباب واعمال اور تدبیر وتوکل کا شرعی درجہ
۳۰- اسلامی حکومت ودستورِ مملکت
۳۱- اشرف العملیات
۳۲- اصولِ فقہ قرآن کی روشنی میں
۳۳- اظہارِ حقیقت
۳۴- افاداتِ صدیقؒ
۳۵- امت کے باہمی اختلافات اور ان کا حل
۳۶- امداد الحجّاج
۳۷- بدنگاہی کا وبال اور اس کا علاج
۳۸- بریلوی مسلک کی حقیقت اور تاریخ وہابیت
۳۹- بارہ ربیع الاول کی شرعی حیثیت
۴۰- تبلیغی جماعت کی ضرورت واہمیت
۴۱- تبلیغی چھ نمبروں کی اہمیت

کتاب التعریفات

ماشاء اللہ آنجناب نے معارف القرآن وغیرہ سے یہ علمی جواہر بڑی دقیقہ رسی محنت اور اخلاص کے ساتھ جمع فرمائے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعاء بھی ہے اور ان کی رحمت سے امید بھی کہ آنجناب کی یہ کاوش نافع بھی ہوگی اور انشاء اللہ مقبول بھی، اللہ تعالیٰ اس پر آنجناب کو آپ کی شان کے مطابق جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۳۸/۴/۲۳ھ

جناب مولانا مفتی محمد زید صاحب مظاہری ندوی (استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کا ایک نہایت کارآمد، معلومات افزا اور مفید علمی کارنامہ ''کتاب التعریفات'' کی شکل میں سامنے آرہا ہے جس میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ صاحبِ تفسیر معارف القرآن کی تصانیف میں سے تعریفات فقہیہ، اصطلاحات شرعیہ کا انتخاب کر کے حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب فرمایا ہے، اور یہ تعریف صرف فنّی اعتبار سے الفاظ کی شرح کی حیثیت ہی نہیں رکھتیں بلکہ ہر ایک تعریف کے ساتھ ضروری تشریحات، احکام اور مسائل وعقائد کو بھی ذکر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور طلباء وعلماء اور عامۃ المسلمین کے لئے نافع بنائے۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۲۳ھ